أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ط

تذکرہ

حضرت بہاءُ الدین زکریا ملتانیؒ

○

از

نور احمد خان فریدی

علماء اکیڈمی شعبہ مطبوعات، محکمہ اوقاف پنجاب بادشاہی مسجد
لاہور

ناشر ——————— محمد یوسف گودایہ - ڈائریکٹر علماء اکیڈمی،
محکمہ اوقاف پنجاب، بادشاہی مسجد لاہور
فون - ۵۵۸۴۵

طبع اوّل ——————— مئی ۱۹۸۰ء

تعداد ——————— گیارہ سو (۱۱۰۰)

مطبع ——————— علمی پرنٹنگ پریس، ۱۷ ہسپتال روڈ،
لاہور۔

قیمت ——————— ۲۵ روپے



فہرس

پیش لفظ

حضرت شیخ الاسلام بہاءُ الدین ابو محمد زکریا سُہروردیؒ برِصغیر پاک و ہند کے عظیم صُوفیائے اسلام میں سے ہیں۔ آپ نے علم و فضل، اخلاق و کردار اور تعلیمات کے ذریعے دینِ اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ آپ پُوری زندگی اتباعِ رسالت، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس میں مصروف رہے۔ آپ نے انتہائی منظّم طریقے سے تبلیغِ اسلام کے فرائض انجام دیئے۔

حضرت بہاءالدین زکریاؒ کے سوانح حیات اور تعلیمات پر ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی "شعبہ مطبوعات علماء اکیڈمی اوقاف پنجاب" نے اس مقصد کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا اور ملک کے مشہور مؤلف جناب مولانا نور احمد خان فریدی سے مسودۂ کتاب تیار کرنے کے لیے کہا۔ موصوف نے یہ کام محنت سے انجام دیا اور تصوّف کے معروف مآخذ پر مبنی مسودہ تیار کیا۔ آپ اس موضوع پر ماضی قریب میں شائع ہونے والی کُتب کے مندرجات کو بھی زیرِ بحث لائے۔

اِس کتاب کو جدید طریقِ تحقیق پر لانے کے لیے ہم نے کافی محنت کی ہے۔ حوالہ جات و حواشی میں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں علماء اکیڈمی شعبہ مطبوعات اوقاف کے آفیسر تحقیق و مطبوعات جناب محمد نسیم عباسی صاحب نے محنت سے کام کیا ہے۔

ہم جناب ناظمِ اعلیٰ اوقاف پنجاب کے ممنونِ احسان ہیں کہ آپ نے اس کتاب کی اشاعت منظور فرمائی۔ ہم جناب مولانا نور احمد خان فریدی و دیگر اصحاب کے بھی شکر گزار ہیں، جنہوں نے اس کتاب کی تالیف، اشاعت و طباعت میں تعاون کیا۔

محمد یوسف گورایہ

ڈائریکٹر، عُلما اکیڈمی اوقاف، پنجاب، بادشاہی مسجد لاہور

یکم اپریل ۱۹۸۰ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

احوالِ واقعی

بیا و رید گر ایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہرِ سخن ہائے گفتنی دارد

تاریخ اور سِیَر کی تدوین میں مُسلمان مؤرخین اور تذکرہ نویسوں نے جس حزم اور احتیاط سے کام لیا ہے، اُس پر پُوری قوم فخر کر سکتی ہے۔ البلاذری، الطبری، المسعودی، ابنِ خلدون۔ ابنِ صوقل، ابنِ خلکان، ابنِ کثیر، ابنِ اثیر، ابنِ خطیب، عوفی، اصطخری، الادریسی، یاقوتی المقدسی اور بشاری نے نہ صرف واقعات بلکہ اُن کی رواۃ تک درج کئے ہیں۔ یہ انہی اربابِ فضل و کمال کی کاوشوں کا صدقہ ہے کہ تاریخِ عالم کا قاری اسلامی دَور میں پہنچ کر ایسا محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ حکایات و روایات اور افسون و افسانہ کی وادی سے گزر کر اب تاریخ کی دُنیا میں داخل ہُوا ہے۔ برِّ صغیر پاک و ہند کے مؤرخین کی جُہدِ مسلسل نے سونے پر سُہاگے کا کام کیا۔ میر علی شیر قانع، محمد قاسم فرشتہ، میر محمد معصوم بکھری، مستعد خان، مولانا نظام الدین، طاہر ٹھٹھوی، طباطبائی، ابوالفضل، ذکاء اللہ، مولانا شبلی نعمانی، سید سُلیمان ندوی، مولانا سید ابوظفر ندوی، مولانا عبدالرزاق اور مولانا اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی نے تاریخ کی پُر پیچ وادیوں میں تحقیق و تجسس کی شمعیں کچھ اس انداز سے روشن کیں کہ برِّ صغیر پاک و ہند کے عہدِ ماضی کا جلال و جمال جگمگا اُٹھا اور ظن و تخمین اور شکوک و شبہات کے بھیانک سائے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن افسوس ہے کہ مؤرخین اور تذکرہ نویسوں کی صفوف میں اب ایسے لوگ گھس آئے ہیں جو تاریخ نویسی کی قدروں سے قطعاً نابلد ہیں اور تاریخی مقالات

اور تحقیقی مضامین کو قلم برداشتہ اس طرح سے لکھتے ہیں، گویا وہ کوئی افسانہ لکھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ روز بروز تاریخ کا حلیہ بگڑتا جارہا ہے اور ایسے بے اصل اور جھوٹے قصّوں کو تاریخ و سیَر کا لباس پہنایا جارہا ہے جس سے اسلامی تہذیب و تمدّن کی اہانت ہوتی ہے اور اکابرِ اُمّت کی سیرتیں مسخ ہو رہی ہیں۔

پچھلے چند سالوں کی بات ہے کہ جب مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم[1] حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہ کا مقالہ مدون کرنے لگے، تو انہیں دفعتہً ایک بزرگ مخدوم بہاء الدین سے متعلق چند اقتباسات ملے کہ وہ موسیقی میں مہارتِ کاملہ رکھتے تھے۔ اور اُنہوں نے کئی سُریں بھی ایجاد کی تھیں۔ مولوی صاحب نے بغیر تحقیق کئے موسیقی کے اس شغف کو حضرت شیخ الاسلام سے منسوب کر دیا اور بڑی خود اعتمادی سے تحریر کیا کہ حضرت شیخ الاسلام موسیقی کے بڑے ماہر تھے اور آپ نے کئی سُریں ایجاد کی تھیں۔ حالانکہ شیخ الاسلام ایسے سلسلے کے شیخ الکل تھے، جس میں سماع کی اجازت نہیں تھی۔ بلکہ آپ کی خانقاہ کے درویش مولانا عراقیؒ پر اس لیے برہم ہوئے تھے کہ وہ عالمِ کیف میں شعر خوانی کرتے تھے۔ خلیق نظامی صاحب نے مشائخ سہروردیہ پر قلم اُٹھایا تو اُنہیں درویشوں کے طبقے سے نکال کر اُمراء و رؤساء میں شامل کر دیا اور مخدوم راجن قتالؒ جیسے بزرگ پر تلخ تنقید کی۔ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی صاحبہ نے پی ایچ ڈی کا مقالہ احوال و آثار شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ مدون کرتے وقت کمزور روایات کا سہارا لیا۔

۱۹۵۴ء میں جب خاکسار نے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تعلیمات پر کام کرنا شروع کیا تو اُس وقت انوارِ غوثیہ اور خلاصۃ العارفین کے علاوہ اور کوئی ایسی کتاب نہ مل سکی جس سے بندہ استفادہ کرتا۔ سیر العارفین، اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیاء میں ایک ڈیڑھ صفحہ سے زائد مواد نہیں تھا۔ اس لیے بندہ نے حضرت کے حالات جمع کرنے کے لیے پاکستان کے تمام کُتب خانے کھنگولے۔ قدیمی کُتب خانوں میں کئی کئی دن بسر کئے۔ بھارت کے ناشرین سے بصُورتِ خاص کئی کتابیں منگوائیں۔ حضرت کے خلفاء کے ملفوظ مطالعہ کئے۔ فرامینِ شاہی جو حضرت کے

[1] ریٹائرڈ پرنسپل، اورنٹیل کالج لاہور۔

خانوادہ میں محفوظ چلے آتے تھے ، اُن کو کئی بار دیکھا اور پڑھا ۔ بالآخر کئی سالوں کی سخت محنت اور ریاضت کے بعد حضرت کے تذکرۂ جلیلہ کو مدوّن کرنے میں کامیاب ہُوا اور جب یہ تالیف زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی اور اہلِ علم وفضل کے مطالعہ سے گزری تو ہر طرف سے حضرت شیخ الاسلام کے عقیدت مندوں ، ادیبوں ، دانش وروں اور محققوں کے تعریفی مکتوبات آنے شروع ہُوئے ۔ جس سے خاکسار کی بڑی حوصلہ افزائی ہُوئی ۔ ان کرم فرماؤں میں پاکستان کے معروف ادیب و دانش ور پیر حسام الدین راشدی ، مشہور سکالر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ، مولانا جعفر شاہ پھلواری ، شیخ التفسیر المحدث والفقیہ پیر محمد کرم شاہ صاحب ایم اے الازہر ، پروفیسر اقبال احمد صاحب فاروقی ، حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری ، غلام حسین صاحب قلندری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

سب سے بڑھ کر جس بزرگ شخصیت کے تاثرات نے متاثر کیا ، وہ حضرت امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری علیہ الرحمۃ تھے ۔ ٹبی شیر خاں (ملتان) کی ایک مسجد میں اتفاقیہ اُن سے نیاز کا شرف حاصل ہوا ۔ بڑے تپاک سے گلے لگا کر ملے اور فرمایا :

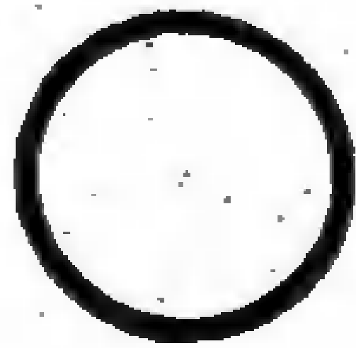
" آپ نے یہ تذکرہ لکھ کر حضرت شیخ کی قبر کو غسل دیا ہے ۔ خُدا کی قسم ! آپ کی کتاب کے مطالعہ سے ہی پہلی دفعہ مجھے پتہ چلا ہے کہ شیخ کا مقام کیا تھا ۔"

چنانچہ اس سلسلے کی دُوسری کتاب " صدرالدین عارف " مدوّن ہُوئی تو اس کی تقریظ حضرت شاہ جیؒ نے ہی تحریر فرمائی ۔ حضرت شیخ الاسلام کا تذکرہ صرف ایک ہزار کی تعداد میں طبع ہُوا تھا ، جو اب تقریباً ناپید ہو چُکا ہے ۔ ۱۹۵۴ء سے اب تک جن لوگوں نے حضرت کی سوانح حیات اور تعلیمات پر کام کیا ہے ۔ اُن سے دانستہ یا نادانستہ طور پر ایسی لغزشیں ہُوئی ہیں کہ حضرت کے حالات اور تعلیمات پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے ۔ اگرچہ بندہ کی عمر اب تصنیف و تالیف کی نہیں ۔ آنکھوں پر موتیا کا حملہ ہو چُکا ہے ۔ تاہم احباب کا اصرار ہے کہ شیخ الاسلام کے تذکرہ کو از سرِ نو بڑے اہتمام سے لکھوں اور جو غلط باتیں حضور سے منسوب کی گئی ہیں ، اُن کا مسکت جواب دُوں ۔ مَیں ابھی کچھ طے نہ کر پایا تھا کہ ایک دن لاہور سے محکمہ اوقاف کے ڈائریکٹر علماء اکیڈیمی ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب کا فون آیا کہ مَیں نے آپ کی تصنیف " تذکرہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ۔ آپ کا قلم

بڑے ادب سے چلتا ہے اور صوفیاء کرام کے حالات کے لیے بڑا موزوں ہے۔ محکمہ اوقاف حضرت شیخ الاسلام کا تذکرہ بڑے اہتمام سے طبع کرانا چاہتا ہے۔ اگر آپ اس کے حقوقِ اشاعت محکمہ اوقاف کو فروخت کرنا چاہیں تو محکمہ مبلغ تین ہزار روپے آپ کی نذر کر سکے گا۔

میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ میری کوئی تصنیف عُمدہ کتابت و طباعت سے سرکاری طور پر طبع ہو۔ اس لیے خاکسار نے بلا تردد محکمہ اوقاف کی یہ پیش کش قبول کر لی اور اس تذکرۂ جلیلہ سے حشو و زوائد کو خارج کر کے اور غیر محتاط مصنفین کی قلمی بے اعتدالیوں کا جائزہ لے کر ایسا گنجینۂ معرفت پیش کیا ہے کہ اللہ والوں سے عقیدت و محبت رکھنے والوں کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ اور محدّب چشموں سے دیکھنے والے ناقدین کو بھی "خطا این جاست" کہنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ بندہ یہ دعوےٰ نہیں کرتا کہ یہ تذکرہ ہر اعتبار سے شیخ الاسلام قدس سرہٗ کی جامع سیرت ہے۔ بندہ نے نقشِ اوّل انتہائی پریشانی، ضعیفی اور بیماری کے ایام میں لکھا تھا، جبکہ پِتّا کے اپریشن اور جگر کے عوارض سے حافظہ نے جواب دے دیا تھا اور اب ضعیفی اور بیماری کے ساتھ ساتھ موتیا کا حملہ اتنا شدید ہے کہ لکھنے لگتا ہوں، تو آنکھوں میں پانی آجاتا ہے اور سَر درد کرنے لگتا ہے۔ تاہم آنے والے دَور کے مصنفین اور محققین کے لیے راہ ضرور ہموار کر دی ہے۔ جب بھی کوئی دانشور یا ادیب اس موضوع پر قلم اُٹھائے گا یہ تذکرۂ جمیل اُس کے لیے مآخذ کا کام دے گا۔ خاکسار کے لیے یہی اعزاز کافی ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِىِّ الْعَظِيْم

خاکسار **نُور احمد خان فریدؔی** عفی عنہ



تقریب

از حضرتِ علّامہ مولانا عبدالرشید صاحب طالوتؒ

مسلمانوں کو مشرقِ وسطیٰ میں فرمانروائی کرتے بمشکل سات سو سال ہی گزرتے تھے کہ دفعتہً ترکستان کی سطوح مرتفع سے ایک تیرہ اور پرہول گھٹا مغلوں کی صورت میں نمودار ہوئی جو دیکھتے ہی دیکھتے اسلامی ممالک کے بلند و پست پر چھا گئی۔ اس کی بے پناہ برق سامانی نے کسی کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ خوارزم شاہ حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ مستعصم کی اکڑی ہوئی گردن کچل دی گئی۔ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ قریب تھا کہ اسلامی عظمت و اقتدار کا چراغ باطل کے اس تیز و تند طوفان کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے گل ہو جاتا کہ صوفیاء کا مقدس گروہ خدا کی تحمید و تہلیل کو سپر بنائے اور خلقِ محمدی کی ننگی تلوار ہاتھ میں لیے مغلوں کے ہلاکت خیز لشکر اور قرامطہ کے خوفناک جتھوں سے ٹکرانے کے لیے اپنے حجروں اور خانقاہوں سے نکل پڑا۔ درندوں سے بھرے ہوئے گھنے جنگل، افعی کی طرح پھنکارتے ہوئے مہیب دریا، تپتے ہوئے لق و دق صحرا۔ بلند و بالا، لنڈ منڈ پہاڑ، اُن کا راستہ روکنے کے لیے آگے بڑھے۔ قدم قدم پر مصائب و آلام کی فلک بوس فولادی دیواریں حائل ہوئیں۔ مگر یہ عجیب دل گروہ کے لوگ تھے کہ ناپیدا کنار دریاؤں کو دو نیم کرتے اور سر بفلک پہاڑوں کو رائی بناتے بڑھتے ہی گئے۔ ان کی طمانیت بخش اور جرأت آفریں صدا ملتِ اسلامیہ کے سرگرداں اور ژولیدہ حال گروہوں میں بانگِ درا بن کر گونجی۔ اقوامِ عالم کی تقدیروں کو بدلنے اور نوعِ انسانی کے عروقِ مردہ میں زندگی کی نئی لہر دوڑانے والے مسیحا نفسوں کے فولاد نے شوکتِ شاہی کے لوہے کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ان کی ہیبت اور سطوت سے وہ سیلاب جو سندھ اور نیل کے کناروں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا، تھم گیا۔ وہ خوف ناک

گھٹا جو شدت سے دولِ اسلامیہ کے مطلع پر چھا رہی تھی، آئینہ رحمت بن کر رہ گئی۔ وہ خون آشام تلواریں جو مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے نیام سے نکلی تھیں، اسلام کی محافظ بن گئیں اور ملتِ اسلامیہ کے اقتدار کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا مل گیا۔

ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ان مجاہدین اور مبلغین میں جنوبی ایشیا کے رجلِ عظیم ——— حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے خلفاء کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ وہ قدسی نفوس تھے جن کا پیکر صناعِ ازل نے عشق کے خمیر سے تیار کیا تھا۔ جو اپنے سینوں میں پارے کی طرح بے تاب دل رکھتے تھے۔ یقین اُن کا ایمان اور عشق اُن کی سپر تھی۔ اسلام کی عظمت کی سربلندی کے لیے یہ ملکوتی انسان قندیلِ ایمان لے کر SIX HUNDRED SOLDIER SAINTS[1] (چھ سو درویش مجاہدین)، کی شکل میں بنگال کی رزم گاہ میں بجلی بن کر گوڑ گوبند کے لشکر پر کوندے اور کبھی جمالِ خداوندی کا مظہر بنے۔ انڈونیشیا، فلپائن اور چین کے قریہ قریہ میں دعوتِ حق دیتے نظر آئے۔ جو رضائے الٰہی کے لیے بحرِ ہند کے طوفانوں سے اُلجھے۔ سیام اور برما کی پہاڑیوں سے ٹکرائے اور ظلمات ——— کے پردوں کو چاک کرتے ہوئے وہاں تک پہنچے، جہاں تک تخیلِ انسانی کی رسائی ہو سکتی ہے۔ الغرض کشمیر، سندھ، گجرات، دکن، بنگال اور مشرقِ بعید کی بھولی بھٹکی مخلوق کو اسلام سے متعارف کرانے میں ہمارے شیخ الاسلام کا بڑا حصہ ہے۔

آپ نے ملتِ اسلامیہ کی اُس وقت نگہبانی فرمائی، جب اغیار و اعداء نے اس پر زندگی کی ساری راہیں مسدود کر دی تھیں۔ گو آپ کی باعظمت شخصیت کے احترام کا غیر معمولی جذبہ ہر وقت ہمارے قلب و دماغ پر شدت سے طاری و ساری رہتا ہے اور پھر آپ کا کوہ وقار اور فلک بوس مقبرہ بھی اپنی عظمت و جلالت کی زندہ تصویر بنا، اہلِ ملتان سے خراجِ عقیدت وصول کرتا رہتا ہے۔ تاہم ایک بہت بڑی فروگذاشت جو ہمارے مؤرخین سے ہوتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ کسی نے آج تک حضرت کے حالات و تعلیمات کو اس طرح نہیں لکھا، جس کی آپ کی

---

[1] تاریخ بنگال، مرتبہ جادو ناتھ سرکار، جلد دوم، ص ۶۸ تا ۷۰۔

ذاتِ گرامی مستحق تھی۔ بالخصوص اُردو کا دامن تو ملّتِ اسلامیہ کے اس "رجلِ عظیم" کے ذکر سے ایک طرح بالکل تہی ہے اور ہمیں بصد ندامت یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایسی بلند پایہ شخصیت پر اب[1] تک کوئی کتاب شائع نہیں ہو سکی۔

فریدی صاحب نے حضرت شیخ الاسلامؒ کا تذکرہ لکھ کر ملّتِ اسلامیہ پر بالعموم اور اہلِ پاکستان پر بالخصوص بڑا احسان کیا ہے۔ یہ سیرت مُردہ دلوں میں ایک نئی رُوح پھونکتی ہے، زندگی کا نیا ولولہ پیدا کرتی ہے اور قارئین کو اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کا یہ تذکرۂ جمیلہ اس نئی ملّت کے لیے درسِ حیات ہے۔ جو برِّصغیر پاک وہند میں پروان چڑھ رہی ہے۔ مولانا فریدی مسلمانوں کو پھر تصوّف کے اُس چشمۂ حیات پر لے آئے ہیں جس سے اسلامی دُنیا بُعدو ہجر اختیار کر چکی تھی۔ آپ نے اصطلاحاتِ صُوفیہ خاص کر وارداتِ عشق اور کشف وکرامات سے متعلق گہری واقفیت بہم پہنچائی ہے اور پھر جہاں تک اُن کا تعلق آیاتِ قرآنی کے ساتھ تطبیق سے ہے، وہ بھی کافی غور و فکر اور وسیع مطالعہ کے اثرات کی حامل ہے۔

اگرچہ یہ کتاب ایک ولی اللہ کی سچّی رُوح پرور، ایمان افروز اور حیرت انگیز داستان ہے، اس کے باوجود مولانا نے اسے خشک اور مغلق نہیں ہونے دیا۔ زبان اور طرزِ بیان عموماً سلیس، شگفتہ، دل کش اور ادیبانہ ہے۔ عنوانات تنوّع اور ندرت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر چند ایک عنوانات ملاحظہ ہوں۔

قبۂ ابیض۔ یاساریۃ الجبل۔ اِتّبِع سَبِیلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیّ۔ جہاد کا سفرِ عام۔ صبحِ سعادت۔ قران السعدین۔ کاسۂ شیر۔ یارانِ طریقت۔ آہ شیخِ بخارا۔ میر حسینی کجاست ؟ بیابیا عراقی۔ یکے از چہار یار۔ بخارا کا مُسافر۔ وارداتِ عشق۔ تصفیۂ قلب۔ خضرِ راہ۔ کیفیتِ ذکر۔ تجلیاتِ حق۔ ثمراتِ عشق۔ عشق کی وادی میں۔ نارِ نمرود کی غلط تاویل۔ اسرارِ دوست فاش مکن۔ آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند۔ کسے جمالِ خویش بدیگرے نمی دہد۔

آخر میں جنوبی ایشیا کے اُن تمام آستانوں کی فہرست دی گئی ہے، جنہیں اس درس گاہ سے

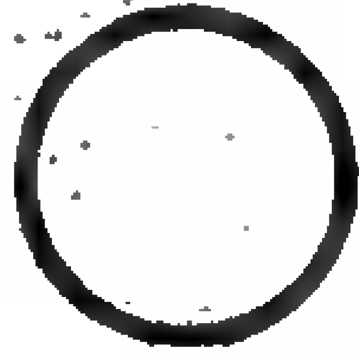
---

[1] یعنی ۱۹۵۰ء تک۔ (مؤلف)

روحانی نسبت کا شرف حاصل ہے۔ "آسمانِ غوثیت کے تابندہ ستارے" اس کا عنوان ہے۔ دراصل اس میں حضرت کے یارانِ بے ریا اور لاکھوں جان نثاروں میں سے صرف ان شخصیتوں کو لیا گیا ہے۔ جن کا ذکر تاریخ اور سِیَر کی کُتب میں ملتا ہے۔ جن اولیاء اللہ نے اس خانوادے سے منسلک ہونے کے باوجود ساری زندگی گمنامی میں بسر کر دی ہے اور اُنھوں نے کہیں اپنے آپ کو منظرِ عام پر نہیں آنے دیا۔ ان تک مصنّف کی رسائی کیسے ہو سکتی تھی ؟ بہر حال اتنا بھی غنیمت ہے کہ مولانا نے مشرق اور مغرب کے کُتب خانے چھان کر سلسلۂ سہروردیہ کے بکھرے ہوئے لولوئے شاہوار ایک لڑی میں پرو دیئے ہیں۔

مولانا کی یہ کاوش اپنی افادیت کے سبب بے حد اہم ہے۔ المختصر کتاب کا ہر ورق اسرار و معارف اور فکر و عبرت کا آئینہ دار ہے۔ مَیں محرک اور مصنّف دونوں کے لیے دُعائے خیر کرنا اسلامی اور اخلاقی فرض تصوّر کرتا ہوں۔ خُدا کرے یہ خدمت ان حضرات کے لیے نجاتِ اُخروی کا ذریعہ اور ملّتِ اسلامیہ کے لیے ہدایت کا موجب بنے۔ اور قوم اس مجلّہ کی ورق گردانی کی بدولت گہری نیند سے جاگے اور ان اسباب پر غور کرنے لگے، جنھوں نے اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ آمین یا ربّ العالمین !

"طالوت"



تعارف

حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین ابو محمد زکریا سہروردی

رحمتہ اللہ علیہ

حضرت شیخ الاسلام کا علمی و روحانی مقام

روحانیت کا وہ آفتاب عالمتاب!

- جو اُفقِ ملتان سے طلوع ہُوا اور اُس کی ضیاء نے تمام دُنیا کو منوّر کر دیا۔
- وہ جس نے خانقاہوں کو اُن کی چھنی ہُوئی عزّت بخشی اور شریعت و طریقت کے مابہ الامتیاز کو واضح کیا۔
- وہ جس نے خود پرستی کے اُن بُتوں کو توڑ کر چکنا چُور کر دیا، جنہوں نے شریعت اور طریقت کے درمیان دیوار کھڑی کر دی تھی اور خدا پرستوں کو خود پرستی کا بیمار بنا دیا تھا
- وہ جس نے ملتان کے قلعہ شاہی میں بہت بڑی درس گاہ کی بُنیاد رکھی۔ جس میں نہ صرف شرعی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بلکہ اسلام کی حقانیت کو واضح کرنے اور اکنافِ عالم میں توحید کی شمعیں روشن کرنے کے لیے مبلغین کی جماعتیں تیار کی جاتی تھیں۔
- وہ جوّادِ اعظم!

جس کے خلفاء ہزاروں روپے کا سامانِ تجارت خرید کر سوداگروں کے بھیس میں انڈونیشیا، فلپائن اور چین تک کا سفر کرتے اور تجارت کے ساتھ ساتھ وہاں کے عوام کو اسلام سے روشناس بھی کراتے تھے۔

- وہ شیخ کامل، جس کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ اُس کی لونڈیاں چکّی پیسنے بیٹھتیں تو قرآن ختم کر کے اُٹھتی تھیں۔
- وہ مُرشدِ ارشد جو مرید کرتے وقت اس امر کی بیعت لیتا تھا کہ وہ جو کسب کرتا ہے، اس میں بد دیانتی نہیں کرے گا۔
- وہ خدا یاد درویش! جس کے رُعب سے سلطان ناصر الدین قباچہ ترساں و لرزاں رہتا تھا۔

- وہ جس نے اسلامی تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔
- وہ جس نے فکر و نظر میں انقلاب پیدا کر دیا۔
- وہ جس نے قلب و رُوح کو نئی زندگی بخشی۔
- عراقی اور حسینی جیسے اغواث و اقطاب کو مُرشد۔ جسے رفیقِ اعلیٰ کو لبیک کہے نو صدیاں گزر چکی ہیں، مگر اس کا مزارِ پُرانوار اب بھی مایوس دلوں کی اُمید گاہ ہے۔ ہزاروں ہاتھ صُبح و شام فاتحہ کے لیے اُٹھتے ہیں اور قُبہ ابیض قلعے کی بلندی سے شہر پر نور بکھیرتا نظر آتا ہے ؎

ہر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بُوَد
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بُود

- وہ جس کا ذکر سیّد السادات جلال بخاری ان الفاظ میں کرتا ہے :

"آں سُلطانِ ملّتِ مصطفوی وآں بُرہانِ دین محبّ نبوی وآں پروردۂ مسلک نبوّت وآں خواجۂ دلیل فتوت وآں متمکّن ہدایت وآں متوکّل ولایت وآں والیٔ قُبۂ عزّت، وآں صفی پردۂ وحدت وآں آفتاب کرم و احسان وآں دریائے ورع و امکان، وآں گنج عالم عزلت، وآں خزینۂ سرائے دولت وآں مبارزِ میدانِ مجاہدہ، وآں مجاہد ایوانِ مشاہدہ ▪ وآں عامل راہِ ہدایت وآں کامل بارگاہِ عنایت وآں خلیفۂ الٰہی وآں داعی نامتناہی وآں زینِ زماں وآں رُکنِ اَماں وآں تاجِ دین و دُنیا، وآں شمعِ زہد زاہداں، وہ آں چراغِ شرع و ملّت وآں مشعلۂ دین و دولت وآں سلطانِ شریعت وآں برہانِ حجّت و طریقت، وآں قدوۃِ اولیاء وآں عمدۃِ اتقیاء، وآں مجرد باطن و ظاہر وآں فرد غائب و حاضر وآں زاہد متمکن وآں عابد متدیّن وآں سلطان الاولیاء وآں معلم الدرس والارث وآں حقیقت الاصفیاء وآں شمس صفوۃ الدنیا والدین بدر المشائخ، بہاء الحق والدین ابو محمد زکریا القرشی الاسدی الکبیر المنیر، قدس اللہ سرّہٗ۔

(درجہ دادام اللہ علینا فتوحاتہ' دالی آخرہ)

مولانا جامیؔ جو ہمایونی عہد کے مشہور مورخ اور سہروردیہ سلسلہ کے بجائے خود درویش کامل ہو گزرے ہیں، انھوں نے حضرت کا تذکرہ کچھ ایسے ہی الفاظ میں کیا ہے:

"آں گوہر دُرج شریعت و طریقت و آں اختر بُرج معرفت و حقیقت، آں رہنمائے منازل تصدیق، و آں ابواب کشائے معارفِ تحقیق، آں مرشد سالکان صاحب حال و آں رہبر رہروانِ اہلِ کمال و آں زبدۃ اتقیاء و آں خلاصۃ اولیاء بہاء الدین ابو محمد زکریا قدس سرہ العزیز از اولیائے کبار بود و در روشِ مشیخت صاحب اعتبار، در علوم ظاہری مجتہد زماں و در اسرارِ باطن سلطان، سریر عرفان، در عہدِ خویش از بے نظیران روزگار بود و در کشف و کرامت عدیم المثال و در عبادت و ریاضت مستقیم الاحوال" ؎

آں محرم رازِ لامکانی ۔۔۔ موصوف صفاتِ جاودانی

افلاک بزیر پائے کردہ ۔۔۔ در عالم عشق جائے کردہ

جاروفتہ از فنائے توحید ۔۔۔ پا کوفتہ در بقائے تفرید

باطن بہویت و حقیقت! ۔۔۔ ظاہر بشریعت و طریقت

آں پاک گزیدۂ مشائخ! ۔۔۔ و آں مردم دیدۂ مشائخ!

سُلطانِ سریر ملک و تمکین ۔۔۔ یعنی کہ بہائے ملت و دیں

او مالکِ ملکِ لایزالیست! ۔۔۔ در مسلک مجتش جمالیست![1]

عراق، شام اور مصر کے شیخ الکل حضرت مولانا فخر الدین عراقیؔ نے حضرت شیخ الاسلام کی شان میں جو قصائد لکھے ہیں، ان سب کی گنجائش یہاں کہاں؟ ان میں سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

شیخ شیوخ جہاں قطبِ زمین و زمان ۔۔۔ غوثِ ہمہ انس و جاں مالکِ تحتِ رقاب

---

[1] سیر العارفین، قلمی ص ۳۸

ناشرِ علم الیقیں، کاشفِ عین الیقیں ... واصی حق الیقیں مہدی ہادی خطاب
مفضل فاضل نواز عالم عالم پناہ ! ... مکمل کامل صفات عالی عالی جناب
پُرسی اگر از جہاں کیست امامِ زماں؟ ... نشنوی از آسماں جز زکریا جواب
در نظرِ ہمتش ہر دو جہاں نیم جو ... در کفِ دریا وشش ہفت فلک یک حباب
سالکِ مجذوب را بر درِ او بازگشت ... طالبِ مطلوب را از درِ او فتح باب
سدۂ اقبالہٗ قبلہ اہل الثواب ... کعبۂ افضالہٗ مامن اہل العقاب
قطرۂ الغامہ روح قلوب الصدور ... تربت اقدامہٗ کحل عیون المعاب
اے تیو روشن جہاں ذرہ چگوید ثنات ... خاطر من ترک مدح تو خورشید تاب
پیشِ سلیماں چو مور تحفۂ آرم ملخ ... مجلسِ داؤد را نغمۂ طنین رباب
چنگ بفتراک تو در زدہ ام بندہ وار ... تا شوم روزِ حشر با خدمت ہم رکاب
در کنفِ لطفِ تو بردہ عراقی پناہ ... درگہ رحماں بود غم زدگاں را مآب
گر شنود مصطفٰے مدحت حساں تو، ... گویدم احسنت زہ صرت بکون الصواب

ولہٗ

روشندلاں آئینہ دل چو مصفا بینند ... رُوئے دلدار دراں آئینہ پیدا بینند
خاصِ حق صاحب قدوس بہاء الاسلام ... غوث حق رحمتِ عالم زکریا بینند
خاک پایش بتبرک ہمہ در دیدہ کشند ... تا مگر از مددش نور تجلّٰی بینند
قطب وقت اوست ہمہ عالم ازو آسودہ ... بر درش زمرۂ ابدال تو لا بینند
بیدلاں نظر او دلِ بینا یابند ... مردگاں از نفس او دمِ احیاء بینند
مکرما بر درِ لطفِ تو پناہ آوردیم ... بندگاں ملجائے خود درگہِ والا بینند
ز آفتاب نظرت بر سر او سایہ فگن ... تا مگر بر مگس سایۂ عنقا بینند
گرچہ چوں آہن زنگار پذیر است دلش ... سُوئے او کن نظرے کائینہ سیما بینند
بکشا از لبش اے موسی عہد آب خضر ... بعصائے کہ ترا برید بیضا بینند
بوسہ گاہ ہمہ پاکانِ جہان باد درت ... کز ہمہ درگہ تو ملجا و ماوٰی بینند

عالم از نفسِ نفیس تو مبادا خالی
کہ جہاں ہر دم از انفاس تو بو یابیند

ولہٗ

شیخ ربّانی بہاء الحق والدین آنکہ ما
بوسہ بر خاک درش چوں قدسیاں ہر دم زنیم

پائے چوں روح القدس بر دیدۂ سدرہ نہیم
آتش از سوزِ دل در بنگہ آدم زنیم

خرمنِ ہستی بباد بے نیازی بر دہیم
دست در فتراکِ صاحب ہمت اعظم نہیم

خاک روبیم از سرِ کویش بجاروبِ وفا
در بباند گرد کے از دیدہ آبِ نم زنیم

حضرت میر حسینیؒ نے اپنی تصانیف میں عراقی سے بھی زیادہ شیخ کے قصائد لکھے ہیں طوالت کے خوف سے ذیل کے چند اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے ؎

شیخ ہفت اقلیم قطب اولیاء
واصلِ حضرت ندیم کبریا!

مفخرِ ملت بہائے شرع دیں
جانِ پاکش منبعِ صدق و یقیں

از وجودِ او بنزدِ دوستاں
جنت الماویٰ شدہ ہندوستاں

منکہ رو از نیک و از بد تافتم
ایں سعادت از قبولش یافتم

رختِ ہستی چوں بپرواز ایں جہاں
کرد پروازِ ہما بر آسماں!

آں بلند آوازۂ عالم پناہ!
سرورِ عصر افتخار صدر گاہ

صدر دین و دولتِ آں مقبولِ حق
نہ فلک برخوانِ جودش یک طبق

(کنز الرموز)

قبّۂ ابیض

حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرّہٗ العزیز کا قبّۂ ابیض جنوبی ایشیا کے قدیم ترین شہر ملتان میں واقع ہے۔ صدیاں بیت گئیں، ہزارہا خاندانوں نے امیری غریبی کی چادریں لپیٹیں۔ بڑے بڑے نامور سلاطین آئے اور تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ[1] کا شاہانہ اعتراف کرتے ہوئے مُلکِ عدم کو رُخصت ہو گئے۔

وہ محلات جن سے آٹھوں پہر مُشک وعنبر کی لپٹیں اُٹھا کرتی تھیں، جہاں ہر طرف ریشم اور مخمل کے پردے آویزاں رہتے تھے۔ جن میں ہر وقت کشمیر اور ایران کے زرّیں کار غالیچے بچھے رہتے تھے۔ آج دُنیا اُن کے آثار تک دکھانے سے قاصر ہے اور وہ سر بفلک قلعہ بھی جو سکندرِ اعظم سے سر نہ ہُوا تھا، کھنڈر بن چُکا ہے۔

چناب جو کبھی قلعے کی دیواروں سے ٹکرا کر گزرتا تھا، آج بیس میل شمال کو ہو کر بہتا ہے۔ الغرض اس قدر انقلابات آئے کہ اس مُلک کا جغرافیہ تک بدل گیا ہے، لیکن اس کے باوجود حضرت شیخ الاسلامؒ کے قبّۂ ابیض کی شوکت و دارائی میں فرق نہیں آیا۔ ہزاروں آندھیاں آئیں، سینکڑوں طوفان ٹکرائے۔ حملہ آوروں کی دست بُرد سے شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، مگر روضۂ اقدس کی یہ کیفیت ہے کہ جو اینٹیں حضرت شیخ الاسلامؒ خود لگوا کر گئے تھے، وہ آج بھی جُوں کی تُوں موجُود ہیں۔

سلطان ناصر الدین محمود، سلطان غیاث الدین، محمّد تغلق، فیروز شاہ، سلطان حسین، دارا شکوہ اور اورنگ زیب، خُدا جانے کتنے قہرمانِ تاجدار اس بارگاہ پر حاضری دے چُکے ہیں۔ اور خُدا معلوم ابھی کتنے دُوسرے شہریاروں کی قسمت میں اس درگاہ کی حاضری مقدر ہو چُکی ہے۔ زمانہ بدلتا رہے گا۔ حکومتیں کروٹیں لیتی رہیں گی۔ باشندے

---

[1] آلِ عمران: ۲۶

اِدھر سے اُدھر بدلتے رہیں گے۔ لیکن حضرت شیخ الاسلام کا یہ قبہ ابیض اسی طرح خاص وعام سے خراجِ عقیدت وصول کرتا رہے گا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

درگاہِ معلیٰ پر حاضری

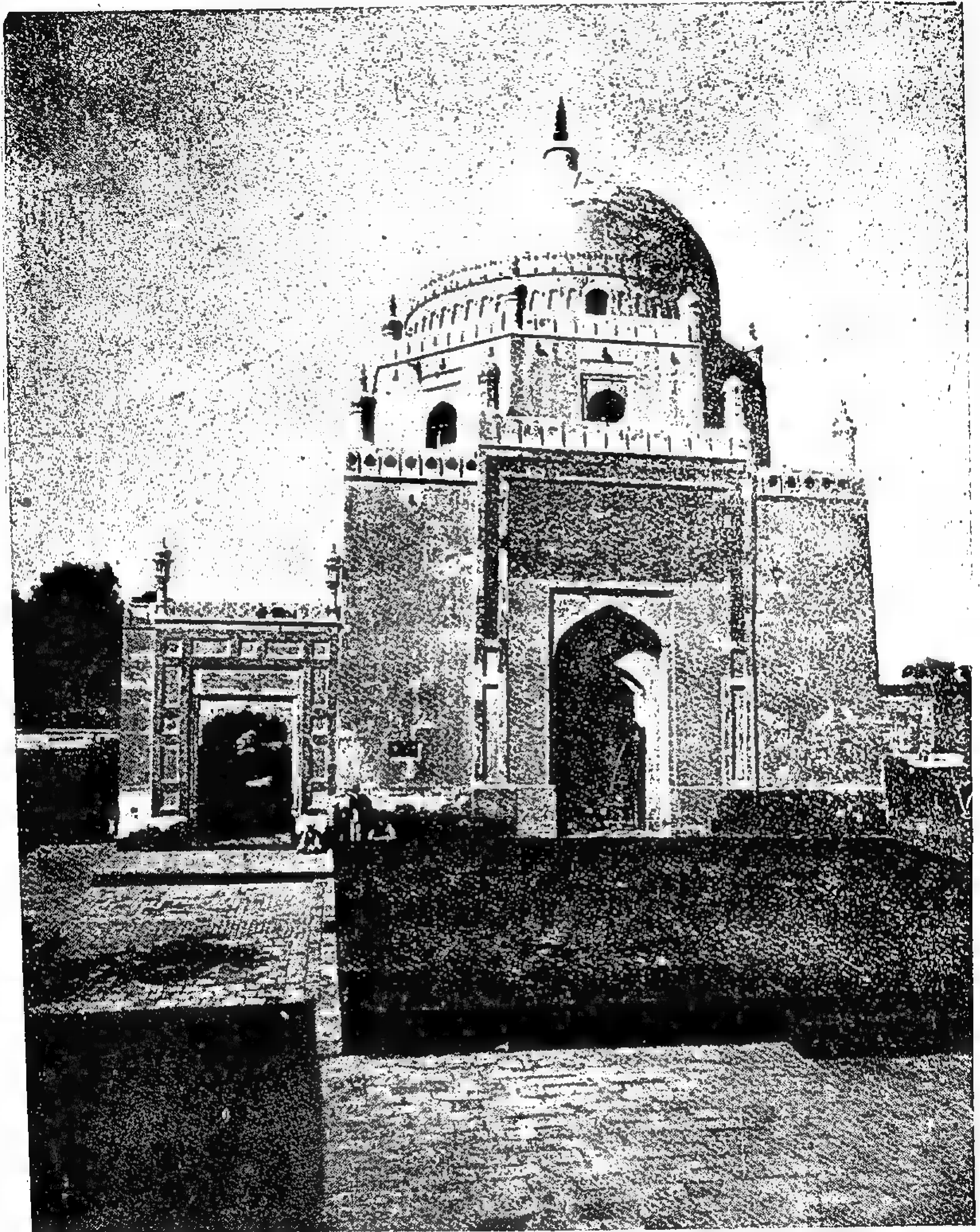
حضرت شیخ الاسلامؒ کا قبۂ ابیض کئی میلوں سے گردن نکالے اپنے ارادت مندوں کو خوش آمدید کہتا دکھائی دیتا ہے۔ زائرین اسٹیشن سے ہی اس فلک رفعت مقبرہ کی زیارت کر لیتے ہیں۔ شوقِ دید کا یہ عالم ہوتا ہے کہ پل نہ گزرے اور مقصود کی جناب میں جا پہنچیں۔

بس شہر کے خوش منظر حصوں کے چکر کاٹتی زائر کو حضرت شیخ الاسلامؒ کے قدموں میں جا اُتارتی ہے۔ اسلامیہ ہائی سکول کے عین درمیان سے ایک راستہ نکلتا ہے۔ جو بتدریج نیچے سے اُوپر کو بلند ہوتا چلا گیا ہے۔ راستے میں دائیں جانب شاہ دین بیراگی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت میراں خنگ سوار کے مزار آتے ہیں۔ زائر اُن پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پرہلاد مندر کے متصل ایک رفیع المرتبت دروازہ آ جاتا ہے۔ جس پر بخط جلی یہ کتبہ مرقوم ہے:

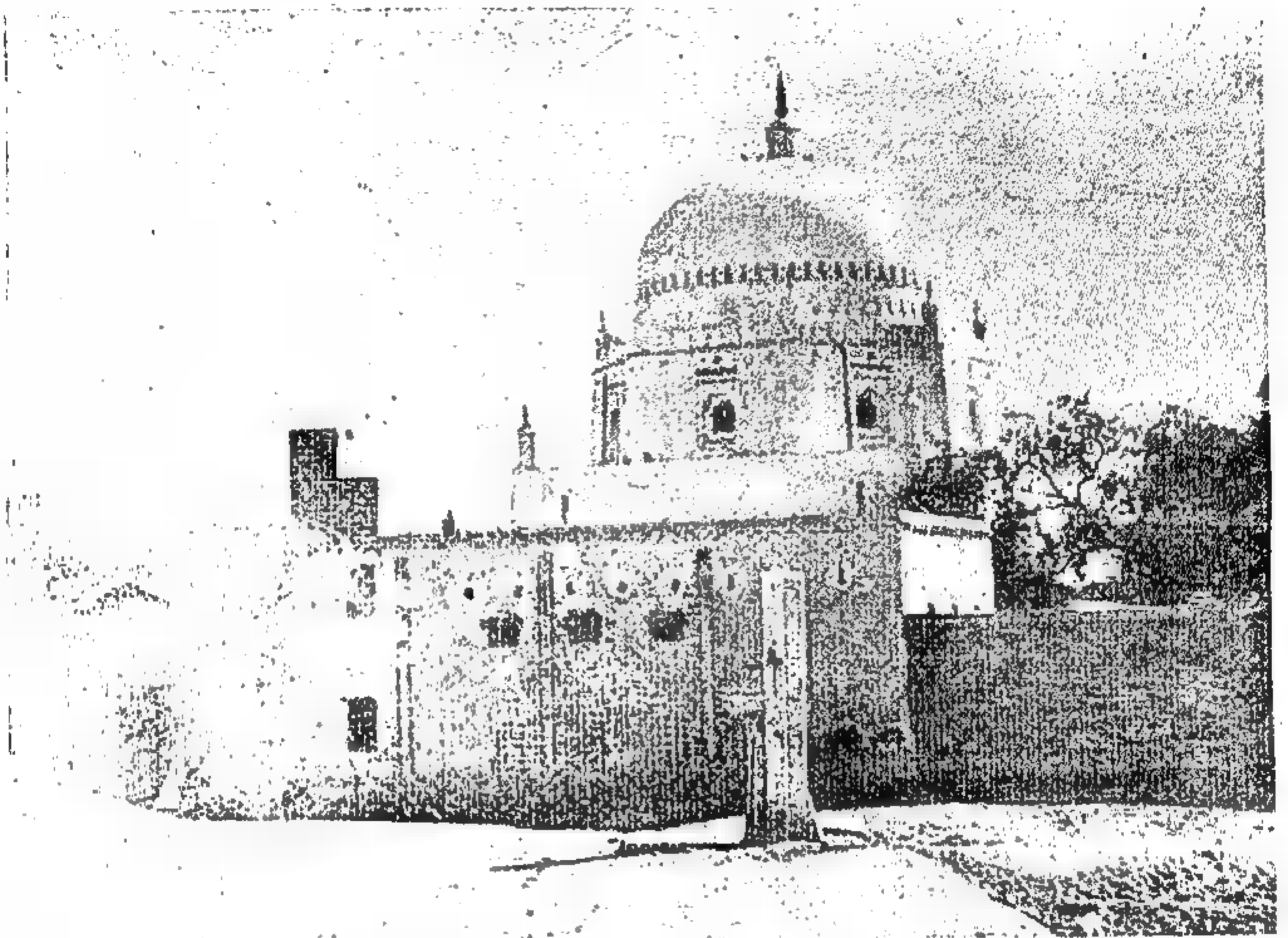
خانقاہ شیخ الاسلام حضرت غوث بہاء الحق والدین زکریا ملتانیؒ

تاریخ وفات ۷ صفر ۶۶۱ھ

زائر اندر قدم رکھتے ہی ایک نئی دُنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ہر چیز نئے رنگ اور نئے ڈھنگ میں نظر آتی ہے۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ گویا قدرت نے شیخ الاسلامؒ کی ہر چیز کو تصوف کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ ہر شئے زائر کے دل پر اثر ڈالتی ہے اور آدمی فرطِ رُعب سے لرز اُٹھتا ہے۔ ڈیوڑھی میں دائیں جانب حضرت شیخ الاسلامؒ کے ایوان کا دروازہ ہے۔ نقیب اور چاؤش رہ رہ کر پکار اُٹھتے ہیں "مدد بہاء الحق" زائر کی حالت اس وقت ایسی ہوتی



روضہ شیخ الاسلام کا وہ تاریخی چبوترہ جس پر حضرت نے بیس برس کامل عصر کے بعد وعظ فرمایا ہے۔ ان مواعظ میں دلوں کی کائنات ہل جاتی تھی۔ فولادی طبائع نرم ہو کر موم بن جاتی تھیں۔ خشونت آمیز نگاہوں سے خشیّت الٰہی کی دھاریں پھوٹ پڑتیں اور ہزاروں فاسق و بدکار تائب ہو کر قطب و ابدال بن جاتے تھے۔



حضرت شیخ الاسلام والمسلمین بہاؤالحق والدین ابو محمد زکریاؒ کے روضہ مبارکہ کا
پُرشوکت منظر جو آج بھی فیض کا سرچشمہ ہے۔ کوئی سائل در اقدس سے محروم نہیں جاتا۔
بیقرار دلوں کو تسکین کی دولت ملتی ہے۔ اور مایوس و ناکام دل اپنی مرادیں حاصل کرتے ہیں۔

ہے، جیسے کوئی ملزم کسی بڑے جرم کا مرتکب ہو کر معافی طلب کرنے کے لیے ایک جلیل القدر بادشاہ کے دربار میں باریاب ہو رہا ہو۔

ساڑھے نو فٹ آثار طے کرنے کے بعد زائر اپنے آپ کو شیخ الاسلامؒ کے دربار میں پاتا ہے۔ دربار خاصانِ خاص سے کھچا کھچ بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ زائر دائیں جانب ایک تنگ راستہ کے ذریعے سرنگوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا حضور کے دائیں پہلو میں جا پہنچتا ہے اور بے اختیار ایک آہ کہہ کر آپ کے تخت سے (جس سے دنیا کے لاکھوں تختِ طاؤس خم کھاتے ہیں۔) چمٹ جاتا ہے۔ اور زار و قطار روتا ہے۔ حتیٰ کہ شیخ کا دامن اور زائر کا چہرہ قطراتِ اشک سے تر بتر ہو جاتے ہیں۔ شاہانِ مجاز کی طرح حضرت شیخ الاسلامؒ جھڑکتے نہیں اور نہ ہی کسی اہل کار یا خادم کی جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ آئے اور ملاقاتی کو شیخ الاسلامؒ کے دامن سے جدا کرے۔

جب زائر رو رو کر نڈھال ہو جاتا ہے تو اچانک اُسے محسوس ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام نے اپنا بابرکت ہاتھ اُس کے دل پر رکھ دیا ہے۔ ایک عجیب سکون و اطمینان کی لہر زائر کی رگ رگ اور نس نس میں دوڑ جاتی ہے۔ سیاہ کار اور مجرم زائر کا دل شہادت دیتا ہے کہ عرقِ انفعال کے چند قطرات کو ذاتِ ذوالجلال نے حضرت شیخ الاسلامؒ کی توجّہ سے شرفِ قبولیّت بخشا ہے۔ اور نامۂ اعمال کدورتوں سے صاف ہو گیا ہے۔ تب شادمانی و کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اور اپنے دونوں ہاتھ مرقدِ مبارک پر رکھ کر انتہائی ادب و احترام سے بوسہ دیتا ہے۔ غلاف کو اپنی آنکھوں سے لگاتا اور چومتا ہے۔

پھر ذرا پیچھے ہٹ کر بائیں جانب کو پشت کر کے حضور شیخ الاسلامؒ کی خدمت میں فاتحہ کا تحفہ پیش کرتا ہے۔ اپنے، اپنے خاندان اور ملّتِ اسلامیہ کے لیے مولائے کائنات کی خدمت میں دُعا طلب کرتا ہے اور اس جلیل القدر اور محبوب شخصیت کا واسطہ دیتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی بے بسی اور بے کسی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد نہایت انکسار سے حضور شیخ الاسلامؒ اور آپ کے پہلونشین فرزندِ جگر بند حضرت شیخ الاسلامؒ ابوالمغانم صدر الدین محمد عارف باللہ اور آپ کے درباریوں کو جھک جھک کر سلام کرتا ہوا بائیں جانب کے راستے پیچھے ہٹتا، دروازے سے باہر

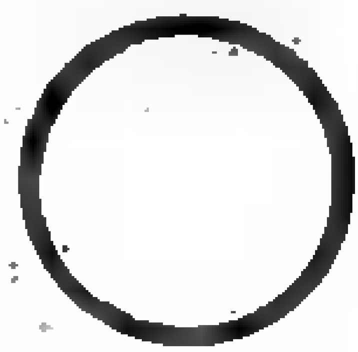
نکل آتا ہے اور ایک عجیب فرحت و انبساط محسوس کرتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسانی کمزوریوں اور لغزشوں کا وہ بارِ گراں جو وہ کندھوں پر اُٹھا لایا تھا، اُس سے اُتار لیا گیا ہے۔ یہ ایک عمومی کیفیت ہے جو تقریباً ہر زائر کے دل پر گزرتی ہے۔ خاصانِ بارگاہ کی اس سے بھی عجیب تر حالت ہوتی ہے، بہرکیف ع

جتنا ہے ظرف اُس کا اتنا وہ پی رہا ہے

اگرچہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے واقعات عالم آشکار ہیں اور دُنیا کا ذرہ ذرہ اُن کے سوانح حیات سے آشنا ہے۔ لیکن اُن کے ذکر میں کچھ ایسی حلاوت پائی جاتی ہے کہ قند مکرّر کا لُطف آتا ہے۔ اس لیے مختصراً سپردِ قلم کرتا ہوں ؎

ما طفلِ کم سواد و سبق قصّہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم



22578


آباء و اجدادؒ

تمام تذکرہ نگاروں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ حسب نسب کے اعتبار سے قریشی الاسدی تھے۔ حضور کی اولاد میں سے بعض افراد اپنے آپ کو اسدی الہاشمی لکھتے ہیں۔ حالانکہ ایک دُنیا جانتی ہے کہ اسد بن ہاشم مقطوع النسل تھے۔[1] لوگوں نے غلطی سے اسد بن عبدالعزیٰ کو اسد بن ہاشم سمجھ لیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اسد بن عبدالعزیٰ اور اسد بن ہاشم دونوں ایک ہی گھرانے کے رُکنِ رکین ہیں۔ ایک اسد کا نسب نامہ دو واسطوں سے جناب قصیٰ سے ملتا ہے اور دُوسرے کا تین واسطوں سے "تاریخ الخمیس" اور "روضۃ الاحباب" کے نزدیک سوائے آل عبدالمطلب کے دُنیا میں کوئی بنی ہاشم نہیں۔ اسی طرح علامہ شامی بھی سوائے عبدالمطلب کی اولاد کے کسی کو ہاشمی تسلیم نہیں کرتے۔[2]

مخدوم سیّد جلال بخاریؒ کا قول فیصل مخدوم سیّد جلال بخاریؒ حضرت شیخ الاسلامؒ کے محبوب مرید اور نامور خلیفہ نے اپنے پیرومرشد کا جو شجرہ پیش کیا ہے۔ وہ حضرت شیخ الاسلام کے فرزندِ اکبر حضرت صدر الدین عارف قدس سرہٗ کی بیاض سے نقل شدہ ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

ذٰلِكَ اَدْنٰی وَجَدْتُ نُسْخَةً مَكْتُوْبَةً مَوْثُوْقَةً بِخَطِّ شَيْخِنَا شَيْخُ الْاِسْلَامِ صَدْرِ الْحَقِّ وَالدِّيْنِ اَبِي الْمَغَانِمِ مُحَمَّدٌ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ ۔

اسی لیے اکثر محققین نے اسی نسب نامہ پر اعتماد کیا ہے۔ جن میں شیخ عین الدین بیجاپوریؒ ،

---

[1] کتاب المعارف لابن قتیبہ: کتاب الاشتقاق لابن درید ابن ہشام۔

[2] ردّ المختار عرف شامی باب الزکوٰۃ۔

پیرزادہ محمد حسین صاحب، مترجم سفرنامہ ابن بطوطہ، شیخ محمد علی صاحب رونق مؤلف تحقیق الانساب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت مخدوم سید جلال بخاریؒ نے اس امر پر بڑے فخر و مباہات کا اظہار کیا ہے کہ میرے مُرشد کے آباء و اجداد عرب کے رؤسا اور شرفاء میں سے تھے اور وہ ممتاز قریشی تھے۔ کیونکہ ان کا نسب حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلّم کے نسب مبارک کے ساتھ جناب قصّی سے مل جاتا ہے۔ جناب قصّی کے دو فرزند تھے، ایک عبد المناف جو سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلّم کے جدّ ہیں۔ اور دوسرے عبد العزّیٰ جو ہمارے مشائخ کے مورث و جدِّ اعلےٰ ہیں۔

پھر فرماتے ہیں کہ ہمارے مشائخ کا نسب اکیس واسطوں سے اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کا پانچ واسطوں سے جناب قصّی سے ملتا ہے۔ حضرت مخدوم جلال بخاریؒ کی عبارت کا متن ملاحظہ ہو:۔

وَمَشَائِخُنَا كَانُوا مِنْ رُؤَسَاءِ الْعَرَبِ وَسَادَاتِهِمْ وَاشْرَفِ النَّاسِ حَسَبًا وَّنَسَبًا لِاَنَّهُمْ قُرَيْشِيُّوْنَ مِنْ اِتَّصَلَ نَسَبُهُمُ الْاَشْرَفِيُّوْنَ اِلٰى نَسَبِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى قصّی بن کلاب۔ وَقصّی جَدِّ نَبِيِّنَا وَمُشَائِخُنَا رِضْوَانُ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ وَلَد قصّی ابناً مِنْهُمْ عَبْدُ الْمَنَافِ جَدُّ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَعَبْدُ الْعُزّٰى جَدِّ مُشَائِخُنَا رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ وَمِنْهُمْ اِلٰى قصّی عِشْرُوْنَ اَحَدَ بَطْنًا وَّمِنَ النَّبِيِّ اِلٰى قصّی خَمْسَةٌ[1]۔

نسب نامہ مصدّقہ سیّد السادات جلال بخاریؒ

انتہی وضاحت کے بعد حضرت مخدوم نے شیخ الاسلامؒ کا مکمل نسب نامہ اپنے ملفوظ میں اس طرح سے درج کیا ہے:

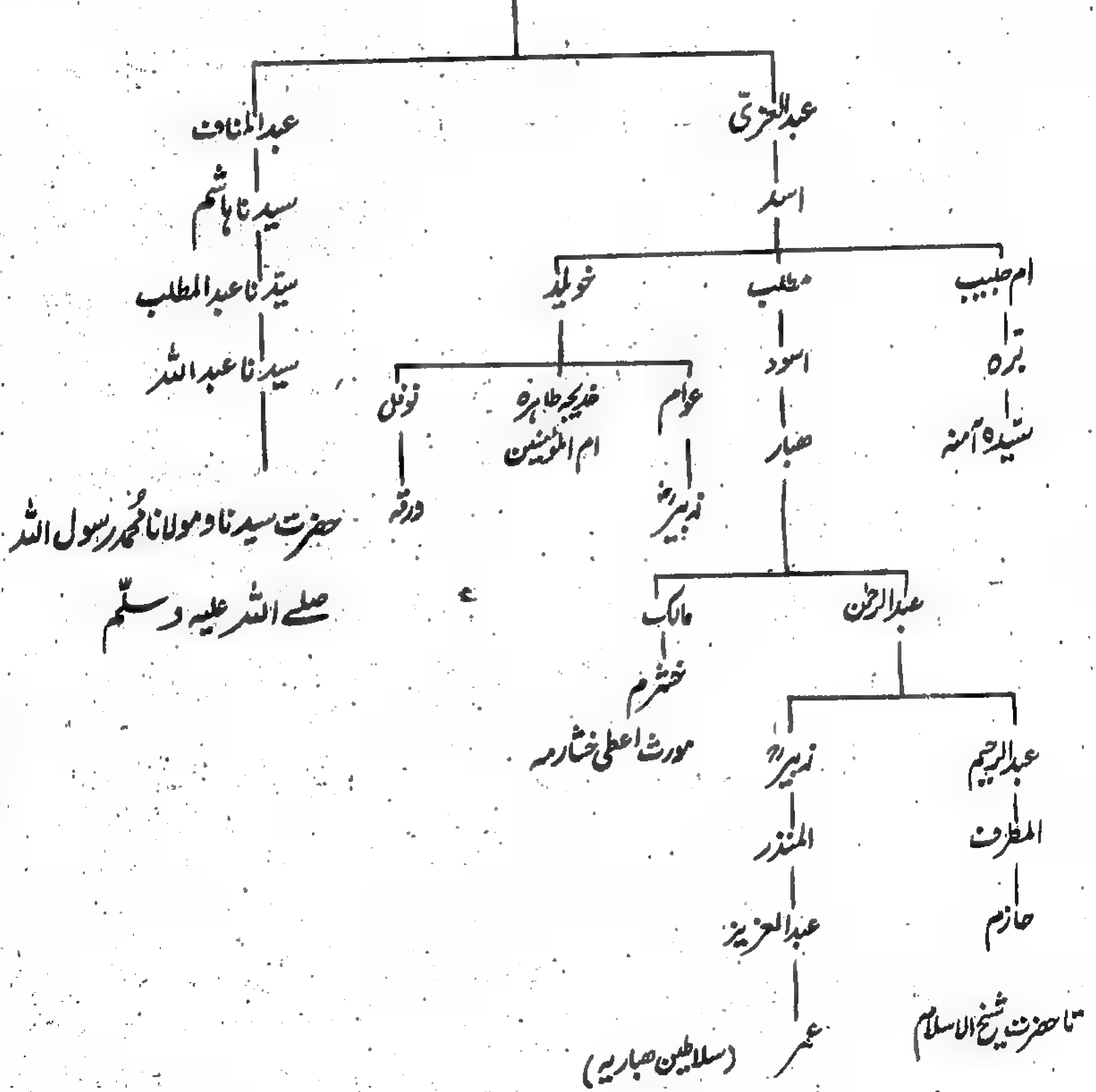
حضرت شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا۔ بہاء الحق بن شیخ محمد غوثؒ بن شیخ ابو بکرؒ بن شیخ

---

[1] خلاصۃ العارفین قلمی بخط مولانا ضیاء الدین ملتانی، محررہ ۹ ذی الحج ۱۳۰۳ھ، ص ۵

جلال الدین بن شیخ علی قانی بن شمس الدین محمد بن الحسین بن عبد اللہ بن الحسین بن المطرف بن خزیمہ بن حازم بن محمد بن المطرف بن عبد الرحیم بن عبد الرحمٰن بن عبد اللہ بن ھبار بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبد العزیٰ بن قصی۔[1]

حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ اور خاندانِ نبوت کا نسبی تعلق ذیل کے شجرہ سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔



---

[1] خلاصۃ العارفین، ص ۵

حضرت ھبارؓ بن اسود

ھبار بن اسود حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ آپ نے شروع میں رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت کی تھی، مگر فتح مکّہ کے بعد ایمان لے آئے اور اطاعتِ احکامِ دین میں بہت مستقل ثابت ہوئے۔[1]

حضرت ھبار رضی اللہ تعالےٰ عنہ مال دار انسان تھے۔ مکّہ مکرّمہ میں آپ کی تجارت کی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ شام اور مصر کو آپ کے کئی قافلے آیا جایا کرتے تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد بھی آپ مستقل طور پر مکّہ مکرّمہ میں مقیم رہے اور اپنی ساری زندگی جوارِ کعبہ میں بسر کر دی۔ خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ حضرت ہبار کے فرزندوں کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے "الجبال" کا علاقہ جاگیر میں مرحمت فرمایا تھا۔ جو بعد میں خوارزم کے نام سے موسوم ہوا۔

حضرت ہبارؓ کے دو صاحبزادوں کا تاریخ کی کتابوں میں ذکر آتا ہے۔ ایک حضرت عبدالرحمانؒ ہیں جو حضرت شیخ الاسلامؒ کے مورث تھے۔ دوسرے حضرت مالکؒ، جن کے فرزند ارجمند جناب خشرم کی اولاد "الخشارمہ" سے مشہور ہوئی۔

احمد بن یحییٰ بلاذری المتوفی ۲۷۹ھ لکھتا ہے :۔

"مجھ سے خشرم بن مالک بن ہبیرۃ الاسدی کی اولاد میں سے کسی نے بتایا کہ الخشارمہ کے ماسیذان میں آنے اور رہنے کی ابتداء بنو اُمیّہ کے آخر زمانے میں ہوئی، جبکہ اُن کا مورثِ اعلےٰ یہاں آیا تھا۔"[2]

اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اغلباً حضرت مالک اپنے والد کی زندگی میں ہی مکّہ مکرّمہ سے کوفہ میں منتقل ہو آئے ہوں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن زندگی بھر مکّہ مکرّمہ ہی میں رہے اور اُنھوں

---

[1] تاریخِ اسلام، از مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھی۔ ص ۳۲۱

[2] فتوح البلدان ص ۲۰۸

نے دو فرزند اپنی یادگار چھوڑے ۔ ایک عبدالرحیم اور دوسرے زبیرؒ۔

یہ دونوں بھائی عباسیوں کے طرف دار تھے ۔ بنو امیہ کی طرف سے اُن پر سختیاں ہوتی رہیں یہ سب کچھ برداشت کرتے رہے، لیکن مکہ مکرمہ کو نہ چھوڑا ۔ کچھ عرصے کے بعد یکے بعد دیگرے اُن کا انتقال ہو گیا ۔ عبدالرحیم کی مسند تاج الدین المطرف نے سنبھالی اور زبیر کا جانشین المنذر بنا ۔

اس زمانے میں حکم بن عوانہ سندھ کا گورنر بن کر جا رہا تھا ۔ اُس نے المنذر کو بھی ہمراہ چلنے کی ترغیب دی ۔ چونکہ ارضِ پاک کے حالات مساعد نہ رہے تھے ۔ اس لیے المنذر بھی مع اہل و عیال سندھ کو روانہ ہو آیا اور بیانہ کے مقام پر جو مقابلتہً زیادہ سرسبز اور المنصورہ کے قریب تھا ، آباد ہو گیا ۔

الجبال یعنی خوارزم کی سکونت

تاج الدین المطرف ابھی تک مکہ مکرمہ میں مقیم تھے ۔ جب مروان الآخر کو زمامِ خلافت تفویض ہوئی ، تو اُس نے امیر تاج الدین کو بیعت کے لیے مجبور کیا ۔ لیکن چونکہ یہ ابراہیم بن محمد عباسی سے بیعت کر چکے تھے ۔ اس لیے بلطائف الحیل ٹالتے رہے

انہی ایام میں ابراہیم شہید کر دیئے گئے اور اُن کی وصیت کے مطابق عبداللہ بن محمد عباسی جانشین ہوئے ۔ یہ بہت بہادر انسان تھے اور اپنے کنبہ کے چودہ افراد کے ساتھ کوفہ میں ولید بن سعد کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے ۔ اُنھوں نے اپنے داعیوں اور نقیبوں کو مُلک کے گوشے گوشے میں پھیلا رکھا تھا اور جگہ جگہ خفیہ طور پر رضا کار بھرتی کئے جا رہے تھے ۔ حکومت کو عباسیوں کی ان سرگرمیوں کا پورا علم تھا ، جس پر اُن کی حمایت کا تھوڑا سا شُبہ بھی گزرتا ، اُسے گرفتار کر لیا جاتا ۔ چنانچہ امیر تاج الدین المطرف کو بھی دارالخلافت میں طلب کیا گیا ۔ ان دنوں خراسان میں ابو مُسلم کا طوطی بول رہا تھا ۔ پایۂ تخت سے کافی دُور ہونے کے سبب حکومت بھی اُس کے خلاف کوئی شدید کارروائی نہ کر سکتی تھی ۔ اس لیے امیر تاج الدین المطرف نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ جب تک حالات سازگار نہیں ہو جاتے ، مکہ مکرمہ سے اپنی اراضیات "الجبال" میں

مُنتقل ہو جائیں۔ چنانچہ آپ مع اعزاء و اقارب الجبال یعنی خوارزم میں ہجرت کر آئے اور اس جگہ کی آب و ہوا کو خوشگوار پاکر اپنی سکونت کی مستقل طرح ڈال دی۔ صاحب منبع البرکات بحوالہ ملفوظ شیخ شمس الدین اس تفصیل کے اجمال کو یُوں بیان کرتے ہیں:

"امیر تاج الدین المطرف رئیس دیارِ عرب بود و در مکّہ مکرمہ سکونت مے داشت۔ چُوں نوبت خلافت بہ مروان الحمار رسید اوشاں با امیر تاج الدین تکلیف می نمود کہ بیعتِ ما قبول کنید۔ امیر ممدوح قبول نہ کرد، فرمود بہ مروانیاں مخالفت قلبی شد۔ ازیں سبب وطنِ مالوفہ را گذاشتہ مع لشکر در خوارزم رسیدند"

صاحب منبع البرکات نے آگے چل کر جو روایت برہان الدین سے منسُوب کی ہے وہ پھُسپھُسی سی ہے اور تاریخ کی کسوٹی پر پُوری نہیں اُترتی۔ اُن کا بیان ہے کہ خوارزم پر چار پُشتوں تک یہ خاندان حکومت کرنے کے بعد سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ کوٹ کروڑ آیا اور پھر یہاں شیخ الاسلام کی ولادت تک برسرِ اقتدار رہا۔

خوارزم کا علاقہ حضرت عثمانؓ کے زمانے سے اس خاندان کے زیرِ اقتدار چلا آرہا ہے۔ اگر تاج الدین المطرف کے بعد جناب محمدؒ۔ حازمؒ۔ خزیمہؒ۔ المطرفؒ۔ حسینؒ۔ عبداللہؒ اور حسینؒ تک سات پُشتوں نے فرمانروائی کی ہے تو اسے تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔ لیکن سُلطان حسین کا خوارزم کی حکومت ترک کر کے درویشی اختیار کرنا اور پھر سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ شریکِ جہاد ہو کر کوٹ کروڑ کی حکومت قبول کر لینا تضاد بیانی کا ایسا مرقع ہے جس سے منبع البرکات کی تمام روایات بے وزن ہو جاتی ہیں۔

سلطان حسین کے بعد اُن کے بیٹے سلطان شمس الدین دریائے سندھ کے کنارے کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں۔ شجرے میں سلطان حسین کے صاحب زادے کا نام سلطان علی قاضی درج ہے۔ اگر یہ حضرات کوٹ کروڑ اور اس کے مضافات کے خود مختار حکمران تھے، تو پھر قاضی کیوں کہلاتے؟ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "سلطان" کے لقب سے صاحب منبع البرکات کو دھوکہ لگا ہے۔ تو کیا حضرت سلطان باہو، سلطان احمد قتال، روڈو سلطان اور پیر جیون سلطان کیا یہ سب بادشاہ تھے؟

حقیقت میں دین و دُنیا کے بادشاہ یہی اللہ والے لوگ ہیں۔ جیسا کہ عصامی کہتا ہے :

بہر ملک اگرچہ امیرے بود
ولے در پناہے فقیرے بود

یہ اولیائے کاملین اپنے اپنے شہروں کے باطنی حاکم ہوتے ہیں۔ لیکن ظاہری حکومت سے اہل اللہ نے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ البتہ قضا کے منصب پر بے شمار اولیاء اللہ کا فائز ہونا ثابت ہے۔ جو لوگ تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں اُنہیں علم ہے کہ اسلامی دَور میں قضاء کا عہدہ نہایت ممتاز تصور کیا جاتا تھا۔ قاضی القضاۃ کی حیثیت چیف جسٹس کی ہوتی تھی اور اسے دیوانی و فوجداری کے تمام اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ چنانچہ شیخ الکبیر حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے آباء واجداد کئی پشتوں تک قاضی رہے تھے۔

اسی طرح حضرت شیخ الاسلام کا خاندان بھی چونکہ علم و فضل میں یکتائے روزگار تھا، اس لیے کئی پشتوں تک ان کے خاندان میں بھی کوٹ کروڑ کی قضاء متوارثاً چلی آئی تھی۔ منبع البرکات کے سوا باقی جس قدر سیر کی کتابیں ملتی ہیں، ان کا ملخص یہ ہے کہ شیخ الاسلامؒ بہاء الدین زکریا کے بزرگوں میں سے جو حضرت ملتان میں پہلے تشریف لائے تھے، وہ کمال الدین علی شاہ تھے۔ چنانچہ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں :-

"جدِ بزرگوار وے کمال الدین علی شاہ قریشی از مکہ معظمہ بخوارزم آمد و از اینجا بملتان رونق افزا شد[1]"

ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ مجھے خود حضرت شاہ رکن عالم قدس سرہٗ نے بتایا تھا کہ اُن کے بزرگ سندھ سے ملتان آئے تھے اور جب تاریخ سندھ میں ہباریوں کی آمد اور المنصورہ پر دو، تین پشتوں تک حکومت کرنے کا ثبوت ملتا ہے تو اس سے حضرت شاہ رکن عالمؒ کی سندھی ولدیت[2]

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم ص ۱۹ ۔

[2] مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی کی تحقیق بھی یہی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" ص ۲۵۵ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا قبیلہ دوسری صدی ہجری میں سندھ (باقی صفحہ ۳۱ پر)

کا دعوےٰ خاصا وزنی ہو جاتا ہے۔

سِندھ میں ہباریوں کا عروج و زوال

ابنِ خلدون نے سندھ میں ہباری حکومت کے قیام کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ ہبار کی اولاد میں سے عمر بن عبدالعزیز نے حاکمِ سندھ کے قتل ہونے پر سنہ ۲۴۰ھ میں المنصورہ پر قبضہ کر لیا۔ تقریباً دو سو برس تک یہ خاندان بر سرِ اقتدار رہا۔ سنہ ۴۰۱ھ میں جب سلطان محمود غزنوی نے داؤد بن نصر قرمطی کو شکستِ فاش دے کر قلعہ غور میں نظر بند کیا تو بقیۃ السیف قرمطی یہاں سے بھاگ کر المنصورہ پہنچے اور اچانک اس پر قابض ہو گئے۔ ہباری خاندان اس وقت بہت کمزور ہو چکا تھا۔ قرامطیوں سے شکست کھا کر اس کے افراد تتر بتر ہو گئے۔

قولِ فیصل

اس طویل بحث کا ماحصل یہ ہے کہ صاحب مطلع البرکات کا یہ دعوےٰ تو صحیح ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے آباء کرام پہلے خوارزم اور ازاں بعد کروڑ تشریف لائے اور سلطان محمود غزنوی کے ہمراہ آنا بھی صحیح۔ مگر براہِ غزنی جہاد کرتے ہوئے کروڑ آنا اور سلطان کا انہیں تمام مفتوحہ علاقے کا حاکم مقرر کرنا صحیح نہیں۔ جیسے داستان امیر حمزہ۔ گُل بکاؤلی۔ فسانۂ عجائب۔ قصۂ چہار درویش اور سیف الملوک میں ہمارے داستان گو حضرات نے جولانی طبع سے رائی کا پہاڑ بنا دیا ہے، یہاں بھی وہی کیفیت نظر آتی ہے۔

ابن بطوطہ، فرشتہ، جمالی اور مفتی غلام سرور لاہوری کے بیانات کی روشنی میں صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے بزرگوں میں سے تاج الدین المطرف خوارزم آئے اور جب سندھ پر ہباریوں کو اقتدار حاصل ہوا تو تاج الدین المطرف کی اولاد بھی المنصورہ منتقل ہو آئی اور جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰ سے) آ کر آباد ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد سکھر کے علاقے میں محمد تور نامی قصبہ میں جا بسا اور پھر پانچویں صدی کی ابتداء میں وہاں سے منتقل ہو کر ملتان چلا آیا۔ (تاریخ سندھ ص ۳۵۸)

ہمباریوں پر قرامطیوں نے غلبہ حاصل کیا تو سلطان محمود غزنوی نے برق و باد کی طرح سندھ پہنچ کر قرامطیوں کو تباہ و برباد کیا اور شیخ الاسلامؒ کے جدِ بزرگوار کمال الدین علی شاہ کو اپنے ہمراہ ملتان لے آئے۔ کچھ عرصہ اُنہوں نے یہاں قیام کیا اور پھر سلطان کے حکم سے کوٹ کروڑ میں قضاء کے منصب پر فائز ہوئے۔

کمال الدین علی عرف سلطان علی قاضی کے بعد شیخ جلال الدین اور پھر اُن کے صاحبزادے شیخ ابوبکر قضا کے منصب پر فائز ہوئے اور طبعی عمر ختم کرنے کے بعد اسی شہر میں سپردِ خاک ہوئے۔ ان میں سے صرف ایک بزرگ کہنہ ملتان میں دفن ہوئے، جن کا مزارِ پُرانوار مائی پاکدامنؒ کی خانقاہ میں بتایا جاتا ہے۔

مولانا وجیہ الدین محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا وجیہ الدین محمد غوث علیہ الرحمۃ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کے والد ماجد اور شیخ ابوبکر علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے تھے۔ آپ نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنے والدِ بزرگوار کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور فقر و ولایت کے مدارجِ علیا پر فائز ہوئے۔

حضرت مخدوم سیّد جلال بخاری قدس سرہٗ نے مولانا وجیہ الدین محمد غوث علیہ الرحمتہ کا شجرۂ بیعت اس طرح سے درج فرمایا ہے:

"شیخ وجیہ الدین محمد او صحبت داشت با ابوبکر و او صحبت داشت با علی و او صحبت داشت با محمدؒ و او صحبت داشت با حسین و او صحبت داشت با شیخ شبلی و او صحبت داشت با حسن بصری و او صحبت داشت با علی المرتضٰی کرم اللہ وجہہ و او صحبت داشت با حضرت رسالت پناہ صلے اللہ علیہ وسلم و ایں سجادہ پیوستہ ہر دو جانبین خاندان شیخنا سلاسل شیخی داشت"

منبع البرکات میں حضرت مولانا وجیہ الدین کی سیر و سیاحت کا حال تفصیل سے درج ہے۔ لیکن دوسرے تمام تذکرے خاموش ہیں۔ نیز حضرت کی شادی کے بارے میں بھی جو روایت

مجمع البرکات میں درج ہے اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ بلکہ تمام مورخین نے شد و مد کے ساتھ اس کی تردید کی ہے۔

خلاصۃ العارفین جو اصل میں تین ملفوظات کا مجموعہ ہے، اس کے مؤلف کا علم نہیں کہ کون ہے اس میں اکثر روایتیں وغیرہ ملاوٹی نوعیت کی ہیں، جن میں سے ایک مولانا وجیہہ الدین محمد غوث کا سیدہ فاطمہ بنت شیخ عیسیٰ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے شادی کا مفروضہ بھی ہے، اس پر تفصیل سے بحث کی ضرورت ہے۔

کیا شیخ عیسیٰ گیلانیؒ صاحب اولاد تھے؟

شیخ عیسیٰؒ حضرت غوث الثقلین سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے ہیں۔ تمام مورخین ان کی تجرید کے قائل ہیں۔ جب انہوں نے شادی ہی نہیں کی تو اولاد کہاں سے آئی؟ چنانچہ حضرت احمد معین سیاہ پوش علویؒ زبدۃ الموالیہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

"امام موسےٰ، یحییٰ، محمد و عیسےٰ نیست ایشاں را اولاد و احفاد۔ ہر کہ خود را از اولاد و احفاد ایں چہار تن گوید۔ کاذب است۔ زیرا کہ عبدالجبار، عیسےٰ، محمد، یحییٰ و موسےٰ غیر از تزویج وفات کردند و از ایشاں نسل واقع نشد"

علامہ سید سعد اللہ نے بھی اس دعویٰ کی تائید کی ہے، لکھتے ہیں:

"وفات کرد شیخ عیسیٰ در مصر ۵۷۳ھ قبل از تزویج و بے را اولاد و احفاد نیست۔ من یقول انا من اولادہم و احفادہم فھو کذاب عند اللہ و عند رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم"

ایک اور جگہ پر لکھتے ہیں:

"واتفق اھل الروایات من السلف والخلف والمتاخرین وھکذا ورد فی جمیع الکتب ان مات الشیخ عیسیٰ بلا تزویج"

بحر السرائر از علامہ سید سعد اللہ لاہوری، ص ۲

معدن الانساب، خلاصۃ الناظر، کنز الاسرار، نزہۃ الخواطر، بہجۃ الاسرار کا بھی یہی دعوےٰ ہے۔

شیخ الاسلام کی والدۂ ماجدہ مولانا حسام الدین ترمذیؒ کی صاحبزادی تھیں

خزینۃ الاصفیاء، مرأۃ الاسرار، صدیقۃ الاسرار، تاریخ فرشتہ اور سیر العارفین کا بیان ہے کہ حضرت شیخ الاسلام بہاؤالدین قدس سرہٗ کی والدۂ ماجدہ بی بی فاطمہؒ، مولانا حسام الدین ترمذی کی صاحب زادی تھیں۔ جو غزنوی کافروں کے حملے کے وقت اپنے وطن سے کوٹ کروڑ تشریف لے آئے تھے۔ اسی طرح جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریاؒ اور حضرت شیخ الکبیر فریدالدین مسعود گنج شکر خالہ زاد بھائی تھے، اس میں بھی کوئی صداقت نہیں۔ خزینۃ الاصفیاء میں مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

"شیخ وجیہ الدین محمدؐ غوث کہ بکمالات ظاہری و باطنی آراستہ بود، بدختر مولانا حسام الدین ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہ در قلعہ کوٹ کروڑ سکونت داشت کد خدا شد۔"

اسی طرح حضرت شیخ الکبیر خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد کی شادی کا ذکر اس طرح سے درج ہے:

"حضرت جمال الدین سلیمان (والد ماجد حضرت گنج شکرؒ) با دختر ملا وجیہ الدین خجندی کہ قرسم خاتون نام ورشت متاہل شد و از بطن عفت وے سہ سیر والا گوہر بوجود آمدند۔ یکے اعزالدین محمود، دوم فریدالدین مسعود و سیوم نجیب الدین متوکل رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔"

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ ان بیبیوں کا آپس میں کوئی رشتہ نہ تھا اور نہ ہی حضرت شیخ الاسلام زکریاؒ اور حضرت گنج شکرؒ آپس میں خالہ زاد بھائی تھے۔

شیخ الاسلامؒ کے آباءِ کرام اور کوٹ کروڑ کی حکومت

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، صاحب منبع البرکات اور دوسرے غیر مصدقہ راویان کا یہ دعوےٰ کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے آباء کرام کو کوٹ کروڑ پر حاکمانہ اقتدار حاصل تھا، صحیح نہیں۔ سلطان التمش کے زمانے میں ”آداب الحرب والشجاعہ“ کے نام سے ایک کتاب مدوّن کی گئی تھی۔ مصنّف کتاب نے لکھا ہے کہ سلطان ابراہیم غزنوی کی طرف سے میرے پردادا کو اُچ، ملتان، کہروڑ اور بنوں تا غزنی کا انتظام سپرد تھا۔ اس کی تخت نشینی کا سنہ ۴۵۱ھ ہے اور حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ کا سنِ ولادت بالاتفاق ۵۶۶ھ ہے یعنی آپ کی ولادت سے ۱۱۱ سال قبل تک آپ کے بزرگوں میں سے کوئی کوٹ کروڑ کا مطلق العنان فرمانروا نہیں تھا اور اس سے پہلے کا بھی اس لیے امکان نہیں ہے کہ سلطان ابراہیم کا شمار خدا ترس اور فقیر دوست سلاطین میں ہوتا ہے۔ مولانا ذکاء اللہ لکھتے ہیں :

> ”یہ بادشاہ بڑا عابد، متقی اور زاہد تھا۔ باوجود عنفوان شباب کے کل ممنوعات شرعی سے دست کش تھا۔ لذّاتِ نفسانی کو ترک کر کے رجب و شعبان کو رمضان کے ساتھ ملا کر سال بھر میں تین مہینے کے روزے رکھتا تھا اور رعیت پروری میں کوشاں رہتا تھا۔“

ایسے عادل باذل اور خدا دوست فرمانروا سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ بلاوجہ کسی صوبہ دار کو معزول کر دے۔ اگر شیخ الاسلامؒ کے خاندان کے پاس کوٹ کروڑ کی حکومت ہوتی، تو وہ لازماً انہیں اپنے منصب پر بحال رکھتا۔

صحیح یہ ہے کہ مولانا وجیہ الدین محمد غوث بھی اپنے آباء کرام کی طرح کوٹ کروڑ کے قاضی تھے۔ جب ان کا وقتِ آخر قریب آیا تو انھوں نے قضا کا منصب اپنے بھائی شیخ احمد غوثؒ کے سپرد کر دیا تھا۔

شیخ حسن دیپال پوری کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت گنج شکر علیہ الرحمۃ کے والد بزرگوار حضرت جمال الدین سلیمانؒ کے مرید تھے۔ حضرت سلطان علی قاضی نے خواب میں آپ کو ان سے رجوع

کرنے کا اشارہ کیا تھا۔[1]

حضرت جمال الدین سلیمان قصبہ کوٹھوال کے قاضی تھے۔ یہ مقام ملتان سے بارہ میل جانب شرق بدھلہ سنت روڈ پر واقع ہے۔ شیخ احمد غوث ایک ہفتہ کی مسافت کے بعد اس قصبہ میں داخل ہوئے اور شیخ سے اپنا نصیبہ وصول کیا۔ شیخ شرف الدین لاہوری لکھتے ہیں کہ اس کے بعد شیخ احمد غوث رح نے بقیہ عمر درویشی میں بسر کی۔[2] اسی زمانے میں قرامطہ نے پھر سر اُٹھایا۔

قرامطہ

یہ لوگ عبداللہ میمون ایرانی کے پیروکار تھے۔ جس نے ادیانِ عالم کو مٹانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس کے مذہب کا خلاصہ یہ تھا کہ سارے مذاہب بے ہودہ ہیں۔ دُنیا اور عقبیٰ میں نیک اعمال کی جزا ہے نہ بد اعمال کی سزا۔ احمد قرمط اسی عبداللہ کا مرید تھا۔ اس نے وحشی اقوام کو جو عقل سے عاری اور مذہب سے بیگانی تھیں، اپنے دین کی طرف بُلایا اور اعلان کیا:

۱۔ نماز کی صرف چار رکعتیں ہیں۔ طلوعِ شمس اور غروبِ شمس سے پہلے دو دو رکعات ادا کی جائیں۔

۲۔ بجائے بیت اللہ کے بیت المقدس کو منہ کر کے نماز ادا کی جائے۔

۳۔ سال بھر میں روزے صرف دو ہیں، مہرجان اور نیروز کے دن۔

۴۔ شراب حرام، خمر حلال ہے۔

۵۔ جنابت سے غسل کرنا ضروری نہیں۔

۶۔ جس جانور کے کچلی اور دانت ہوں، ان کا کھانا درست ہے۔

---

[1] آپ نے خواب میں فرمایا: اے فرزند! در مخاطرہ دنیا اوقاتِ عمر چرا صرف نے نمائی بغیر علم لدنی ہمہ بے جاست ونصیبِ شما از خدمت جمال الدین سلیمان از حضرت حدیث مقرر است و در قصبہ کوٹھوال سکونت دارند بر خدمت ایشاں عرضانی دار۔ ہر چہ نصیب است بتو خواہد رسید (مکاتیب شیخ حسن دیپالپوری قلمی ص ۳۵)

[2] شیخ احمد غوث بقیہ عمر در فقیری گذرانید (منبع البرکات حقانی قلمی، ص ۲۷)

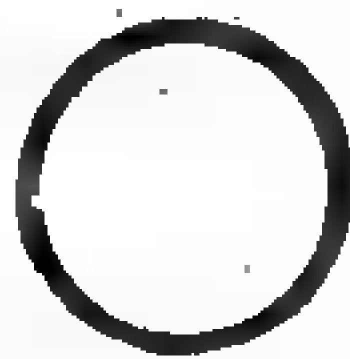
۷۔ جمعہ کی جگہ اتوار یوم السبت ہے۔

اس فرقہ نے ۲۹۰ھ میں شام پر ہولناک حملہ کیا۔ ۳۱۱ھ میں بصرہ اور کوفہ لوٹا اور ابوطاہر کو اپنا پیشوا بنا کر ۳۱۹ھ میں مکّہ مکرّمہ پر قبضہ کر لیا۔ بے شمار مسلمان قتل ہوئے۔ حجرِ اسود اکھاڑ لے گئے اور بیس برس تک اُسے اپنے قبضے میں رکھا۔

ابوریحان بیرونی کے بیان کے بموجب قرامطہ گھٹا کی طرح وادیٔ سندھ پر چھاگئے تھے اور اُنہوں نے ہی مُلتان پہنچ کر بڑے بُت (سُورج مندر) کو توڑا تھا۔

مولانا ذکاء اللہ اس فرقہ کے ناشائستہ اعمال کا ذکر کرنے کے بعد چل کر لکھتے ہیں :

" محمود غزنوی نے اُس فرقے کا مُلتان سے مُنہ کالا کیا، مگر وہ یہاں سے بالکل خارج نہیں ہُوئے تھے۔ دیہات میں ان کا ہمہ گیر اثر موجود تھا۔ جگہ جگہ اُن کے نقیب اور داعی مقرّر تھے، جو لوگوں میں کفر اور الحاد کا پرچار کرتے پھرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلاطینِ غزنوی کمزور ہو چکے تھے اور کوٹ کروڑ کی ریاست بھی اتنی مضبوط نہ تھی کہ وہ اس سیلاب کا مقابلہ کر سکتی۔ مسلمان بالکل اقلیت میں تھے، ان ملحدوں نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ وہ بے چارے خانہ بدوشی کی حالت میں مارے مارے پھرتے تھے، لیکن اُنہیں کہیں امان نہ ملتی تھی۔"




صُبحِ سَعادتؒ

قُدرت کا ازل سے یہ اصُول چلا آیا ہے کہ جب کوئی چیز منتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اُسی وقت سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ کئی بار ہمارے مشاہدے میں آیا ہے کہ جب گرمی شدّت اختیار کر لیتی ہے اور حبس سے خلقِ خُدا کا دم گھٹنے لگتا ہے تو اس وقت رحمتِ کاملہ ایک ٹکڑہ ابر کی صُورت میں نمودار ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسی بارش ہوتی ہے کہ ہر طرف پانی ہی پانی دکھائی دینے لگتا ہے۔ نیز اسی طرح خزاں کے موسم میں جب درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور چمن کی حسُن و خوُبی برباد ہو جاتی ہے تو بادِ بہاری نوجوانانِ چمن کے لیے "حیاتِ نو" کا پیغام لے کر آتی ہے۔ ناطورۂ عالم کے کونے کونے میں زندگی کی ایک نئی رُوح دوڑ جاتی ہے۔ سبزہ "سطحِ ارضی" پر ازسرِنو مخملی فرش بچھا دیتا ہے، کملائے ہوُئے پودے پھر ہرا بھرا لباس پہن لیتے ہیں اور ڈالی ڈالی پر کلیاں رقص کرنے لگتی ہیں۔

ٹھیک اسی طرح جب شمال مغربی ہند کا گوشہ گوشہ کفر و الحاد کی گھٹاؤں سے تیرہ و تار ہو گیا۔ تو قدرت نے مولانا وجیہ الدین محمد غوثؒ کے مشکوئے معلّٰی سے ایک ایسے "گلِ سرسبد" کو پیدا کیا جس سے ربعِ مسکون کا چپّہ چپّہ معطر ہو گیا۔ اس مردِ کامل نے نصف صدی کے عرصے میں اس سرزمین کو نہ صرف قرامطہ کے اثرات سے پاک کیا، بلکہ لاکھوں سرکش اور تند مزاج کافروں کو نورِ ایمان سے مالا مال کر کے مسلمانوں کی "اقلیت" کو[1] "اکثریت" میں بدل دیا اور وہ لاکھوں خوُن آشام تلواریں جو سالہا سال تک غزنی کے مجاہدوں سے ٹکراتی رہی تھیں، اسلام کی محافظ بن گئیں۔

---

[1] یعنی جس اکثریت کی بنا پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے۔ یہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی شرمندۂ احسان ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں[ل]
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

سید جلال بخاری نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت کی ولادت کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:
"مولد شیخنا و مخدومنا شیخ بہاؤ الحق والشرع والدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ السابع والعشرین من شہر رمضان المبارک فی لیلۃ القدر وقت الصبح لیلۃ الجمعہ فی التاریخ الہجریۃ المصطفویہ المکتہ المدینہ ست وستین وخمس مائیتہ در خطہ کوٹ کروڑ ولایت دیپال است۔"

یعنی میرے پیر طریقت حضرت بہاء الحق والدین ابو محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ ۲۷ رمضان المبارک ۵۶۶ھ کو پیدا ہوئے تھے۔ لیلۃ القدر، شب جمعہ، ماہِ صیام اور طلوعِ سحر کا وقت۔
سُبحان اللہ! مولود مسعود کے وقت تمام برکتیں جمع ہو گئیں۔ ایک مؤرخ نے حضرت کی ولادت باسعادت کی یہ تاریخ لکھی ہے:

بتاریخ تولد غوثِ عالم
دُر از بحر قدم آمد بعالم
۵۶۶ھ

حضرت مادر زاد ولی تھے۔ چونکہ رمضان کے ایام تھے۔ اس لیے جب تک شوال کا چاند نظر نہ آیا۔ حضرت نے دُودھ نہ پیا۔
"وبعد از و نہ مکید شیر از پستانِ مادر تا روز عید شد۔"
(مخدوم بخاریؒ)

مصنفِ علام نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب حضرت محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ قرآن مجید پڑھنے بیٹھتے تو یہ نومولود دودھ پینا چھوڑ دیتا اور اس طرح سے حضرت کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ گویا قرآن سُن رہا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر ماں باپ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ ایک ارادت مند نے

[ل] وہ دل جسے خوبرو جوان اپنی طرف مائل نہ کر سکے تھے، ایک دیرینہ سال پیر مرد نے اسے ایک نظر میں لوٹ لیا۔

اس صُورتِ حال کو یوں موزوں کیا ہے ؎

جب کہ قرآن پڑھتے تھے والد تیرے
کان تھے تیرے بھی بس اُس پر لگے

ذوق تھا تجھ کو بہت قرآن کا
شوق تھا تجھ کو بہت رحمان کا

ولادت مخدُوم رشید حقّانیؒ

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت کو تین سال گزُرے تھے کہ اسی خانوادہ کے مطلع پر شریعت و طریقت کے ایک اور آفتاب نے طلوع کیا۔ یعنی شیخ احمد غوثؒ کے مشکوئے معلّیٰ میں حضرت مخدوم عبدالرشید تولّد ہوئے۔ ان کے بعد رب تعالےٰ نے آپ کو مزید پانچ فرزند ارجمند عطا کئے۔ جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :۔

شیخ عبدالرحمانؒ ، شیخ طاہرؒ ، شیخ سادھنؒ ، شیخ موسیٰؒ (نواب) شیخ راول دریاؒ اور ایک صاحب زادی رشید خاتونؒ ۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی تعلیم و تربیّت

ابھی حضرت بہت چھوٹے ہی تھے کہ شیخ محمد غوثؒ نے آپ کو مولانا نصیر الدین بلخیؒ کے پاس پڑھنے بٹھایا۔ آپ کی طبع رسا اور ذہانتِ خداداد کا یہ عالم تھا کہ سات سال کی عمر میں قرآن شریف ہفت قرأت کے ساتھ حفظ کیا۔ اس کے بعد درسی کُتب کی طرف متوجّہ ہوئے اور ابھی صرف و نحو کی بحث ہی میں تھے کہ " انشراح صدر " ہوگیا۔ ۱۱۱۱ھ میں شیخ محمد غوثؒ نے سفرِ آخرت[1] اختیار کیا۔ عمِّ بزرگوار شیخ احمد غوثؒ نے دستار سر پر بندھوا آپ کو آباء و اجداد کی

[1] حضرت شیخ الاسلامؒ کے والد ماجد حضرت مولانا وجیہ الدین محمد غوثؒ اور جدِّ بزرگوار حضرت مولانا کمال الدین ابوبکر کے
(باقی صفحہ ۴۲ پر)

مسند پر لا بٹھایا۔ علماء، مشائخ اور زمینداران نے حاضر ہو کر مراسم تعزیت ادا کیں۔ خدم حشم نوکر چاکر سلام کو حاضر ہوئے۔ خزانہ کے محافظ نے موجودات کا جائزہ لینے کی درخواست کی۔ آپ نے آبدیدہ ہو کر چچا جان سے عرض کی :

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱ سے) مزارات ملتان میں بیان کئے جاتے ہیں۔ مفتی غلام سرور صاحب خزینۃ الاصفیاء میں لکھتے ہیں :

"مزارات پدر و جدّ بزرگوار شیخ الاسلام ھم در ملتان در مزارات پیراں تری واقع اند و نیز بہمال مقام ولاآلم مزار پُرانوار بی بی راستی والدہ ماجدہ شیخ رکن الدین ابوالفتح واقع است از مقام سینہ مزار جدّ بزرگوار شیخ الاسلام درختے پیدا شدہ بود کہ بر ہر برگ آں درخت اسم مبارک اللہ از غیب نوشتہ بود۔ تامدت مدید خلق خدا ازاں درخت فائدہ بے انتہا بر داشت۔ بہر بیمارے و مجنونے کہ برگ ہائے آں درخت مے خوارنیدند شفا مے یافت۔ آخر روزے شخصے بحالت جنابت بآں درخت رسید و برگ درخت جُدا کرد و بخورد۔ ازاں روز درخت خشک شد و باز برگ نیاورد۔" (خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۲۵)

مولانا جمالی رحمۃ اللہ علیہ کا مشاہدہ یہ بزرگ شیخ سماء الحق سہروردی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حج پر جا رہے تھے، دادا پیر کے مزار پُر انوار پر حاضری دینے کے لیے ملتان رُک گئے۔ ان دنوں شیخ صدرالدین شہر اللہ رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین تھے۔ وہ جب دہلی تشریف لے گئے تھے تو مولانا جمالی سے بڑا ربط رہا اور میل جول رہا۔ اس لیے جب یہ حاضر ہوئے تو حضرت بہت خوش ہوئے اور اسی حجرۂ خاص میں کہ جہاں حضرت شیخ الاسلامؒ مصروف عبادت رہا کرتے تھے، انہیں رہنے کی اجازت دی اور یہیں کھانا منگوا کر یکجا تناول کرتے تھے۔ مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ میں نے اس حجرۂ پاک میں چلہ پورا کیا اور زیارت شیخ الاسلامؒ سے مستفیض ہوا۔ اس کے بعد روضۂ مبارکہ حضرت رکن العالم پر اقامت اختیار کی۔ حضرت سجادہ نشین از راہِ درویش نوازی یہاں بھی تشریف لاتے تھے۔ اس جگہ ایک باخدا درویش سے تعارف ہوا۔ یہ عوام میں کمال الدین اُچی کے نام سے مشہور تھے۔ بڑی عمر کے تھے اور اسی خاندان سے نسبت رکھتے تھے۔ انہوں نے فرمایا :

"مزار جدّ بزرگوار حضرت سلطان المشائخ بہاء الملۃ والدین زکریا قدس سرہٗ در مزارات پیران تری است کہ در ملتان واقع است و خطیرہ بی بی راستی ہمدراں مزار است، در انجا گورے است کہ بر سینہ آں درخت برگد واقع است و بر شاخ او لفظ "اللہ" بر آمدہ است۔ چنانچہ ایں حقیر از پیر دستگیر استماع داشت کہ در مزارات پیران تری بر سر مزارے درخت برگد است کہ بر تنا و شاخہائے او لفظ

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

"آپ بمنزلہ والد کے ہیں، یہ تمام کارخانہ آپ سنبھالیں، میرے پڑھنے کے دن ہیں مجھے اطمینان سے تحصیلِ علم کا موقعہ عنایت فرمائیں۔"

حضرت احمد غوثؒ کی تو خواہش ہی یہی تھی۔ انہوں نے بڑے بڑے متورع اور منتہی علماء کوٹ کروڑ میں جمع کر دیئے۔ جن سے آپ اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ کچھ عرصہ آپ نے ملتان میں گزارا اور یہاں کے علماء اور مشائخ کے آگے زانوئے ادب تہ کیا۔ مرورِ زمانہ نے ان حضرات کا کوئی نشان باقی نہ رکھا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ خوش نصیب اساتذہ کون تھے؟ اور کہاں جا کر پیوندِ خاک بنے؟

محلہ کٹڑہ (ملتان) کے اندر ایک مسجد کے جنوبی حجرہ میں مولانا عبدالرشید کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ زیارت گہ خلائق ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار حضرت شیخ الاسلامؒ کے استاد تھے۔

طلب علم میں بخارا کا سفر

بہر حال جب یہاں کے علماء سے استفادہ کر لیا تو پھر خراسان کا رُخ کیا۔ کیونکہ ان دنوں وہاں کی درس گاہوں کا بڑا چرچا تھا۔ ایک قافلے کے ہمراہ وہاں پہنچے اور سات برس تک علماء اور مشائخ سے علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کرتے رہے۔ یہاں سے بخارا آئے اور کئی سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔

آپ کے اکتسابِ علم کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اُن کے سینہ میں جس قدر علم ہوتا، دو تین دن میں اُس کا مکاشفہ کر لیتے۔ پھر دُوسرے استاد کے ہاں پہنچتے اور جس قدر علم ان کی وسعتِ امکان میں ہوتا، اُس کا کشف کر لیتے۔ اسی طرح ایسے چار سو چوالیس (۴۴۴) باکمال اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کر کے سندِ فضیلت حاصل کی۔ جو علم و فضل اور زہد و ورع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲ سے) "اللہ" برآمدہ است۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"چون این حقیر در ملتان رسید۔ از مردمان حالات آں درخت بر پرسید، و معائنہ نمود۔ فی الواقع ہمچناں بود۔ حضرت مولانا کمال الدین اُچی گفتے کہ آں مزار جد بزرگوار حضرت شیخ الاسلام بہاء الملۃ والدین است کہ در سینہ او این درخت برآمدہ است۔ (سیر العارفین قلمی از مولانا جمالی، ص ۲۱)"

کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے ۔

صاحب خلاصۃ العارفین لکھتے ہیں :

"علم ظاہر بخدمت چندیں اساتذہ باین طریق خواندہ اند کہ یک اُستاذ را ہر قدرے علم کہ در سینۂ او بودے یک یا دو سہ روز بتائیدِ الٰہی مکاشفہ کردے باز پیش دیگرے خواندے و ہر قدرے علم کہ در وسع امکان او بودے ۔ در دو سہ روز درس مے کردے ۔ و ہمہ علم را کشف مے نمودے ۔ تاہم چنیں بخدمت چہار صد و چہار و چہل اساتذہ زانوئے تلمذ تہ کردہ سندِ فضیلت حاصل کردند"

تحصیل علم کے دوران میں آپ کے پاس دو ہزار سے زیادہ علمی کُتب جمع ہو گئی تھیں ۔ اس زمانہ میں جبکہ طباعت کا یہ انتظام نہیں تھا ، دو ہزار کُتب کو ایک بہت بڑا علمی خزانہ کہا جا سکتا ہے ۔ مؤلف "تذکرہ اولیائے کرام" کا بیان ہے کہ حضرت نے بخارا میں آٹھ برس قیام فرمایا اور یہاں کے لوگ آپ کے خصائل حمیدہ اور اوصافِ پسندیدہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ آپ کو "بہاؤ الدین فرشتہ" کہنے لگے ۔ صاحب خزینۃ الاسرار کے الفاظ یہ ہیں :-

"در خراسان و بخارا شہرے عظیم یافتند کہ اہل آں بخارا ایشاں را بہاء الدین فرشتہ می گفتند"

عبادت و ریاضت

حضرت شیخ الاسلامؒ خراسان اور بخارا کی تمام درس گاہوں سے استفادہ کرنے کے بعد تزکیۂ نفس میں معروف ہوئے اور بیس سال تک لگاتار اس قدر سخت مجاہدہ کیا کہ اس کی تفصیلات پڑھنے سے حیرت ہوتی ہے ۔ صاحب خلاصۃ العارفین لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ کسی نے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کی کہ اپنے مجاہدہ کا کوئی واقعہ بیان فرمائیے ۔ آپ نے فرمایا : اپنے مجاہدہ اور ریاضت کی کیفیت بیان کرنا مناسب نہیں کہ اس سے غرور کا اظہار ہوتا ہے اور طالب کو خوف ہوتا ہے کہ کہیں اس کی محنت برباد نہ ہو جائے ۔ مگر پھر بھی آپ کی خاطر اتنا ظاہر کرنے میں تامل نہیں کرتا کہ یہ فقیر بیس سال تک ایک چھٹانک پانی اور ایک چھٹانک طعام پر

روزہ افطار کرتا رہا ہے اور یہ ایک ایسا ادنیٰ مجاہدہ[1] ہے کہ جسے ہر مبتدی طبیعت پر غلبہ پانے کے لیے بآسانی کھلا سکتا ہے۔ اس کے بعد حج کی نیت سے ارضِ پاک کو روانہ ہوا۔

حال ہی میں خلاصۃ العارفین کا ایک نسخہ تصحیح کردہ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی صاحب سامنے آیا، جس میں مجاہدہ کی عبارت حسبِ ذیل ہے :۔

"بعد ازاں دہ سال مجاہدۂ مردانہ کشیدم کہ ہر شبی یک یا دو گاؤ فربہ بجز پوست و استخوان و خون سرگین و یک خروار میدہ و یک من روغن درون کردہ و خوردم و دہ سال حاجت انسانی تقاضا نبردم۔ ہر چہ خوردم ہمہ در تنور کردم، ہمہ سوختہ شد چنانکہ در تنور ہیزم سوختہ خاکستر شود و ہیچ اثر نماند ہمچنان بودم ہر کہ با آتش محبت سوختہ باشد پیدا نگردد اورا، مگر استعانت عبادت، اول مجاہدۂ خوردنی نور است و آں نور از صنور است کہ نہ از پیش و نہ از پس تقاضا افتد۔ وضو احتیاطی می کردم، لازم حاجت انسانی نداشتم۔ و ایں مجاہدۂ کمینہ پیش شما بیان کردم و بزرگ ازآں دیگر اند کہ از گفتن آں شنوندگان را حیرت آید۔ بعد ازآں مسافر شدم بہ نیت زیارت کعبۃ اللہ و ہر گامے کہ شکرانہ گزاردہ دیگر گام ظاہر نہادم[2]"

مجاہدہ کی یہ عبارت درجِ ذیل وجوہ کی بناء پر ناقابلِ اعتبار ہے :

۱۔ ہر شبی یک یا دو گاؤ فربہ بجز پوست و استخوان و خون سرگین۔ خوردم

۲۔ دو کی جگہ اگر ایک گائے ہی فرض کر لی جائے تو دس سال میں :

گائیں ۳۶۰۰ میدہ ۳۶۰۰ خروار (ڈھیر) گھی = ۳۶۰۰ من

---

[1] مجاہدہ خود بزبانِ خود بیان کردن نشاید اما مجاہدۂ کمینہ مبتدیانہ پیشِ تو بیان سے کنم کہ ایں فقیر بیست سال تمام بہ یک درم آب و بہ یک درم طعام روزہ افطار کرد۔ بعد ازاں مسافر شدم بہ نیتِ زیارت کعبۃ اللہ روانہ شدم (خلاصۃ العارفین ص ۳۰)

[2] خلاصۃ العارفین قلمی بخط مولانا ضیاء الدین محررہ ۹ ذی الحج ۱۳۰۳ھ ص ۳۱۔

اور اگر من سے مراد آدھ سیر لی جائے تو دس سال میں شیخ الاسلامؒ نے ۴۵ من خالص گھی کھایا۔ چونکہ یہ انتہائی مبالغہ آرائی ہے اور صوفیائے کرام کے مجاہدات و ریاضت کے خلاف ہے۔ اس لیے ہم اس مجاہدہ کی نفی کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہمارے پاس خلاصۃ العارفین کا جو نسخہ ہے اس میں یہ سطور نہیں ہیں[1]۔

اس کے بعد دوسرا مجاہدہ ہر قدم پر دوگانہ ادا کرتا ہے۔ ذرا غور تو فرمائیے یہ کیسے واجب العمل ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ملتان سے ارضِ پاک کی طرف اس ہیئت سے روانہ ہو، ایک دن میں ایک میل بمشکل سفر کر سکے گا۔ پھر راستے میں ندی نالے اور دریا بھی آتے ہیں۔ باغات اور محلات بھی، کوچے تنگ اور غلیظ بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایسا پروگرام بنا کر گھر سے چلے تو ایک دنیا تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو جائے۔ اگر حضرت شیخ الاسلام اس ہیئت سے ارضِ پاک کے سفر پر روانہ ہوتے تو ہزاروں مرید آپ کے ساتھ چل پڑتے اور سب آپ کی اقتداء میں قدم قدم پر سجدہ کرتے اور ایک شہر سے گزرتے، گزرتے کئی دن لگ جاتے۔

خلفائے راشدین، ائمہ معصومین اور اولیائے کاملین نے مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کا جو سفر کیا ہے، اس میں انہوں نے یہ التزام رکھا کہ جہاں حضرت رسالتمآبؐ قیام فرمایا کرتے تھے، وہیں انہوں نے شب بسر کی اور جہاں آنحضرتؐ نے نمازیں ادا کی تھیں، وہیں نمازیں پڑھیں۔ مگر کسی تاریخ میں یہ نظر سے نہیں گزرا کہ کسی بزرگ نے قدم قدم پر دوگانہ ادا کرنے کا پروگرام بنایا ہو۔ البتہ قدم قدم پر دل نے سجدہ کیا ہو تو اور بات ہے۔

مجاہدہ کی تعریف

ایک موقعہ پر حضرت شیخ الاسلامؒ نے مجاہدات کی جو تعریف کی ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہر شب دوگانہ خوردن و یک خرما دروں کردن کی گپ بے اصل ہے۔

کسی موقعہ پر ایک مقرب نے دست بستہ عرض کی، حضور مجاہدہ کی تعریف کیا ہے ؟

فرمایا :

---

[1] خلاصۃ العارفین قلمی بخط مولانا ضیاء الدین، محررہ ۹ ر ذی الحج ۱۳۰۳ھ ص ۱۳۱۔

"مجاہدہ این است کہ ہر چہ نفس آرزو کند تا بیست سال آن آرزو بدو نرساند"[ل]
یعنی نفس جس چیز کی آرزو کرے، بیس سال تک وہ خواہش پوری نہ کی جائے۔
اس کے بعد فرمایا :۔
"میں نے جو ابتدائی مجاہدے کا ذکر کیا ہے یہ میرے نزدیک کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ یہ تو محض ابتدائی صورت ہے ورنہ مردانِ خدا تو ستر سال تک نفس کو آب و طعام کے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتے اور اسے شبانہ روز عبادت و اطاعتِ الٰہی میں مقید رکھتے ہیں۔ البتہ یہ مجاہدہ کی صحیح تعریف ہوسکتی ہے"۔
نیز فرمایا :۔
"میں نے یہ مشقت اور ریاضت ربِ کعبہ کی محبت اور رضا جوئی کے لیے کی۔ یہاں تک کہ ارضِ مقدس میں جا پہنچا۔ حج کیا اور عرفات کی پہاڑی پر حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوا۔ آپ نے تین سال کامل اپنی خدمت میں رہنے کا شرف بخشا۔ خداوند کریم کے فضل و احسان سے اس دوران ہی میں نے بڑا فیضان حاصل کیا۔ اس کے بعد جدید احرام باندھ کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوا پانچ سال یہاں رہ کر حضرت کے قدموں کی خاک پاک کی برکت سے انوارِ الٰہی کا ظاہری اور باطنی مشاہدہ کیا۔

مولانا جمالیؒ کا بیان

مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے پانچ سال کامل جوارِ رسولؐ میں بسر کیے۔ ان دنوں مولانا کمال الدین محمد یمنیؒ جو اپنے عہد کے بہت بڑے محدث تھے، حرمِ نبویؐ میں حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے، حضرت ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوگئے اور ان کے زانو سے زانو جوڑ کر حدیث کا درس لیتے رہے۔ ہر سال حج کے موقع پر مولانا کے ہمراہ مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے اور حج کے بعد واپس لوٹ آتے۔ جب حضرت شیخ الاسلامؒ نے حدیث شریف کا تمام علم از بر کر لیا تو زمانے کی رسم کے مطابق مولانا سے حدیث پڑھانے کی سند حاصل

ل خلاصۃ العارفین، تصحیح کردہ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی ۱۳۰ "احوال و آثار شیخ الاسلامؒ"

کی اور اُن سے رخصت ہو کر بیت المقدس کو روانہ ہوئے۔

مدینہ منوّرہ کے قیام کے دوران حضرت شیخ الاسلام حرم شریف میں قُبّہ مبارک کے دائیں جانب ایک خاص مقام پر معتکف رہا کرتے تھے جو بعد میں آپ سے منسوب ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ مولانا جمالیؒ جب مدینہ طیّبہ تشریف لے گئے تو اُنہوں نے بھی اسی مقام کو عبادت و اطاعت کے لیے پسند کیا۔ فرماتے ہیں :۔

"ایں احقر الانام کہ دراں ایام در حرم رسول صلے اللہ علیہ وسلم بُود۔ بداں موضع مشغول شدے، و مے ماندے و فیض بردے"[1]

اژدھا سے مقابلہ

تمام مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مدینہ منورہ سے شیخ الاسلامؒ بیت المقدس تشریف لے گئے۔ یہاں کچھ عرصہ رہ کر انبیاء علیہم السلام کے مقابر کی زیارت کی۔ اس کے بعد دمشق پہنچے۔ یہاں شہر کے باہر ایک خوف ناک اژدھا رہتا تھا جو بے شمار آدمیوں کو ہلاک کر چکا تھا۔ ایک مرتبہ آپ بھی وہاں سے گزرے۔ اژدھا آپ کو دیکھ کر پھنکارتا ہُوا باہر نکلا۔ جب قریب آیا، حضرت نے اپنی چادر اُس پر دے ماری۔ اژدھا مر گیا اور حضور آگے بڑھ گئے۔ اس افعی نے بے شمار آدمیوں کی جان لے لی تھی۔ جب یہ خبر شہر میں پہنچی تو لوگ جوق در جوق زیارت کو حاضر ہوئے۔ پانچ سال تک دمشق کے علماء اور مشائخ آپ کے آگے زانوئے ادب تہ کر کے استفاضہ کرتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے سمرقند کا رُخ کیا۔[2]

ایک خُدا یاد درویش سے مُلاقات

یہاں ایک باخدا درویش کا بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ آپ مُرشد کی تلاش میں مُلک مُلک کا دورہ کرتے پھرتے تھے۔ جب لوگوں سے اُس کی شہرت سُنی تو طویل سفر طے کرنے کے بعد اس خدادوست بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان پر استغراق کا عالم طاری تھا۔ آپ ایک عرصے تک لگاتار اُن کے پاس جاتے رہے۔ لیکن وہ متوجہ نہ ہوئے۔ دو برس کے بعد وہ بزرگ ہوش میں آئے۔ آپ پر نظر ڈالی۔ حضرت شیخ الاسلام اسی ساعت کے منتظر تھے۔ بڑھ کر قدم بوس ہوئے۔ فرمایا :

---

[1] سیر العارفین، قلمی۔ ص ۲۳ [2] ڈاکٹر شمیم محمود زیدی: "احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ"، ص ۱۵۳

"آپ کا آنا مُبارک ہو، آپ نے بڑی تکلیف اُٹھائی، مگر ہاں! درویشوں کی خدمت سے دونوں جہان کی مُرادیں ملتی ہیں۔"

"بہاء الدین، سُن! ئیس سال ہو چکے ہیں کہ یہ فقیر بحرِ تجلیات میں مستغرق ہے اور آنے جانے والوں سے بے خبر۔ آج دوست کا حکم ہُوا ہے کہ آپ سے ہمکلام ہو کر اپنی حالت سے آگاہ کردوں۔

اے عزیز! درویش کے لیے مخلوق کی صحبت سے بڑھ کر اور کوئی چیز زیادہ مُضر نہیں کیونکہ وہ جس قدر خلقت سے نزدیک ہوتا ہے، اُسی قدر خالق سے دُور ہو جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر اپنا مصلّٰی اور مٹھی بھر اشرفیاں حضرت کو عنایت کیں اور فرمایا:

"یہ آپ کا زادِ راہ ہے۔ آپ کو بہت دُور جانا ہے۔ اب تشریف لے جائیے۔"

ابھی یہ فقرہ پُوری طرح سے ادا بھی نہ ہُوا تھا کہ وہ طالبِ صادق آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

مُرشد کے حضور میں

حضرت شیخ الاسلامؒ کے لیے یہ بڑے اضطراب کا زمانہ تھا۔ سالہا سال سے مُرشد کی تلاش میں صحرانوردی کرتے پھرتے تھے۔ دو برس جس اُمید اور آرزو میں بسر ہوئے تھے۔ آج اس پر بھی پانی پھر چکا تھا۔ نئی اُمنگ اور نئے ولولوں کے ساتھ ایک نامعلوم سمت کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ذوق وشوق کی بے تابی اور نورِ وحدت کی کرنوں کی گدگدی نے آپ کو کسی ایک مقام پر ٹھہرنے نہ دیا۔

سچے جویائے حقیقت کی طرح کئی دن اور کئی راتیں لگاتار سرگرمِ سفر رہے۔ یہاں تک کہ بخت کی بیداری نے ایک دن آپ کو ادب اور "ہیبتِ حق" کے ایسے متبرک مقام پر لا کھڑا کیا، جہاں حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمتہ اللہ علیہ خالقِ کونین کی بھولی بھٹکی مخلوق کو نیکی کا راستہ دکھانے میں مصروف تھے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی متجسس نگاہوں کو شیخ الشیوخ کی ذات میں کچھ ایسے کمالات اور مکاشفات نظر آئے کہ اُنھوں نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا کہ یہی کعبۂ مقصود ہے۔ انتہائی ادب و

لہ احوال و آثار "شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی"، ص ۱۳۲

احترام سے قدموں میں جھک گئے۔ گلوگیر ہو کر عرض کی ؎

مابعشق تو نہ امروز گرفتار شدیم
کہ گرفتاری ما باتو ز روز ازل است

شیخ الشیوخ نے حضرت کو اپنے گلے سے لگالیا۔ شیخ الاسلامؒ دیر تک اس سینہ بے کینہ سے جو انوار الٰہی کا معدن اور سرچشمہ تھا، چمٹے رہے۔ جب طبیعت کو ذرا سکون ہوا تو ارادت و عقیدت کے ساتھ ہوشمند طالب علم کی طرح دو زانو ہو بیٹھے۔

ہمیں تاریخی طور پر پتہ نہیں چل سکا کہ حضرت شیخ الشیوخ نے حضرت شیخ الاسلام کو حلقۂ ارادت[ل۱] میں شامل کرنے کی رسم کیونکر ادا فرمائی؛ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ نے بغیر کسی مجاہدۂ نفس اور عبادت و

ل۱ شجرۂ طریقت: کتاب ہذا کے صفحہ ۲ پر سلسلۂ سہروردیہ کا شجرہ دیا گیا ہے۔ یہاں ہم اس کی کچھ وضاحت کرتے ہیں۔ شیخ سعدالدین الفرغانی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شیخ الاسلام کے پیر بھائی شیخ نجیب الدین علی برغش شیرازی کے نامور مرید ہیں۔ اپنی کتاب "مناہج العباد الی المعاد" میں لکھتے ہیں کہ مریدوں کا مشائخ کی طرف منسوب ہونا تین طریقوں سے ہوتا ہے۔ ایک تو خرقہ سے، دوم تلقین ذکر سے، سوم صحبت، خدمت اور ادب سیکھنے سے۔ خرقے دو ہیں۔ ایک تو خرقۂ ارادت ہے اور اس کو سوائے ایک شیخ کے دوسرے سے لینا جائز نہیں۔ دوم خرقۂ تبرک ہے اور اسے تمام مشائخ سے تبرک کے طور پر لینا جائز ہے۔ انھی ارادت کے خرقہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں نے شیخ نجیب الدین علی برغش شیرازی قدس سرہٗ سے لیا ہے۔ انہوں نے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ سے اور انہوں نے اپنے چچا شیخ نجیب الدین سہروردیؒ سے اور انہوں نے اپنے چچا قاضی وجیہ الدینؒ سے، انہوں نے اپنے باپ ابو محمد عمویہ اور اخی فرج زنجانی سے دونوں کا ہاتھ خرقہ پہنانے میں شریک ہے) ابو محمد عمویہ نے احمد اسود دینوریؒ سے خرقہ پہنا۔ انہوں نے ممشاد دینوریؒ سے، انہوں نے ابوالقاسم جنیدؒ سے۔ اخی فرج زنجانی نے ابو العباس نہاوندیؒ سے انہوں نے عبداللہ خفیف شیرازیؒ سے، انہوں نے شیخ احمد رویم بغدادیؒ سے انہوں نے جنیدؒ سے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ علیہ نے خرقہ کی نسبت کو ابوالقاسم جنیدؒ سے بڑھ کر آگے ثابت نہیں کیا اور حضرت جنیدؒ سے سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم تک کے سلسلہ کو صحبت سے نسبت دی ہے، خرقہ

(باقی صفحہ ۵۱ پر)

ریاضت کے حضور کو مُرید کر لیا تھا۔ ایک ہی توجہ سے سارے حجاب نظر کے سامنے سے ہٹا دیئے اور ایک ہی آن میں وہ جلوہ نظر آگیا جو ہزاروں برس کی عبادت سے بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ اٹھارہ ہزار عالم بے حجاب دکھائی دینے لگے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰ سے) سے نہیں، لیکن شیخ مجدالدین بغدادی قدس سرہٗ اپنی کتاب "تحفۃ البررہ" میں لکھتے ہیں :-

"خرقوں کی نسبت پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم تک صحیح حدیث متصل معنعن کے ساتھ ثابت ہے۔ چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کو خرقہ پہنایا ہے اور انہوں نے حسن بصریؒ کو، انہوں نے کمیل بن زیاد کو، انہوں نے عبدالواحد بن زید کو، انہوں نے ابو یعقوب نہر جوریؒ کو، انہوں نے عمرو بن عثمان مکّی کو، انہوں نے ابو یعقوب طبری کو، انہوں نے ابوالقاسم رمضانؒ کو، انہوں نے ابوالعباس بن ادریسؒ کو، انہوں نے داؤد خادمؒ کو، انہوں نے محمد مائیکلؒ کو، انہوں نے شیخ اسماعیل قصریؒ کو، انہوں نے شیخ نجم الدین کبریٰؒ کو انہوں نے مجھ فقیر یعنی مجدالدین بغدادی کو، بنابریں خرقوں کی نسبت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو گی۔" واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر اس کے آگے تلقین کی نسبت کو زیر بحث لاتے ہیں۔ چونکہ شیخ سعدالدین شیخ الشیوخ کے مرید ہیں، اس لیے تلقین کی کہ اس تفصیل کا اطلاق حضرت شیخ الاسلامؒ پر بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ خود سعدالدین الفرغانیؒ فرماتے ہیں :

"شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ نے اپنے شیخ خرقہ ابو نجیب سہروردی سے ذکر کی تلقین حاصل کی انہوں نے ابوبکر نساج سے، انہوں نے شیخ ابوالقاسم گرگانی سے انہوں نے ابو عثمان مغربی سے، انہوں نے ابو علی کاتب سے، انہوں نے ابو علی رودباری سے، انہوں نے سید الطائفہ جنید قدس اللہ تعالیٰ ارواحہم سے۔"

صاحب خلاصۃ العارفین نے بیعت کی نسبت کو سید الطائفہ جنید بغدادیؒ سے سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم تک اس طرح پہنچایا ہے۔ شیخ جنید بغدادی۔ شیخ سری سقطیؒ۔

شیخ سریؒ سقطیؒ نے دو جگہ بیعت کی۔

اوّل :

"شیخ سری سقطیؒ، شیخ معروف کرخیؒ، امام علی موسیٰ رضاؒ، امام موسےٰ کاظمؒ، امام محمد جعفر صادقؒ، امام محمد باقرؒ، امام زین العابدینؒ، امام حسینؓ، سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم۔

دوم :

شیخ سری سقطیؒ، شیخ داؤد طائیؒ، شیخ حبیب عجمیؒ، شیخ بصریؒ، امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ، (باقی صفحہ ۵۲ پر)

حضرت شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت شیخ الشیوخ نے جو خرقہ زیب تن کر رکھا تھا، اپنے بدن مبارک سے اُتار کر میرے سر پر رکھ دیا۔ اپنا مصلّٰی جس پر حضور عمر بھر معروفِ عبادت رہے تھے اور وہ خرقہ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے حضرت شیخ الشیوخ کو اپنے مشائخ کے توسط سے پہنچا تھا، دونوں اس خاکسار کے سپرد فرمائے۔

شیخ کے مُرید جو معرفتِ الٰہی میں خاص مقام رکھتے تھے اور وہ سب کے عارف اور حسنِ ازل کے سچّے پرستار تھے، شیخ کی اس کرم بخشی پر سخت حیران ہُوئے اور کہا :

"بڑے تعجّب کی بات ہے کہ اس سندھی درویش نے ایک رات دن میں تمام دولت و نعمت سمیٹ لی، لیکن ہم لوگ جو سالہا سال سے اس دروازے پر پڑے ریاضت و مجاہدہ کر رہے ہیں، ہم میں سے کسی پر ایسی توجّہ نہیں ہوئی"۔

آپ کو جب اس ماجرے کی اطلاع ہوئی تو سب کو بُلا کر ایک ایک کبوتر دیا اور فرمایا کہ "اسے ایسی جگہ ذبح کرو، جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو"

سب مرید کبوتر لے کر چلے گئے اور پیرِ طریقت کی ہدایت کے مطابق مقام تلاش کرنے لگے۔ انجام کار کبوتروں کو اپنے اپنے حجروں میں گھس کر ذبح کر لائے، مگر شیخ الاسلامؒ نے ذبح نہ کیا اور اسی طرح زندہ واپس لے آئے۔ سب درویشوں نے کہا کہ یہ سندھی تو کوئی نادان آدمی ہے کہ کبوتر کو بغیر ذبح کے واپس لے آیا ہے۔ آج پیرِ طریقت اس پر ضرور ناراض ہوں گے اور جو نعمت و دولت حاصل کر چکا ہے، سب سلب ہو جائے گی۔

(بقیہ حاشیہ صت ۵۱ سے) جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم۔

نسبت مودودی : محولہ بالا سلسلوں کے علاوہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا آبائی شجرۂ طریقت حسبِ ذیل ہے :

حضرت شیخ الاسلام شیخ بہاءالدین ابو محمد زکریاؒ، (آپ نے خرقہ پہن کر سجادہ نشینی اپنے والد بزرگوار مولانا وجیہ الدین محمد غوث سے حاصل کی اور اُنہی کے مُرید ہوئے) مولانا وجیہ الدین محمد غوثؒ، کمال الدین ابو بکرؒ، جلال الدین علی قاضیؒ، شمس الدینؒ حسین، عبداللہ، حسین، مطرف، خذیمہ، حازم، تاج الدین المطرف، عبدالرحیم، عبدالرحمان، صبار، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم۔

۵۲ خلاصۃ العارفین صت ۱۳۔ مطبوعہ قومی تاجران کتب، لاہور۔

الغرض سب شیخ الشیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا :

"اے بہاؤالدین! تُو نے کبوتر ذبح کیوں نہیں کیا ؟"

آپ نے دست بستہ عرض کی :

"قبلہ عالم! حضور نے فرمایا تھا، ایسے مقام پر ذبح کرو، جہاں کوئی دیکھتا نہ ہو، مَیں جہاں گیا، وہیں اللہ تعالےٰ کو حاضر و ناظر پایا، اس لیے کبوتر کو زندہ واپس لے آیا ۔"

شیخ دُوسرے درویشوں کی طرف دیکھ کر مُسکرائے اور حضرت شیخ الاسلام کو شاباش دی۔

درویشوں کے شک کو رفع کرنے کی غرض سے مکرّر یہ حکم دیا کہ سب چلے جاؤ اور گھاس کا ایک ایک پشتارہ لے آؤ، تاکہ خانقاہ کے صحن میں بچھایا جائے۔ سب درویش جنگل سے نرم نرم سبز گھاس کاٹ کر لے آئے، لیکن حضرت شیخ الاسلامؒ سوکھی گھاس اُٹھا لائے۔ حضرت شیخ الشیوخ نے آپ سے پُوچھا :

"تم ہری گھاس کیوں نہیں لائے ؟"

آپ نے عرض کی :

"غریب نواز! جنگل میں ہری گھاس کی تو کمی نہیں تھی، لیکن مَیں جہاں گیا، اُسے یادِ الٰہی میں مصروف پایا۔ اس لیے مجھے مناسب معلوم نہ ہُوا کہ اسے یادِ الٰہی سے محروم کر دوں اور چُونکہ خشک گھاس ذکر اللہ سے فارغ تھی، اس لیے اسے کاٹ لایا ہوں۔"

اگرچہ آوردند دیگر کاہ تر
یافتند ایشاں نہ ہرگز ایں خبر!
کاہِ تر محواست در یادِ خُدا
مے کند تسبیح ہر صبح و مسا

یہ جواب سُن کر سب درویش شرمندہ ہوئے اور حضرت شیخ الشیوخ نے فرمایا :

"اے دوستو! تم گیلی لکڑی کے مانند تھے، جس پر آگ جلدی اثر نہیں کرتی، لیکن شیخ بہاء الدین سوکھی لکڑی کی طرح ہیں کہ عشقِ الٰہی کی آگ نے اُنہیں فوراً اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یعنی ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست — تانہ بخشد خدائے بخشندہ

دین و دُنیا پر قبضہ

حضرت شیخ الشیوخ کی خدمت میں آئے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک دن حضرت نے طلب فرمایا۔ ایک کٹا ہوا انار حضرت کے ہاتھ میں تھا، دیکر فرمایا کہ کھا لیجئے۔ جب شیخ الاسلامؒ نے وہ انار لیا، تو اس میں سے ایک دانہ گر پڑا۔ آپ نے فوراً اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لیا۔

شیخ الشیوخ نے فرمایا :

"بہاءالدین! یہ دانہ دراصل دُنیا تھی۔ مَیں نے چاہا کہ تم اس کے جھمیلے میں نہ پڑو۔ اس لیے عمداً گرا دیا تھا۔ لیکن تُو اٹھا کر کھا گیا۔ اب دین و دُنیا دونوں تیرے قبضے میں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اب تم ملتان میں جاکر سکونت اختیار کرو کہ اس ملک کے باشندوں کی ہدایت تمہارے سپرد کی گئی ہے۔

شیخ جلال تبریزیؒ

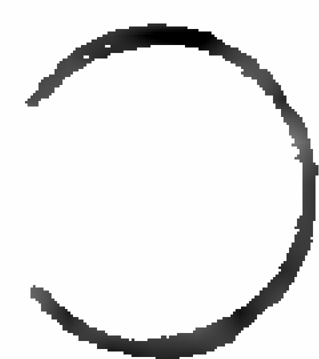
سید جلال تبریزیؒ کے نام سے ایک بزرگ حضرت شیخ الشیوخ کے آستاں پر رہتے تھے۔ تین چار مُلاقاتوں میں ارتباط اس قدر بڑھا کہ وہ بھی آپ کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گئے اور حضرت شیخ الشیوخ سے عرض کی کہ مجھے شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے بڑی محبت ہے۔ اگر ارشادِ عالی ہو تو مَیں بھی ان کے ہمراہ چلا جاؤں۔ حضرت شیخ الشیوخ نے اجازت دے دی اور دُنیائے تصوّف کے یہ شمس و قمر بغداد سے ملتان کو روانہ ہو گئے۔

عظمتِ مُرشد

ان دنوں بخارا کے راستے سے مُلتان آنا پڑتا تھا۔ جب یہ بزرگوار سفر طے کر کے نیشاپور پہنچے، تو شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ علماء و مشائخ سے ملنے کے لیے شہر میں تشریف لے گئے۔ اور حضرت شیخ الاسلامؒ اپنی منزل گاہ میں ہی مصروفِ عبادت رہے۔ مُلاقات کے بعد واپس آئے تو حضرت شیخ الاسلامؒ نے ان سے پوچھا کہ آج کی سیر میں کس درویش کو سب سے بہتر پایا؟

فرمایا: "شیخ فریدالدین عطار کو"۔

پوچھا: "کیا کیا باتیں ہوئیں"؟



عروس البلاد ملتان

شیخ الاسلامؒ کی زندگی کا تبلیغی دور

حضرت شیخ الاسلامؒ کی غیر حاضری میں عروس البلاد ملتان اور کوٹ کروڑ نے جو جو انقلابات دیکھے، وہ بجائے خود ایک لمبی داستان ہے۔ ہم تفصیل میں نہیں جاتے۔ مختصر یہ ہے کہ ملتان کے قرامطہ کے اقتدار پر سنہ ۵۷۱ھ میں محمد غوری کے ہاتھوں کاری ضرب لگ چکی تھی۔ اگر انہیں لاہور کے حاکم خسرو ملک کی حمایت حاصل نہ ہوتی، تو کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے۔ لیکن چونکہ ادھر سے برابر شہ مل رہی تھی، اس لیے دیہات میں اُن کا پورا اثر موجود تھا۔ سلطان نے سنہ ۵۷۶ھ / ۱۱۸۰ء میں لاہور پر یلغار کی۔ لیکن خسرو ملک قلعہ بند ہو گیا اور افواج سلطانی ناکام واپس لوٹ گئیں۔

سنہ ۵۸۰ھ / ۱۱۸۴ء میں سلطان پھر پنجاب پر حملہ آور ہوا اور سیالکوٹ پر قبضہ کر کے اس کے قلعہ کی مرمت کرائی۔ سنہ ۵۸۲ھ / ۱۱۸۶ء میں لاہور پر آخری حملہ ہوا اور سلطان خسرو ملک کو گرفتار کر کے ہمراہ لے گیا۔ سنہ ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء میں خسرو اور اس کے تمام خاندان کو سلطان غیاث الدین کے پاس بھجوا دیا۔ اس نے انہیں جرجستانی کے قلعہ میں قید کیا اور خوارزم شاہ کے حملے میں سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ خسرو آلِ سبکتگین کا آخری چشم و چراغ تھا۔ دستور کے مطابق اس خاندان کا ستارۂ اقبال بھی دو سو سال میں اپنا دورہ پورا کر کے ایسا غروب ہوا کہ پھر نہ اُبھرا۔

سنہ ۵۹۹ھ / ۱۲۰۲ء تک سلطان ہندوستان کے راجوں مہاراجوں سے سرگرم پیکار رہا۔ سنہ ۶۰۰ھ / ۱۲۰۳ء میں خوارزم شاہ پر حملہ کیا، مگر شکست کھائی اور خراسان کی طرف بھاگ نکلا۔ اس کا ایک غلام ایبک نامی ہمراہ تھا۔ اس نے سمجھا کہ سلطان مارا گیا۔ اُسے سندھ کی حکومت کا خیال پیدا ہوا۔ اُس نے بادشاہ کے مرنے کی افواہ ہر طرف پھیلا دی اور خود بگولہ بن کر ملتان پہنچا۔ یہاں سلطان کی طرف سے امیر حسن حکومت کرتا تھا۔ اُسے دربار میں جا کر ملا اور کہا کہ مجھے آپ کو بادشاہ کا پیغام دینا ہے۔ اور آج کل جو حوادثات گزر رہے ہیں، اُن کی بابت کچھ بیان کرنا ہے، خلوت میں چلئے۔

امیر حسن بلا تامّل اس کے ہمراہ محل میں چلا آیا۔ یہاں ایک ترکی غلام تاک میں بیٹھا تھا۔ اس نے فوراً گردن اڑا دی۔ پھر دربار میں آیا اور ایک جعلی فرمان دکھا کر اعلان کیا کہ امیر حسن سلطان کے حکم سے کیفرِ کردار کو پہنچا، آج سے میں اس ولایت کا حاکم ہوں۔ امراء نے بلا تامّل اطاعت کر لی، لیکن جب گکھڑوں کو یہ خبر پہنچی، تو وہ لاہور پر قبضہ کرنے کے ارادے سے نکل پڑے اور جہلم و سوہدرہ میں سخت ہنگامہ برپا کر دیا۔ سلطان شہاب الدین غوری تازہ دم ہو کر غزنی پہنچا۔ یہاں یلدوز بگڑا بیٹھا تھا۔ اس نے شہر میں نہ گھسنے دیا۔ یہاں سے ملتان پہنچا۔ ایبک مقابلے میں نکلا۔ ایک معمولی جھڑپ کے بعد سلطان نے اُسے گرفتار کر لیا۔ پنجاب سے سپاہ جمع کر کے غزنی کی طرف متوجّہ ہوا اور یلدوز کو مطیع کیا۔ انہی ایّام میں خوارزم شاہ کا ایلچی آیا اور صلح ہو گئی۔

۶۰۱ھ آزمائش اور ابتلاء کا سال تھا۔ تمام سرداروں نے سلطان کی اطاعت کا جوا کندھے سے اُتار پھینکا تھا۔ صرف قطب الدین ایبک ہی وفادار رہا۔ ۶۰۲ھ میں سلطان نے گکھڑوں سے لڑنے کا ارادہ کیا۔ قطب الدین ایبک بھی دلّی سے سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دونوں نے مل کر گکھڑوں کی خوب گوشمالی کی۔

گکھڑوں کا مذہب

گکھڑوں کا کوئی مذہب نہ تھا۔ جس کے ہاں لڑکی ہوتی، وہ دروازے پر لے کر کھڑا ہو جاتا اور پکارتا کہ کوئی اسے اپنی زوجیت میں لینے کو تیار ہے؟ اگر کوئی قبول کرتا تو اُس کے حوالے کر دیتا، ورنہ جان سے مار ڈالتا۔ ایک ایک عورت کئی کئی خاوند کرتی تھی۔ مسلمانوں کو تکلیف پہنچانا بڑا ثواب سمجھتے تھے۔ اگرچہ شاہی فوج نے اُن کا کچومر نکال دیا تھا، مگر پھر بھی یہ اپنی ہٹ سے باز نہ آئے۔ سلطان یہاں سے لاہور چلا گیا تھا، جتنے دن وہاں قیام رہا گکھڑ مسلمانوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے رہے۔ لاہور اور غزنی کی سڑک ان کے علاقے سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہ راستہ مسلمانوں پر بند ہو گیا۔

گکھڑوں کا قبولِ اسلام

انہی ایّام میں ایک مسلمان گکھڑوں کے ہاں قید ہو کر آیا۔ اس نے گکھڑوں کے سردار کے سامنے اسلام کی خوبیاں اس طرح سے بیان کیں کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ اگر میں سلطان کے پاس جا کر اسلام قبول کر لوں، تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟

قیدی مُسلمان نے جواب دیا کہ مَیں اس امر کا ذمّے دار ہوں کہ وہ تیرے ساتھ شاہانہ سلوک کرے گا اور اس پہاڑی علاقے کی حکومت تجھے دے دیگا۔

گکھڑوں کا رئیس اس بیان پر مُسلمان ہونے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ قیدی مُسلمان نے یہ صُورتحال سلطان کی خدمت میں لکھ بھیجی۔ سُلطان نے فوراً خلعتِ فاخرہ اور مُرصّع کمربند سردار کے لیے ارسال کئے۔ اس پر وہ بے جھجک سُلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر مُسلمان ہوگیا۔

سُلطان نے قیدی مُسلمان کے وعدے کو ایفاء کرتے ہُوئے کوہستانی علاقے کی حکومت اس گکھڑ کے سپرد کی۔ وہ فرمان لے کر اپنے وطن میں واپس آیا اور اپنی قوم کے بہت سے آدمیوں کو مُسلمان بنایا۔ انہی دِنوں میں دریائے سندھ اور غزنی کے درمیانی علاقے کے پہاڑی باشندے بھی مُسلمان ہو گئے۔

قرامطہ کی تباہی

سلطان لاہور سے مُلتان پہنچا۔ یہاں ابھی تک قرامطہ غالب تعداد میں موجود تھے۔ چُن چُن کر اُن کا خاتمہ کرایا اور ملتان کی سرزمین کو کفر و الحاد کی اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا۔ جب سارے مُلک میں امن ہوگیا، تو سلطان نے غزنی جانے کا ارادہ کیا اور والیٔ بامیاں کے نام حکم ہُوا کہ دریائے جیحون کے کنارے پر لشکر جمع کرے اور پُل تیار رہے، کیونکہ ہم ترکستان کے کافروں سے جہاد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

غرض کوکبۂ اجلال حرکت میں آیا اور ۲ر شعبان کو سراپردۂ شاہی دریائے سندھ کے ایک پُر فضاء مقام پر نصب ہوا۔ ایک رات قرامطی گکھڑوں کے چند بدمعاش نوجوان جن کے اعزا و اقارب لشکرِ شاہی کے ہاتھوں مارے گئے تھے، دریا کو عبُور کر کے آدھی رات کے وقت خیمہ میں گھس گئے اور سُلطان کو خنجروں سے شہید کر ڈالا۔

بادشاہ کا جنازہ بڑے جاہ و جلال اور شان و شوکت سے غزنی کو روانہ ہُوا۔ بڑے بڑے رئیس اور امیر ہمراہ تھے اور آہ و بکا کرتے تھے۔ جب جنازہ غزنی کے قریب پہنچا، تو حاکمِ غزنی تاج الدین یلدوز استقبال کو آیا۔ اس نے وفورِ رنج سے زرہ بکتر پھینک دیا، بالوں کو بکھیرا اور سر میں خاک دھول ڈال لی۔ کم و بیش یہی کیفیت باقی امراء کی تھی۔

مخدوم عبدالرشیدؒ کی ہجرت

مخدوم عبدالرشیدؒ حضرت شیخ الاسلامؒ کے چچازاد بھائی تھے۔ چچا بزرگوار کے انتقال پر وہی گھر کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ آپ کی غیر حاضری میں کافی عرصہ تک کوٹ کروڑ میں رہے اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی ہمشیرہ بی بی کمال خاتونؒ سے شادی کی۔ جن کے بطنِ عفت سے شیخ ابوبکرؒ اور شیخ محمد تولد ہوئے۔ اور ابھی شیخ الاسلامؒ سفر میں ہی تھے کہ خصوصی حالات کی بناء پر آپ کوٹ کروڑ سے ملتان ہجرت کر آئے اور قلعہ قدیم میں اس مقام پر قیام فرمایا، جہاں اس وقت حضرت شیخ الاسلامؒ کا روضۂ مبارک ہے۔ پہلے یہاں نرسنگ پیرا پیر دیو کا استھان تھا۔ تھوڑے سے عرصہ میں حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ کے علم و رشد اور فقر و ولایت کا چرچا ہر طرف پھیل گیا۔ اکنافِ عالم سے سعید روحیں کھچ کھچ کر یہاں جمع ہونے لگیں اور قال اللہ و قال الرسول سے ملتان کے در و دیوار گونج اٹھے۔

خواب بشارت

ایک دن حضرت مخدوم عبدالرشید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں علماء و مشائخ کا اجتماع تھا۔ بحث و مناظرہ میں تین پہر گزر گئے۔ اجلاس برخاست ہونے پر دفعتاً آپ پر غنودگی طاری ہوئی اور عالمِ رویا میں کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت احمد غوثؒ تشریف لے آئے ہیں اور فرماتے ہیں:

"بیٹا! چوتھے دن تیرے چچازاد بھائی حضرت شیخ بہاء الدین زکریا دین و دنیا کی سعادتوں سے مالامال ہو کر ملتان میں داخل ہوں گے، تمہیں لازم ہے کہ اپنی ہمشیرہ کو ان کے نکاح میں دے دو اور خود حرمین شریفین کو روانہ ہو جاؤ۔"

مخدوم عبدالرشید خواب سے بیدار ہوئے، برادرِ بزرگوار کے آنے کی بشارت سے شادماں ہوئے اور بڑی بےتابی سے انتظار کرنے لگے۔

شیخ الاسلامؒ کی آمد

حضرت شیخ الاسلامؒ سکون و اطمینان سے ملتان کو چلے آ رہے تھے۔ جب غزنی کے مضافات میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ملتان کے فرمانروا سلطان ناصر الدین قباچہ اور غزنی کے خلجیوں کے مابین لڑائی چھڑ چکی ہے۔ اس لیے آگے جانے کا کوئی راستہ

محفوظ نہیں ہے۔ خلجیوں کے بے شمار قبائل جنوب مشرقی افغانستان میں آباد تھے اور کافی منظم تھے۔ روزانہ ہزاروں مردانِ کارآزمامابھرتی کرکے محاذِ جنگ پر بھیجے جارہے تھے۔ حضرت چُپ چاپ یہ کیفیت دیکھتے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن آپ کا ورود ایسے گاؤں میں ہوا جہاں سے قباچہ کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ یہ پُرفضا اور کوہستانی مقام تھا۔ آپ چند ایام کے لیے یہیں رُہ پڑے اور حالات کا جائزہ لینے لگے۔ اس نواح میں آپ کی تشریف آوری کا چرچا ہوا تو لوگ جوق در جوق رشد و ہدایت کے اس سرچشمہ پر جمع ہو گئے۔ ہزاروں فاسق و بدکار آپ کی توجہ سے صراط المستقیم پر گامزن ہو گئے۔ سینکڑوں نے جنیدؒ اور بایزیدؒ کا مرتبہ پایا۔

کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ خلجیوں کو اس جنگ میں سخت ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا ہے اور اب وہ دہلی کے تاجدار سلطان شمس الدین التمش کے پاس امداد کے لیے اُڑے چلے جارہے ہیں۔ لوگوں نے سُلطان کی بڑی تعریف کی اور بتایا کہ اس کی عسکری طاقت بہت مضبوط ہے۔ دو سال پہلے غزنی کے حاکم تاج الدین یلدوز نے جب اس سے ٹکّر لگائی تھی تو اُسے مُنہ کی کھانا پڑی تھی۔ ناصر الدین قباچہ سے بھی اُس کے تعلقات اچھے نہیں۔ یقیناً گھمسان کا رن پڑے گا اور اس سے ملتان کا متاثر ہونا لازمی ہے۔

چند ماہ بعد اطلاع ملی کہ سلطان خلجیوں کی مدد کو بڑھا چلا آتا ہے۔ حضرتؒ ملتان کو روانہ ہونے والے تھے کہ یہ خبر سُن کر رُک گئے۔ اگرچہ یہ انتشار کا زمانہ تھا اور عوام سیاسی پیچیدگیوں کے سبب پریشان سے ہورہے تھے۔ اس کے باوجود حضرتؒ کے گردو پیش ہزاروں سعید رُوحیں مور و ملخ کی طرح جمع رہتی تھیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ بہت جلد ملتان پہنچنے کے آرزومند تھے، اس لیے روز پتہ کرتے تھے کہ ملتان کا رستہ کھلا ہے یا نہیں؟

ایک دن خبر ملی کہ دریائے چناب کے کنارے دونوں بادشاہوں کا سخت مقابلہ ہوا ہے اور قباچہ شکست کھا کر سندھ کو بھاگا چلا جاتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اب ملتان کی خیر نہیں۔ دوسرا معرکہ یقیناً اس شہر میں ہوگا۔ لیکن حضور نے اس خیال کی تردید فرمائی کہ التمش دین دار بادشاہ ہے اور وہ ناحق بندگانِ خدا کا خون نہیں گرائے گا۔ چنانچہ تیسرے دن حضرت کے ارشادِ گرامی کی تصدیق بھی ہو گئی۔ محاذِ جنگ سے آنے والوں نے بتایا کہ سلطان دہلی کو واپس لوٹ گیا ہے اور انہوں نے کوکبۂ شاہی

کو اپنی آنکھوں سے واپس جاتے دیکھا ہے۔

یہ سنتے ہی حضرت شیخ الاسلامؒ اپنی مسند پر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ میں اب یہاں اور قیام نہیں کر سکتا۔ مجھے بہت جلد ملتان پہنچنا ہے۔ یہ کہہ کر سب سے رخصت ہوئے اور تن تنہا ملتان کو چل دیئے۔ صاحب انوارِ غوثیہ کے بیان کے بموجب حضرت ۶۱۴ھ میں بغداد سے روانہ ہوئے تھے اور گمان اغلب یہی ہے کہ حضرت نے ۶۱۵ھ کے آغاز میں ہی اس مینو سواد خطہ سے ملتان کا رخ کیا ہوگا۔ یہ مقام آپ کے نام کی رعایت سے شیخ بہاء الدین مشہور ہو گیا تھا۔ آج کل شیخ بدین کہلاتا ہے اور صوبہ سرحد کا صحت افزاء مقام ہے۔

قِران السعدین شیخ شرف الدین قریشی لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ کو کشف کے ذریعے آپ کی آمد کا علم ہو گیا تھا۔ جونہی آپ ملتان میں داخل ہو گئے، شیخ عبدالرشیدؒ فوراً دیول دروازے پر پہنچے اور شیخ الاسلام سے بغلگیر ہو کر ملے۔ اس کے بعد دونوں بھائی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دولت خانہ کو روانہ ہوئے۔ آگے نوکر چاکر اور اعزا و اقارب انتظار میں تھے۔ سب سے مصافحہ و معانقہ کرنے کے بعد خلوت میں تشریف لے گئے اور والدہ ماجدہ کو یاد کر کے بہت روئے۔

کاسۂ شیر صاحب خزینۃ الاصفیاء اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ جب حضرت ملتان میں تشریف لے آئے اور طالبانِ حق فوج در فوج حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے لگے تو اکابر ملتان کو آپ کی عالم گیر شہرت پر حسد ہوا اور دودھ سے بھرا ہوا ایک پیالہ خدمتِ اقدس میں ارسال کیا۔ اس سے اشارہ یہ تھا کہ "ملتان اس پیالہ کی طرح مشائخ اور علماء سے بھرا پڑا ہے آپ کی یہاں گنجائش کہاں؟"

حضرت کے آگے اس وقت گلاب کے پھول رکھے تھے، آپ نے ایک پھول اس پیالے میں ڈال کر واپس بھجوا دیا۔ گویا جواب یہ تھا کہ "اس پھول کی طرح ہم نہ صرف یہاں سما سکتے ہیں، بلکہ ہماری شہرت اور نیک نامی یہاں کے جملہ باخدا درویشوں پر غالب آئے گی[1]"

---

[1] جائے من درین شہر بطوریکہ گُل بالائے شیر است خواہد بود (خزینۃ الاصفیاء ص ۲۱)

مخدُوم عبدالرّشیدؒ کا عزمِ سفر

جب سفر کی کوفت دُور ہو گئی تو مخدُوم عبدالرشیدؒ نے والد بزرگوار کی وصیت کے مطابق اپنی ہمشیرہ رشیدہ خاتون کی شادی حضرت شیخ الاسلامؒ سے کر دی اور اموال و خزائن جن کی سالہا سال تک آپ نے بحیثیت امین کے نگہداشت فرمائی تھی۔ آخری کوڑی تک حضرت شیخ الاسلامؒ کو سنبھال دی اور ارضِ پاک کو جانے کے لیے اجازت طلب کی۔ حضرت نے سینے پر پتھر کی سِل رکھکر بھائی کو الوداع کہی اور مخدوم عبدالرشیدؒ اپنے سات فدا کاروں کے ہمراہ دیارِ حرم کو روانہ ہو گئے۔

حضرتؒ کے معمولات

حضرت شیخ الاسلامؒ اب متاہل ہو چکے تھے۔ مخدُوم عبدالرشیدؒ کے اہل و عیال اور اُن کے نامور بھائی بھی آپ کے دامن سے وابستہ تھے۔ ایک بڑا خزانہ جو اسلاف سے ترکہ میں ملا تھا، تن آسانی اور عیش کوشی کی دعوت دینے کو موجود تھا لیکن وہ پیکرِ نور جسے عنفوانِ شباب میں دُنیا کے رنگ و روغن کی ملمع کاری دھوکہ نہیں دے سکی تھی، اب اس کے فریب میں کیسے آ سکتا تھا۔ قلعہ قدیم پر محل تعمیر ہُوا، لیکن فقرار اور مشائخ کے لیے۔ مگر اہل و عیال کے لیے حجرے اور سرائیں معرضِ وجود میں آئیں۔

حضرت کی اپنی حالت یہ تھی کہ لاکھوں اشرفیاں قدموں میں پڑی چمکا کرتیں، لیکن حضور اُن سے بے پرواہ ہو کر "جبینِ نیاز" خاکِ عبودیت پر رکھے اپنے عجز و انکسار کا اعتراف کرتے دکھائی دیتے تھے۔ سنہری زرو پہلی سکّوں کے اس بڑے خزانے کو اس ذاتِ مقدّس کی نگاہوں میں کبھی ٹوٹے ریزوں کے ڈھیر سے زیادہ مقام حاصل نہ ہُوا۔ گویا ؎

چیست دُنیا از خدا غافل بودن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ایک مصنّف[1] کی شیخ الاسلامؒ کی ملتان میں آمد کے بارے میں درج ذیل رائے ہے:-

"جب آپ بغداد سے اس مُلک میں آئے تو بباعث دوستی مخدوم شیخ یحییٰ گردیزی سجادہ نشین، حضرت شاہ گردیز اس شہر میں سکونت اختیار کی۔"

---

[1] مصنّف تذکرۂ ملتان۔

ہمیں مذکورہ اقتباس سے یکسر اختلاف ہے۔ کیونکہ حضرت شیخ الاسلامؒ مرشد کے حکم سے ملتان تشریف لائے تھے[۱] اور مرشدِ طریقت کی طرف سے ہی اس شہر کے عوام کی روحانی تربیت پر مامور ہوئے تھے۔ کسی دوست کی کشش انہیں یہاں لے آنے کا موجب نہیں ہوئی تھی۔ حضور اس شہر کے باطنی حاکم تھے، جس کا علم تمام اولیائے کاملین کو ہو چکا تھا۔ چنانچہ جب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی جاتے ہوئے یہاں سے گزرے اور سلطان ناصر الدین قباچہ نے انہیں ملتان میں قیام کرنے کی درخواست کی تو آپ نے واشگاف الفاظ میں فرمایا:

"ملتان برادرم بہاء الدین کی تحویل میں دیا جا چکا ہے۔ ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں"[۲]

یہ کہہ کر دہلی کو روانہ ہو گئے۔

اسی طرح مؤلف "تذکرۃ الملتان" کو مخدوم شاہ یوسف گردیز کے معاملے میں بھی غلط فہمی ہوئی۔ انہوں نے بڑی بے تکلفی سے حضرت شیخ الاسلام محمد یوسف گردیزیؒ کو جو روحانی اعتبار سے شہنشاہِ دین و دین تھے، انہیں فقر و ولایت کی تاجداری سے ہٹا کر اس شہر کا صوبے دار بنا ڈالا یعنی وہ قطبِ دوراں غوثِ زماں حضرت مخدوم علی قسور گردیزیؒ کی طرف سے اہلِ ملتان کی اصلاحِ احوال پر مامور ہو کر نہیں آئے تھے، بلکہ ابراہیم شاہ غزنوی کی طرف سے ملتان کے صوبہ دار بن کر آئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"حضرت مخدوم یوسف گردیزی کے جدِ بزرگوار نے حسبِ استخارہ منجانب اللہ انہیں اس ملک میں آنے اور اسے آباد کرنے کی رخصت عطا کی اور فرمایا:

تمہیں ملتان کی اصلاح پر مامور کیا گیا ہے، وہاں جا کر سکونت اختیار کرو، تم اور تمہاری

---

[۱] (۱) "بہاء الدین زکریا بعد عطائے خرقۂ خلافت حسب الارشاد پیرِ روشن ضمیر ملتان آمد و سکونت ورزید۔"

(خزینۃ الاصفیاء، ص ۲)

(۲) "خرقۂ خلافت کے بعد حضرت بہاء الدین زکریا رحمہ اللہ علیہ کو مرشد کی طرف سے حکم ملا کہ ملتان واپس جا کر قیام کرو اور وہاں کے باشندوں کو فیض پہنچاؤ۔" (بزمِ صوفیہ، ص ۹۱)

[۲] سیر العارفین، ص ۸۹۔

اولاد وہاں ہمیشہ عزت و آبرو سے رہے گی۔“

یہاں تک تو صحیح ہے، لیکن آگے جو کچھ لکھا ہے اُس کا حقائق سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :۔

”نیز بادشاہِ وقت نے جو اُن کے معتقدوں میں سے تھا، اس خبر کے سُنتے ہی فرمان معافی ملک ملتان بطر نیاز قدیمی اُن کے نام لکھ دیا اور حضرت مخدوم نے بھی اپنی طرف سے کچھ وجہ پیشکش سالانہ دینا منظور کی۔ الغرض جدِّ کے انتقال پر باجازت والد نامدار بہت سے اسباب و سامانِ ظاہری کے ساتھ اس ملک میں بہ رونق بخشی۔ اس شہر کو جو راجگان کے وقت سے ویران پڑا ہوا تھا، آباد کیا۔ ان کے عدل و انصاف کا شہرہ سن کر دُور دُور سے لوگ آکر اس شہر میں آباد ہوئے۔ حضرت مخدوم موصوف تو عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے اور انتظامِ ملک کار پردازوں کے سپرد تھا۔“[1]

اندازہ فرمائیے! اس کا ملخص یہ ہے کہ :

۱۔ بادشاہ نے اس ملک کا پروانہ آپ کو مرحمت کیا۔

۲۔ آپ بادشاہ کو سالانہ خراج ادا کرتے تھے۔

۳۔ دادا کی وفات پر والد بزرگوار کی اجازت سے بڑے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گھر کا جملہ مال و اسباب لاد کر ملتان تشریف لائے۔

۴۔ یہ شہر راجوں کے وقت سے ویران پڑا تھا۔

۵۔ خود عبادت میں مصروف رہتے تھے اور ملک کا انتظام کارندے چلاتے تھے۔

نمبر ۱، ۲ میں حضرت کو بادشاہ کا ماتحت صوبے دار ثابت کیا گیا ہے۔

نمبر ۳۔ امرِ واقعہ کے خلاف ہے، آپ کے والد سید ابو بکر مخدوم سید علی قسورؒ کی زندگی میں فوت ہو گئے تھے۔ حضور اپنے ہمراہ کوئی چیز نہیں لائے تھے۔ شیر پر سوار تھے اور سانپ ہاتھ میں تھا۔ یہی کچھ آپ کی کائنات تھی۔ اللہ والے ظاہری اسباب کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ

---

[1] ”تذکرہ ملتان“ ص ۹۰ ۔

اُن کے لیے زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے ۔

نمبر ۴ ۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ ملتان شہر راجوں کے وقت سے ویران چلا آتا تھا ، بلکہ صحیح یہ ہے کہ اسلامی دور میں اسے جو فروغ نصیب ہُوا ، راجوں کے زمانے میں یہ بات کہاں تھی ۔

نمبر ۵ ۔ یہ ارشاد کہ خود تو مصلّٰی نشین تھے ، مگر امورِ مملکت کارندے چلاتے تھے ، یہ اصولِ جہانبانی کے خلاف ہے ۔ آج تک کوئی فرمانروا حکومت کے کاروبار کارندوں کے سپرد کر کے مصلّٰی نشین نہیں ہُوا ، البتّہ تخت و تاج اکثر بادشاہوں نے درویشی قبول کرنے پر از خود دوسروں کے حوالے کیا ہے ۔ جیسے سلطان حمیدالدین حاکم اور حضرت ابراہیم ادھم کے بارے میں مشہور ہے ۔ اب شیخ الاسلامؒ کو حضرت مخدوم سید یحییٰؒ کا دوست قرار دیکر اپنی گدی کا طفیلی بنانا مقصود ہے ۔ جسکی تائید کسی تذکرے سے نہیں ہوتی ۔

سید جلال تبریزیؒ شیخ الشیوخ کی طرف سے کسی مُلک کی ہدایت پر مامُور نہیں تھے

" احوال و آثار " کے مقالہ نگار نے سید جلال تبریزیؒ کے بارے میں درجِ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے :-

" ایں سلسلہ رونق پیدا نکرد تا اینکہ شیخ بہاء الدین زکریّا ملتانیؒ و شیخ جلال الدین تبریزی بہ شیہ قارہ آمدند و بوسیلۂ اینہا بود کہ ایں سلسلہ آنجا رواج پیدا کرد [۱] "

یعنی حضرت شیخ الاسلامؒ اور حضرت تبریزیؒ نے مل کر اس سلسلہ کو فروغ دیا ۔

مزید رقمطراز ہیں :

" در بنگال شیخ جلال الدین تبریزیؒ ایں سلسلہ را رواج داد [۲] "

پھر لکھتی ہیں :

" بوسیلۂ مریدان ایں دو بزرگ ایں سلسلہ تا کشمیر و گجرات و حتی تا افغانستان نفوذ پیدا کرد [۳] "

---

[۱] مقالہ احوال و آثار ، شیخ بہاء الدین زکریّا ، ص ۱۳

[۲] ، [۳] احوال و آثار شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ، ص ۱۳

ایک اور مقام پر محترمہ نے اشاعتِ اسلام کا زریں تاج سید جلال سلہٹی کے سر سے اُتار کر حضرت تبریزیؒ کو نوازش کیا ہے، فرماتی ہیں :

«شیخ جلال الدین تبریزیؒ بود کہ علم سطوت اسلام را در پاکستان شرقی برافراشت۔»[1]

مولفہ نے اپنی ان تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کشمیر سے سماٹرا اور بورنیو تک سہروردی درویشوں نے اسلام کی جو شمعیں روشن کی ہیں، یہ صرف حضرت شیخ الاسلامؒ بہاء الدین زکریا کی سعیٔ جمیل کا ہی ثمرہ نہیں، بلکہ ان عظیم الشان تبلیغی کامیابیوں میں سید جلال تبریزیؒ برابر کے شریک ہیں۔

حالانکہ محترمہ نے ایک جگہ تسلیم کیا ہے کہ جب حضرت شیخ الشیوخ نے شیخ الاسلامؒ کو ملتان کی روحانی تربیت پر مامور کیا، تو جلال تبریزیؒ نے بحیثیت ایک دوست کے ان کی صحبت میں رہنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اگرچہ تبریزی صاحب کی دل جوئی کی خاطر شیخ الشیوخ نے اجازت دے دی مگر یہ بات نبھ نہ سکی اور نیشاپور میں اُن کی دوستی کا رشتہ ٹوٹ گیا اور دونوں وہاں سے مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔

مزید ملاحظہ ہو۔

«شیخ الشیوخ[2] گفت حالا وقت آں رسیدہ کہ عزیمت سفر کنی و بہ ملتان برگردی چوں مردمان آنجا بتو احتیاج دارند۔»

یعنی اب ملتان روانہ ہو جاؤ کہ وہاں کے عوام کو تیری ضرورت ہے۔

مزید لکھتی ہیں :

«وقتے بنا بہ دستور او (یعنی شیخ بہاء الدین زکریا) می خواست از بغداد بہ ملتان برود یکے از مریدان شیخ شہاب الدین باسم شیخ جلال الدین تبریزی (۵۳۶ - ۶۳۲) کہ بہ شیخ بہاء الدین زکریا انس گرفتہ بود از مرشد اجازہ خواست کہ با او ہمراہی کند۔ شیخ

---

[1] «احوال و آثار» صفحہ ۳۵

[2] مقالہ «احوال و آثار» الخ صفحہ ۳۶

الشیوخ اجازہ داد[1]"

یعنی بوجہ دوستی شیخ الاسلامؒ کے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی بحیثیت رفیق کے نہ بحیثیت مامور کے، مگر وہ رفاقت ختم ہو گئی۔

مقالہ نگار مزید تحریر کرتی ہیں :-

"شیخ بہاء الدین آزردہ خاطر شد و بہ ہمین جہت بود کہ ہمانجا از جلال الدین تبریزی جدا شد و ہر دو، در دو مختلف براہ افتادند۔ و شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی راہ ملتان و شیخ جلال الدین تبریزیؒ راہ خراسان را در پیش گرفت[2]"

مقالہ نگار نے حضرت شیخ الاسلامؒ کی اشاعت اسلام کی مساعی کو چھپانے کی کوشش کی، مگر تضاد بیانی کے سبب اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

شیخ جلال تبریزیؒ کی بزرگی مسلّم ہے، مگر موصوف ابو سعید ترمذیؒ کے مُرید تھے۔ حضرت شیخ الشیوخ ان کے پیرِ صحبت تھے۔ ظاہر ہے کہ پیرِ صحبت اپنے ایسے مرید کو کسی علاقے کی اصلاح پر مامور نہیں کر سکتا اور نہ شیخ الشیوخ نے اُنہیں کہیں بیٹھ کر کام کرنے کی اجازت فرمائی۔ یہ آزاد مرد درویش تھے دو دن کہیں، چار دن کہیں۔ ان سے نہ سلسلہ چلا ہے اور نہ ہی اُنہوں نے اپنی طرف سے کسی کو کہیں کام کرنے کا حکم دیا ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپ مرید کرنے سے بھی گریز کرتے تھے۔

یہ کسی ایسی ویسی کتاب کی روایت نہیں۔ حضرت محبوب الٰہی دہلویؒ راوی اور حضرت امیر حسن علی سنجری رحمتہ اللہ علیہ ناقل ہیں۔ فوائد الفواد کا حوالہ ہے جو صوفیاء میں بالاجماع ثقہ تصوّر کی جاتی ہے۔

" سوموار کے دن ۲۳ ذیقعدہ ۷۰۸ھ کو (حضرت نظام الدین اولیاء قدس سرّہٗ) کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوا۔ ایک جوان آیا، تو خواجہ صاحب نے اس سے پوچھا کہ تیرے جد بزرگوار کس پیر کے مُرید تھے؟ جواب دیا کہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مرید تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شیخ جلال الدینؒ کسی کو بہت کم مُرید کیا کرتے

---

[1] "احوال و آثار" ص ۳۹ [2] الخ

تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری، مولانا برہان الدین غریب حاظر تھے۔ پوچھا کہ ایسے بزرگ اور شیخ ہو کر کیوں لوگوں کو مرید نہیں کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا: خواہ مرید کریں یا نہ کریں۔ ان کی بزرگی اور شیوخت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو آدمی ہوں اور دونوں میں قوتِ رجولیت ہو۔ ایک کے ہاں تو اولاد پیدا ہو اور دوسرے کے ہاں نہ ہو، تو اس سے یہ تو لازم نہیں لاتا کہ اس کے مرد ہونے میں کچھ شبہ ہے، لیکن ایسا بہت دیکھا گیا ہے۔ انبیاء بھی اسی طرح گذرے ہیں۔ چنانچہ قیامت کے دن ہر ایک پیغمبر اپنی اُمّت کو ہمراہ لائے گا کسی کے ساتھ کم ہو گی، کسی کے ساتھ زیادہ۔ ایک پیغمبر ایسا آئے گا کہ اس کے ہمراہ صرف ایک آدمی ہو گا لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اس کی نبوّت کا قصور ہے۔ اسی طرح سے شیخ اور مرید کا معاملہ ہے[1] ۔"

حضرت محبوب الٰہی تو فرماتے ہیں کہ حضرت تبریزیؒ مرید نہیں کرتے تھے، مگر مقالہ نگار بڑے وثوق سے فرماتی ہیں :۔

"در بنگال شیخ جلال الدین تبریزیؒ ایں سلسلہ را رواج داد بوسیلۂ مریدان ایں دو بزرگ ایں سلسلہ تا کشمیر و گجرات وحتیٰ تا افغانستان نفوذ پیدا کرد۔" اور پھر: "شیخ جلال الدین تبریزی بود کہ عَلَمِ سطوتِ اسلام را در پاکستان شرقی برافراشت ۔"

معلوم ہوتا ہے کہ محترمہ نے سید جلال سلہٹی اور سید جلال تبریزیؒ کو فردِ واحد سمجھ لیا ہے۔ یہ سید جلال سلہٹی ہی ہیں جو حضرت شیخ الاسلامؒ کے مرید در مرید اور سید جلال بخاریؒ کے نواسے ہیں۔ چھ سو درویشوں کے ہمراہ اُچ سے چلے اور بنگال پہنچ کر راجہ گوڑ گوبند کو شکست دی اور اس ملک میں عَلَمِ اسلام بلند کیا۔ ان کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے جب یہ دیکھا کہ حاکم سست اور بے پرواہ ہے اور قرامطہ کی ملحدانہ تعلیم غیر شعوری طور پر عوام کے قلب و دماغ پر چھا رہی ہے، تو حضور نے قرامطہ کے اثر و نفوذ

---

[1] فوائد الفواد ص ۲۶ ۔

کو مٹانے اور نوعِ انسانی کو اسلام سے متعارف کرانے کا ایک منصوبہ تیار کر لیا۔

آپ نے دیکھا کہ اس ملک کے تمام ہندو پرہلاد جی کے مندر میں حاضری دینا اپنا مذہبی فریضہ جانتے ہیں، تو آپ نے اس عظیم تاریخی مندر کے سامنے اپنی مسند قائم کی، جو ہندو یاتری پوجا کر کے مندر سے نکلتا، آپ کے نورانی چہرے کو دیکھتے ہی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا اور کہتا کہ آپ منش نہیں ہیں، بلکہ بھگوان کے اوتار ہیں۔ جو دھرم آپ کا وہی ہمارا۔

آج سے سات صدی پیشتر کے زمانے کا تصور کر کے اندازہ لگائیے جبکہ پرہلاد جی کا مندر برِصغیر پاک و ہند کے کروڑوں ہندوؤں کا مرکزِ توجہ تھا۔ ہزاروں ہندو، مرد اور عورتیں صبح و شام اس مندر کے درشنوں کو حاضر ہوتی تھیں۔ سالانہ میلوں ٹھیلوں پر لاکھوں یاتری کالے کوسوں کا سفر طے کر کے یہاں پہنچتے تھے۔ شیخ الاسلامؒ نے اس عظیم ہندو معبد کے سائے میں بیٹھ کر کیونکر اسلام کی شمعیں روشن کی ہوں گی اور صبح و شام کی گھنٹیوں اور ناقوسوں کے مقابلے میں جب ادھر سے اللہ اکبر کی فلک شگاف آواز بلند ہوتی ہوگی، تو اس کی صدائے بازگشت سے مندر کے پروہتوں اور مہاشوں کے دلوں پر کتنے سانپ لوٹ جاتے ہوں گے؟

آج کا ہندو جے پال، انند پال، جے چند، پرتھوی راج، رانا پرتاپ اور سیواجی کے مقابلے میں کئی درجے زیادہ روشن خیال اور رواداری ہے اور آپ کروڑوں کی تعداد میں ہیں، کسی کو اپنے مذہب کی طرف بلا کر تو دیکھیے، کیا جواب ملتا ہے؟ یا بھارت جا کر کسی مندر میں تھوڑی دیر سستانے کی کوشش تو فرمائیے اور پھر دیکھیے کہ اس کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے؟ اس سے مشائخ اسلام کے بے پناہ اثر و نفوذ کا اندازہ لگائیے کہ وہ نہ صرف مندروں کے پہلوؤں میں آباد ہو گئے، بلکہ انہوں نے مستقل طور پر ان کی دیواروں اور کلیسوں کے سائے میں اسلام کی اشاعت کے مراکز قائم کیے۔ دنیا میں ہزاروں انقلابات آئے، حملہ آوروں کی یلغار سے شہر کے شہر غبار بن گئے۔ ملکوں کے جغرافیے بدل گئے۔ خشکی کی جگہ تری اور تری کی جگہ خشکی نے لے لی، لیکن وہ اللہ والے جو اسلام کی سربلندی کے لیے گھروں سے نکلے تھے، خدا نے ان کی عظمت کے میناروں کو حوادثِ دہر سے محفوظ رکھا، بلکہ ان کے طفیل کفر کے آثار کو بھی زمانے کی دستبرد سے بچا لیا گیا تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے حجت قائم رہے اور وہ لوگ جنہوں نے اسلام

کو ورثہ کے طور پر پایا ہے، دیکھیں کہ اکابر اہل اللہ نے ان کے آباء و اجداد کو اسلام کی آغوش میں لانے کے لیے کتنا بڑا خطرہ قبول کر لیا تھا۔

حضرت شیخ الہند اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ اور پھر اُن کے گرد و پیش کے مندروں پر نظر دوڑائیے۔ سید جلال تبریزیؒ، سید جلال سلہٹیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزارات کے پہلو بہ پہلو اب بھی شکست خوردہ مندر نظر آتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کی خانقاہ عالیہ کے عین بالمقابل پرہلاد کا عظیم مندر آپ کی روحانی عظمت و شوکت کا اعتراف کرنے کو سر جھکائے کھڑا ہے۔ آپ نے اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے کشمیر سے گجرات کاٹھیاواڑ تک ہر جگہ تبلیغی مرکز قائم کئے اور اشاعتِ اسلام کا گرانقدر کام کیا۔

میر حسینیؒ نے ہرات میں اور عراقی نے مصر و شام میں فقر و ولایت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایران، افغانستان، بلخ بخارا اور نیشاپور تک ہر جگہ سہروردی ہی سہروردی نظر آنے لگے تھے۔ شیخ الاسلامؒ کے بعد اُن کے فرزند جگر حضرت الشیخ العارف صدر الدین محمد اور ان کے بعد اُن کے پوتے حضرت شاہ رکن عالم رحمہم اللہ علیہم نے ملتان کی سرزمین کو مطلع انوار بنائے رکھا اور مکران سے سلہٹ تک برصغیر قال اللہ و قال الرسول کی صداؤں سے گونج اُٹھا۔

تبلیغی سرگرمیاں

حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنی خانقاہ عالیہ کے پہلو میں ایک علمی، دینی اور صوفیانہ درس گاہ کی بنیاد رکھی۔ جس کے دو شعبے تھے، ایک علماء پیدا کرتا تھا اور دوسرا مبلغین۔

مبلغین کے لیے ضروری تھا کہ جس ملک میں انہیں بھیجا جائے، انہیں وہاں کی زبان اور ثقافت سے پوری واقفیت ہو، تاکہ وہ وہاں پہنچ کر اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہ کریں۔ اس لیے آپ نے ہر ملک سے ایک ایک فاضل عالم طلب کر کے اپنی درس گاہ میں ملازم رکھا۔ اُسے معقول تنخواہ اور رہائش کا تسلی بخش انتظام فرمایا۔

جب علماء فارغ التحصیل ہو کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ایک ایک کو الگ الگ بُلا کر پوچھتے کہ کیا تم فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ تبلیغ کرنے کو تیار ہو؟ اس طرح کافی نوجوان از خود اپنے آپ کو اس مقصد کے لیے پیش کرتے تھے۔ جو جس ملک میں جانا چاہتا، وہ اسی کمرے میں اس

علاقے کی زبان اور ثقافت کی تعلیم حاصل کرتا۔ دو سال کے بعد شیخ الاسلامؒ اس مبلغ کے اُستادِ محترم کو پانچ ہزار اشرفی عنایت کرتے کہ شہر سے اس مُلک کے لیئے مفید اور ضروری سامان خرید کر کے ایک کشتی میں ترتیب دو اور پھر یہ جہاز اپنی دُعاؤں کے سایہ میں منزلِ مقصود کو روانہ فرماتے۔ چلتے وقت مبلغ کو ہدایت فرماتے :-

- سامان کم منافع پر فروخت کرنا۔
- لین دین میں اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھنا۔
- ناقص چیزوں کو فروخت نہ کرنا، بلکہ فقرار اور مساکین کو مُفت دے دینا۔
- خریداروں سے خندہ پیشانی سے پیش آنا۔
- جب تک لوگوں کا اعتماد حاصل نہ ہو، ان پر اسلام پیش نہ کرنا۔
- اس طرح یہ علمائے ربانیین سوداگروں کے لباس میں کشتیوں پر سامانِ تجارت لاد کر روانہ ہوتے اور جاوا، سماٹرا، فلپائن اور چین تک پہنچ کر دوکانیں کھولتے اور دیانتداری سے لین دین کرتے اور ساتھ ہی لوگوں پر اسلام پیش کرتے۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلتا اور لوگ اُن کے حسنِ اخلاق، ان کی خدا ترسی، دینداری، دیانت داری اور معاملات میں صفائی سُتھرائی دیکھ کر گرویدہ ہو جاتے اور بالآخر اسلام قبول کر لیتے۔ آج مشرقِ بعید کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں جو کروڑوں مسلمان نظر آتے ہیں یہ انہی تاجر مبلغین کی سعیٔ مشکور کا نتیجہ ہیں۔

یہ تو خارجی جہدِ مسلسل کی کیفیت تھی۔ اس کے علاوہ ایک داخلی تبلیغ کا شعبہ تھا، جس کی نگرانی شیخ الاسلامؒ خود فرماتے تھے۔ واعظین اور مبلغینِ کرام کی متعدد جماعتیں کشمیر سے راس کماری اور گوادر سے بنگال تک مصروفِ عمل تھیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کی آمد سے پہلے حضرت سلطان غنی سرور رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعتیں موجود تھیں۔ مگر صحیح قیادت میسر نہ ہونے کے سبب ان میں سستی اور بے راہروی سی پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت نے ان کی بھی سرپرستی فرمائی۔ دس دس میلوں کے فاصلے پر اُن کی قیام گاہیں مقرر ہوئیں۔ جہاں سرسبز اور گھنے درختوں کے سایہ تلے کئی کئی دنوں تک وعظ و نصیحت کی مجالس گرم رہتیں۔ سال کے خاتمے پر مبلغین کے یہ گروہ جو آج کل "سنگ" اور

"جماعت" سے موسوم ہیں، پانچ پانچ سو کی تعداد میں قال اللہ وقال الرسول سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے ملتان حاضر ہوتے اور اپنی کارگزاری تفصیل سے بیان کرتے۔ ان گروہوں کا قائد خلیفہ کہلاتا تھا۔ ان اہل اللہ کی تبلیغی سرگرمیوں کو دیکھ کر عیسائی مشنریوں نے بھی اپنے پادری دیہاتوں میں روانہ کیے۔ یہ لوگ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے جنوبی ایشیا کے طول وعرض میں طوفانی دورے کرتے رہے اور مسلمان درویشوں کی طرح صوفیانہ انداز میں تبلیغ کرنے کی کوشش کی۔

برِصغیر کے ہر ضلعی صدر مقام پر مشن کی طرف سے عالی شان گرجے اور اُن کے پہلوؤں میں تبلیغی مراکز قائم کیے[1]۔ عوام میں لاکھوں روپے کی ادویات مفت تقسیم کیں۔ غرباء کو پارچات اور خوردنی اجناس سے نوازا۔ تالیف قلوبی کے لیے بہت کچھ کیا، مگر انہیں وہ ہر دلعزیزی حاصل نہ ہوسکی جو حضرت شیخ الاسلامؒ اور اُن کے خلفاء کے مبلغین کو حاصل ہوئی تھی۔

حضرت کے خدام کو نہ روپے پیسے کی ضرورت تھی اور نہ مکانوں اور سواریوں کی۔ وہ آبادی، جنگل اور کوہ وصحرا میں ہر جگہ کندھے پر چادر رکھے پہنچ جاتے تھے اور اپنی سادہ معاشرت اور زاہدانہ عادت کے سبب سفر وحضر میں بلاتکلف گزارہ کرسکتے تھے۔ اپنی غیر پولیٹیکل اور خالص مذہبی زندگی کے سبب کوئی بھی حکومت انہیں قوم و ملک کے لیے چنداں خطرناک تصور نہیں کرتی تھی۔ اس لیے ان صوفیاء کو تمام اقوام میں اشاعتِ اسلام کے کافی اور عمدہ مواقع ملتے رہے اور یہی طریقہ اس قدر موثر ثابت ہوا کہ جہاں جہاں ان درویشوں کے قدم پہنچے، وہاں دینِ اسلام کے چراغ جگمگا اُٹھے۔

اس دور کے ہندو اسندراک پر یقین رکھتے تھے اور ان کے جوگی، پنڈت اور برہمن روحانی شکتی کے لیے جنگلوں اور غاروں میں سخت مجاہدے کرتے تھے۔ بایں ہمہ وہ ان روحانی قوتوں کے مالک[2] نہ بن سکے جو صوفیاء کو اسلام کے فیضان سے حاصل تھیں۔ اس لیے وہ معمولی

---

[1] آگرہ، دہلی، لاہور اور ملتان وغیرہ مرکزی مقامات پر عیسائیت کی اشاعت کے لیے عالی شان عمارتیں تعمیر کی گئیں جو اب تک قائم ہیں۔

[2] لاہور میں عبدالجلیل اور جوگی جے پال کا مقابلہ (اذکار قلندر ص ۱۳۱) اجودھن میں حضرت شیخ العالم فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

(باقی صفحہ ۷۷ پر)

جرح قدح کے بعد اسلام کی بے پناہ روحانی قوت کے آگے جھک جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت کے خدام نے تبلیغ کی جدوجہد کو زیادہ موثر بنانے کے لیے ہر قریہ اور آبادی میں علم الٰہیات کے مدارس قائم کئے، جنہیں خانقاہوں سے موسوم کیا جاتا تھا۔ انہیں ملتان کے مرکزی تبلیغی یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق انسانی کمال اور روحانی جلال کے حصول و عروج کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔ ایسے روحانی سنٹر پنجاب اور سندھ کے چپہ چپہ پر قائم تھے اور جب یہ اللہ والے رشد وہدایت کا علم لہرا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بجا آوری کے لیے روانہ ہوتے، تو ان کے آنے کی پہلے سے لوگوں کو اطلاع ہو جاتی تھی اور وہ تمام کام نپٹا کر ان خدا شناسوں کے انتظار میں دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیتے تھے۔ سہروردی فقراء ہر منزل پر ایک دو یوم ضرورت کے مطابق قیام کر کے تبلیغی مجالس ترتیب دیتے۔ صاحب حال صوفی اور نامور مشائخ اثر میں ڈوبی ہوئی تقریریں کرتے، جس سے سامعین کے قلوب لرز جاتے۔ فولادی طبائع نرم ہو کر موم بن جاتی تھیں۔ خشونت آمیز نگاہوں سے خشیتِ الٰہی کی دھاریں پھوٹ پڑتیں۔ بڑے بڑے سنگدل انسان خدا کے قہر و غضب اور اس کی بے پناہ گرفت سے کانپ اُٹھتے اور بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے لگتے۔ ایک ہی نشست میں ہزاروں فاسق و بدکار تائب ہو کر قطب و ابدال بن جاتے تھے۔

ان کے علاوہ تبلیغی جماعتیں جو اس مقصد کے لیے روانہ کی جاتی تھیں، وہ اپنے نان نفقہ کا بوجھ کسی پر نہیں ڈالتی تھیں، بلکہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اُن کو لاکھوں روپے کا سامانِ تجارت خرید کر دیا جاتا تھا۔ ہر پڑاؤ پر دوکانیں کُھل جاتیں۔ نانبائی کھانا تیار کرتے، بزاز کپڑوں کی دوکانیں سجاتے اور بنجارے قسم قسم کا سامان لے بیٹھتے۔ محافظ دستہ جنگی مظاہرے کر کے نوجوانوں کو جہاد کے لیے اُبھارتا۔ زور آزمائی ہوتی، گھوڑ دوڑ، نیزہ بازی اور شمشیر افگنی کے کمالات سے مُردہ دلوں میں زندگی کی ایک نئی رُوح دوڑنے لگتی۔ حضرات علماء ایک جانب لاکھوں کے ہجوم میں قرآن و حدیث کے واعظ کرتے نظر آتے۔ دوسری طرف گھنے دار جھاڑیوں میں

؂ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۳ سے) سے ہندو جوگی بشمبر ناتھ نے مقابلہ کیا اور منہ کی کھائی۔ "تذکرہ بابا فرید گنج شکرؒ" از سید نصیر احمد جامعی۔ ص ۱۲۶

عارفانِ حق آگاہ کا حلقہ نظر آتا تھا۔ جس میں زنگ آلود قلوب نہ صرف صیقل ہوتے، بلکہ تزکیۂ نفس، استغراق مراقبہ اور عباداتِ شرعیہ کے لیے انہیں تیار کیا جاتا تھا۔

سید صباح الدین عبدالرحمان ایم اے لکھتے ہیں :۔

"ملتان کی مدتِ قیام میں نہ صرف ملتان بلکہ سارا ہندوستان حضرت بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض و برکات کے انوار سے منور ہو گیا تھا اور ان کا عہد خیر الاعصار کہا جاتا ہے۔"[1]

شیخ محمد نور بخش سلسلۃ الذہب میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ ہندوستان میں رئیس الاولیاء تھے۔ علومِ ظاہری کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات کے مقامات و احوال میں کامل تھے۔ ان سے اکثر اولیاء اللہ کے سلسلے منتسب ہوئے۔ لوگوں کو رشد و ہدایت کی تلقین فرماتے اور انہیں کفر سے ایمان کی طرف، معصیت سے اطاعت کی طرف اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لے آئے اور اُن کی شان بڑی تھی۔"[2]

صاحب سفینۃ الاولیاء کے الفاظ یہ ہیں :۔

"حضرت بہاء الدین زکریا شیخ الشیوخ سے رخصت ہو کر ملتان آئے اور یہیں توطن اختیار کیا۔ رُشد و ہدایت میں مشغول ہوئے، تو بہت سے لوگوں نے ان کی ہدایت کی برکت پائی۔ اس دیار کے تمام لوگ ان کے ہی مُرید اور معتقد ہیں۔"[3]

کسبِ حلال

حضرت شیخ الاسلامؒ جب اپنے مُرشد سے رُخصت ہونے لگے تھے، تو اُنھوں نے آپ کے لیے دین و دُنیا کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہونے کی دُعا کی تھی اور فرمایا تھا کہ دولت کے انبار قدموں میں پڑے چمکا کریں گے۔ بہت جلد دُنیا نے

---

[1] بزمِ صوفیاء، ص ۹۲

[2] اخبار الاخیار، ص ۲۷

[3] سفینۃ الاولیاء، ص ۱۹۷

دیکھ لیا کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کو ربِّ جلیل نے دین اور دُنیا دونوں کی سربلندی عطا کی تھی ۔ آپ کو آبائے کرام کی طرف سے بہت بڑا خزانہ ترکہ میں ملا تھا، جسے آپ نے درویشوں کے لیے حجرے اور مسافروں کے لیے سرائیں تعمیر کرنے اور زکریا یونیورسٹی کے ابتدائی انتظامات پر خرچ کر دیا تھا ۔ بایں ہمہ فتوحاتِ غیبی کا یہ عالم تھا کہ روزانہ لاکھوں آتے اور لاکھوں خرچ ہوتے ۔

اس زمانے میں دریائے راوی قلعہ سے ٹکرا کر گزرتا تھا ۔ اس کے ذریعے حضور کا سامانِ تجارت سکھر، بھکر، ٹھٹھہ، منصورہ اور پھر وہاں سے عراق، عرب اور مصر تک جاتا تھا۔ خشکی کے راستے کابل، ایران، دہلی اور لاہور سے تجارت ہوتی تھی ۔ حضرت اپنی اراضیات کی پیداوار ملک کی خام اجناس اور مصنوعات معتمد خدام کی معرفت دساور کو بھجواتے تھے ۔ مبلّغین کی طرح اُن کو بھی ہدایت ہوتی تھی کہ کم نفع پر بیچو اور دیانت داری سے معاملہ کرو ۔ حضرت کے کارندے جن میں اکثر اہل اللہ اور خدا یاد بزرگ تھے، نہایت دیانت داری سے معاملات طے کرتے تھے، جس سے آپ کو بیش از بیش نفع ہوتا تھا ۔

اس کے علاوہ کوٹ کروڑ میں حضرت کی جو ذاتی جائیداد تھی، اس سے بھی بڑی آمدن ہوتی تھی ۔ تحصیل لودھراں میں واہی غوث الملک اور قلعہ پیر کے نام سے سرسبز اور زرخیز اراضیات سونا اُگل رہی تھیں ۔ حضرت کے زمانے میں دریائے گھاگرا انہیں سیراب کرتا تھا اور ان کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا ۔ اس وقت ان اراضیات کا پانی بھی میٹھا تھا ۔ بعد میں دریا کے رُخ بدلنے سے ان علاقوں کا پانی کڑوا ہو گیا ۔ یہ نہایت سیر حاصل رقبے تھے ۔ لاکھوں روپے کی ان سے سالانہ یافت ہوتی تھی ۔

نظامِ اوقات

حضرت اپنے زمانے کے بہت بڑے عابد تھے، کلامِ پاک کی تلاوت سے آپ کو بڑا شغف تھا ۔ آپ نے ۹۶ سال عمر پائی تھی ۔ ہوش سنبھالتے ہی آپ نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ ہر رات کو قرآن شریف کا ایک ختم کرتے تھے ۔ ایک بار اپنے خلفاء کی کسی مجلس میں تشریف فرما تھے، ان سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"تم میں سے کوئی شخص ایسا بھی ہے جو دو رکعت نماز کی نیت باندھے اور ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر دے ۔ حاضرین میں سے کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی، آخر آپ نماز

کے لیے کھڑے ہوئے اور پہلی رکعت میں قرآن شریف ختم کر کے دُوسری میں چوتھائی حصّہ پڑھ کر سلام پھیر دیا۔"

حضرت شیخ الاسلامؒ کی صحت آخر عمر تک قابلِ رشک رہی۔ چھیانوے برس کی عمر میں بھی بالاخانے سے اُتر کر جماعت کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے۔ روزانہ فجر، اشراق اور چاشت کی نمازوں کے بعد دیوان خانہ میں مسندِ ارشاد پر جلوہ فرما ہوتے۔ اس وقت تمام علماء اور مشائخ بالالتزام حاضر ہوتے اور سلوک و معرفت کے دقائق حل کرتے۔ ملازمین تجارت، زراعت اور لنگر خانہ کے حسابات پیش کرتے۔ آپ اُن کی پڑتال کراتے اور مناسب ہدایات فرماتے۔ اس دوران شہر اور مضافات کے غرباء اور مساکین پیش ہوتے۔ انہیں درہم و دینار اجناس اور خلعتوں سے نوازا جاتا۔ دوپہر کو دولت خانے میں تشریف لے جاکر غذا تناول فرماتے۔ اور جب روزے رکھتے تو لگاتار رکھتے۔

خانگی امور بھی دوپہر کے وقت پیش ہوتے تھے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ فرماتے۔ ظہر کو اذان ہوتی تو حضرت مسجد میں تشریف لاکر باجماعت نماز ادا فرماتے۔

اس کے بعد حجرے میں چلے جاتے اور کافی دیر تک اوراد و اذکار میں معروف رہتے۔ زاں بعد پھر مجلس منعقد ہوتی۔ اس میں تبلیغی جماعتوں کے وفود سے ملاقات کرتے، اور ان کی کارگزاریوں کو سُنتے اور ان کی مشکلات کو حل فرماتے۔ طالبانِ علم بھی بعض اہم معاملات لے کر پیش ہوتے۔ حضرت اُنہیں درس دیتے اور زیرِ بحث مسائل پر تقریر فرماتے تھے۔ اس وقت کسی کو سر اُٹھانے کی جرأت نہ ہوتی۔ ہر شخص سر جھکائے ادب سے سُنتا رہتا اور یوں محسوس کرتا گویا آسمان سے کوئی صحیفہ اُتر رہا ہے۔

عصر کی اذان سُن کر حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ پھر مسجد میں تشریف لے جاتے اور عام مُسلمانوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر نماز ادا فرماتے۔ اس کے فوراً بعد منبر پر تشریف لے جاتے۔ قرآن و حدیث کا وعظ ہوتا۔ سامعین کی تعداد ہزار دو ہزار نہیں بلکہ بعض اوقات

چالیس پچاس ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ چبوترا جس پر حضرت نے بیس سال تک بلا ناغہ وعظ فرمایا ہے، اب تک روضۂ مبارک کے مشرق میں موجود ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مشائخ کرام نے حضرت کا وعظ سُن کر وجد کیا ہے۔ عام مسلمانوں نے ہدایت پائی ہے اور ہزارہا غیر مسلم دینِ اسلام سے مشرف ہوئے ہیں۔ جن خوش نصیب افراد کو زندگی میں کسی باعمل عالم سے وعظ سُننے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے وعظ کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ علمائے ربانیین کی آواز محض حلق سے نہیں نکلتی تھی، بلکہ دل کی عمیق گہرائیوں سے اُٹھتی تھی۔ یہی قدسی نفوس علماء مسجدوں کے محرابوں میں کھڑے ہوکر دعوتِ عمل دیتے تو حاضرین میں بجلی کی سی تڑپ پیدا ہوجاتی اور آنکھوں کے ڈھیلے فرطِ جوش سے خونیں نظر آنے لگتے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ یہی حرب نا آشنا مٹھی بھر مسلمان خطبہ سُن کر مسجد سے نکلتے اور سیاسیاتِ عالم کا مُہرہ پلٹ کے رکھ دیتے۔ انہی تاثرات کے پیشِ نظر شیخ سعدیؒ نے فرمایا تھا ؎

صاحبدلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ   بشکست عہد صحبت اہلِ طریق را
گفتم میانِ عابد و عالم چہ فرق بود   تا اختیار کردی ازاں دین طریق را
گفت آں گلیم خویش بدر می برد ز موج
ویں جہد مے کند کہ بگیرد غریق را

لیکن یہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا ہی مقام تھا کہ آپ اپنے عہد کے بہت بڑے عابد بھی تھے اور بے پناہ عالم بھی۔ حجرے میں بیٹھ کر ارادت مندوں کو تزکیۂ نفس کی تعلیم بھی دیتے تھے اور مسجد و محراب کی زینت بن کر لوگوں کے دلوں کو گرماتے بھی تھے۔ بسا اوقات ایک ہی نشست میں ہزارہا غیر مسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے تھے اور یہ تو روز کا مشاہدہ تھا کہ کوئی نہ کوئی دُنیا دار فاسق، وعظ سُن کر چیخ اُٹھتا اور اپنا مال و اسباب خُدا کی راہ میں لُٹا کر حضرت کے خدّام میں شامل ہو جاتا۔

غروبِ آفتاب سے پہلے مضافات میں ہوا خوری کے لیے تشریف لے جاتے۔ کبھی سواری پر، کبھی پیادہ اور کبھی ہوادار میں۔

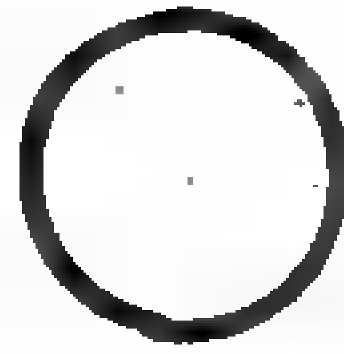
خاص خاص خدّام اور ارادت مند ہمراہ ہوتے۔ مغرب کو واپسی ہوتی اور باجماعت نماز

ادا کرنے کے بعد تخلیہ میں چلے جاتے اور دیر تک اوراد و اذکار میں معروف رہتے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے پھر مسجد میں تشریف لے آتے اور نماز پڑھ کر ڈیڑھ پہر رات تک عبادت میں معروف رہتے۔ اوراد و اذکار سے فارغ ہو کر دولت خانہ میں تشریف لے جاتے اور غذا تناول فرما کر کچھ دیر استراحت کرتے۔

ایک تہائی رات لے کر پھر بیدار ہوتے، اس وقت تہجد ادا فرماتے۔ علاوہ ازیں خلوق اوراد و اذکار بھی ختم کیے جاتے۔ اس کے بعد صبح کی نماز تک حجرہ شریف سے قرآن مجید تلاوت کرنے کی آواز آتی اور کسی کسی وقت ایک آہ جگردوز! جس کا اظہار ذیل کی رباعی سے ہوتا ہے۔ جو اکثر اوقات حضور کی زبانِ مبارک سے سننے میں آتی تھی ؎

در یادِ تو اے دوست چُناں مدہوشم
صد تیغ اگر بزنی سر نخروشم
آہے کہ بزعم بیادِ تو وقتِ سحر
گر ہر دو جہاں دہند واللہ! نفروشم




سہروردیوں پر تموّل اور چشتیوں
پر تنگدستی کا الزام

بعض مصنفین نے سہروردیوں پر تموّل اور چشتیوں پر تنگ دست ہونے کا الزام لگایا ہے۔ چنانچہ شمیم محمود زیدی صاحبہ لکھتی ہیں :-

"بخلاف پیروانِ مسلک چشتیہ، سہروردیہ مردمانِ پولدار و متموّل بودند، در حالیکہ صوفیانِ چشت امثال قطب الدین بختیار کاکی المتوفی ۶۳۳ھ۔ بابا فرید الدین گنج شکر المتوفی ۶۶۴ھ وغیرہ گاہی برای سیر کردن شکم وسائل کافی در دسترس نداشتند، و علاقہ ای چندان بہ پول و مال و منال نشان نمی دادند"[1]

حالانکہ اپنے گھوڑوں کو سونے کی میخوں سے چشتیوں نے باندھا ہے، سہروردیوں نے نہیں۔[2] (زیدی صاحبہ کا یہ الزام قطعاً غلط ہے کہ مشائخ چشت اسبابِ زیست کے لیے تنگ رہتے تھے)، یہ صورتِ حال ان کی خود اختیاری تھی، مجبوری کی نہ تھی۔

ایک دفعہ رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلّم نے صحابہ سے فرمایا کہ ایک درویش کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ خواہ تو دُنیا و ما فیہا کو پسند کر، خواہ عاقبت کو۔ درویش نے کہا جو کچھ میرے لیے آخرت میں تیار کیا گیا ہے میں اُسے پسند کرتا ہوں۔ جب حضورؐ نے ارشادِ گرامی ختم کیا تو امیر المؤمنین ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے رونا شروع کیا۔ صحابہ نے پُوچھا، کیا معاملہ ہے؟ فرمایا کہ جس درویش کا ذکر رسولِ خدا صلّے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے، وہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم ہیں۔[3]"

---

[1] "احوال و آثار" ص ۱۲

[2] سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے حضرت محبوب الٰہی قدس سرّہٗ کو طعنہ دیا تھا کہ دعویٰ درویشی کا کرتے ہو، مگر تمہاری دُنیاداری کا یہ عالم ہے کہ آپ کے گھوڑے سونے کی میخوں سے باندھے جاتے ہیں۔ (چشتی اولیا نامہ ص ۲۴۲ از خواجہ حسن نظامی دہلوی)

[3] فوائد الفواد ص ۹۷

حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے فرمایا کہ ایک درویش نے خضر علیہ السلام سے کہا کہ اگر ساری دُنیا بھی مجھے دے دیں اور کہیں کہ قبول کر لے، تجھ سے حساب نہیں لیا جائے گا اور ساتھ ہی یہ بھی کہیں کہ اگر قبول نہیں کرے گا تو تجھے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا، تو مَیں دوزخ قبول کر لوں گا، لیکن دُنیا قبول نہیں کروں گا۔

خضر علیہ السلام نے پُوچھا کیوں؟

کہا اس واسطے کہ دُنیا پر اللہ تعالٰی کی ناراضگی ہے۔ پس جس پر اللہ تعالٰی ناراض ہے، اُسے قبول کرنے کی نسبت مَیں دوزخ کو قبول کر لینا بہتر خیال کرتا ہوں[1]۔"

جب حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہٗ نے حضرت شیخ الہند اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کو خرقۂ خلافت مرحمت کیا، تو فرمایا کہ فقر، فاقہ، رنج و محنت، شادی و غم کا برابر جاننا، مصیبت پر صبر کرنا، غرباء اور فقراء کے ساتھ محبت رکھنا، مسکینوں اور درویشوں کے ساتھ محبت رکھنا، اہلِ دُنیا سے بچنا[2]۔"

گویا یہ چشتیوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ اُن کے پاس فقراء اور مساکین کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ روزانہ مسکینوں اور درویشوں پر ہزاروں روپے خرچ کرتے تھے، مگر خود روزہ سے رہتے تھے۔

حضرت شیخ الہند خواجہ معین الدین چشتی جو برِ صغیر پاک و ہند میں تمام چشتیوں کے شیخ الکل ہیں، انہوں نے ترکہ میں انگوروں میں باغ پایا تھا۔ مگر آپ نے نہ صرف باغ بلکہ مکانات وغیرہ بھی فروخت کر دیئے اور تمام قیمت فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی اور خود طلب الٰہی میں سمرقند کو چل دیئے[3]۔

اجمیر میں آپ دن کو روزے سے رہتے اور رات قیام میں گزرتی تھی۔ تین دنوں کے بعد روٹی کے خشک ٹکڑوں سے افطار کرتے۔ کپڑا نیا ہوتا یا پُرانا، اس میں پیوند ضرور لگاتے تھے۔

۱؎ فوائد الفواد ص ۶

۲؎ دلیل العارفین ص ط

۳؎ ہمارے خواجہ ص ۱۴

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ نے ستر برس تک شب کو خواب استراحت نہیں فرمائی۔ نیز فرماتے ہیں کہ میں بیس سال تک حضرت کی خدمت میں رہا ہوں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے اشارۃً بھی کسی کے سامنے کچھ احتیاج ظاہر کی ہو۔"[۱]

حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا استغناء

ایک مصنف[۲] نے حضرت کاکی علیہ الرحمۃ کی تنگ دستی کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ ان کے استغناء کا ذکر حضرت شیخ کبیر فرید الدین شکر گنج علیہ الرحمۃ کی زبان سے سنیئے۔ فرماتے ہیں :-

"ایک مرتبہ میں شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشیؒ کی خدمت میں حاضر تھا کہ سلطان شمس الدین التمش کا وزیر اعظم مع لشکر شاہی کے حاضر ہوا اور عرض کی کہ بادشاہ نے چھ گاؤں کی ملکیت اور کچھ چیز بطور نذر بھیجی ہے۔ آپ نے مسکرا کے فرمایا کہ اگر ہمارے خواجگان قبول کرتے، تو ہم بھی کر لیتے۔ اگر آج ہم ان کی متابعت نہ کریں تو قیامت کے دن انہیں کیا منہ دکھائیں گے؟ یہ پروانہ اور نذر نذور لے جاؤ، کیونکہ اس کے طالب اور بہت ہیں جو کلاہ پوش ہیں۔"[۳]

فقراء را بہ جاگیر چہ کار؟

حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء راحت القلوب میں لکھتے ہیں کہ اجودھن کے حاکم نے اپنے ملازم کے ہاتھوں دو گاؤں کا حکمنامہ اور بائیس بوریاں نقدی کی حضرت شیخ کبیر فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمۃ کی خدمت میں بھجوائیں۔ جب یہ لوگ پہنچے تو آپ نے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گئے اور وہ مال وغیرہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا :-

"میں نے شروع سے اب تک اس قسم کا مال کسی سے قبول نہیں کیا اور نہ ہی ہمارے خواجگان کی یہ رسم ہے۔ اسے واپس لے جاؤ۔ کیونکہ اس کے طالب اور بہت ہیں انہیں دیدو۔"[۴]

---

[۱] دلیل العارفین ص ۲۷   [۲] ڈاکٹر شمیم محمود زیدی صاحبہ

[۳]، [۴]۔ راحت القلوب اردو ترجمہ ص ۳۰۔

حضرت محبوب الٰہی دہلویؒ مزید فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کے حسب حال یہ حکایت بیان فرمائی :-

ایک مرتبہ سلطان ناصرالدین محمود نے اپنے سپہ سالار غیاث الدین بلبن کے ہاتھ جو ملتان کی طرف آرہے تھے ، چار گاؤں کی ملکیت کا حکمنامہ اور کچھ نقدی بطور نیاز میرے پاس بھیجی ۔ جن میں سے چاروں گاؤں میرے لیے اور نقدی درویشوں کے لیے تھی ۔

میں نے مسکرا کر کہا کہ اسے لے جاؤ ، اس کے طالب اور بہت ہیں ، انہیں دو ، ہمارے خواجگان اور مشائخ نے اس قسم کی چیزیں قبول نہیں فرمائیں ۔

پھر آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اگر ہم اس قسم کی چیزیں لیں ، تو ہمیں درویش نہیں کہیں گے ، بلکہ مالدار کہیں گے اور کہیں گے کہ یہ گاؤں کا مالک ہے ۔ پھر یہ منہ درویشوں کو کس طرح دکھائیں گے اور ان میں کس طرح کھڑے ہوں گے ۔ اسے لے جاؤ اور دوسروں کو دے دو ۔"[1]

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ آدمی کی کمالیت ، کم کھانے کم سونے ، کم بولنے اور خلقت سے کم میل جول رکھنے میں ہے ۔[2]

ایک اور موقعہ پر فرمایا :

- " جو درویش مخلوق کو دکھانے کے لیے عمدہ لباس پہنتا ہے ، وہ درویش نہیں ، بلکہ راہِ سلوک کا راہزن ہے ۔"
- اور جو درویش نفس کی خواہش کے مطابق عمدہ کھانا پیٹ بھر کر کھائے ، وہ راہِ سلوک میں دروغ گو ، جھوٹا مدعی اور خود پرست ہے ۔
- جو درویش دولتمندوں کی ہم نشینی کرتا ہے ، وہ طریقت کا مرتد ہے ۔
- اور جو درویش نفسانی خواہش کے مطابق خوب جی بھر کر سوتا ہے جان لو کہ نعمت سرمدی سے محروم ہے ۔"[3]

---

۱ راحت القلوب اردو ترجمہ ص ۱۰ ۔ ۲ فوائد السالکین ، ص ۲

۳ فوائد السالکین ص ۳ ۔

باایں ہمہ چشتیوں کے ہاں بڑے پیمانے پر لنگر خانے جاری تھے

بلاشبہ چشتی حضرات خود تو روزہ سے رہتے اور اپنے لیے کسی سے کچھ قبول نہ کرتے تھے، مگر درویشوں اور مسکینوں کے لیے اُن کے ہاں وسیع پیمانے پر لنگر جاری تھے۔ حضرت شیخ اللہ علیہ رحمۃ کے جانشین حضرت خواجہ قطب الدین علیہ الرحمۃ کا بیان ہے :-

حضرت خواجہ غریب نواز کا باورچی خانہ جب سرد ہوتا اور خادم آکر عرض کرتا تو آپ جانماز اُلٹ دیتے اور خادم سے فرماتے جس قدر آج اور کل کے لیے کفایت کرے لے لے، وہ اُسی قدر اُٹھا لیتا۔

اور جب کوئی حاجت مند یا غریب آتا تو جانماز کے نیچے سے اپنی مراد حاصل کرتا تھا۔[1]

حضرت خواجہ قطب الاسلامؒ شہنشاہِ ہند سلطان شمس الدین التمش کے مرشدِ طریقت تھے۔ انہیں کس بات کی پرواہ تھی۔ سینکڑوں امراء، وزراء اور رؤساء حاضر ہو کر نذریں پیش کرتے۔ اس طرح ہزاروں درہم و دینار جمع ہو جاتے، مگر حضور ایک ہی نشست میں مساکین اور فقراء میں بانٹ دیتے۔

اس داد و دہش کے علاوہ آپ کا عظیم الشان لنگر خانہ تھا۔ جس سے دہلی کے فقراء اور مساکین قوت لایموت حاصل کرتے تھے۔ حضرت شیخ کبیر فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ وہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمومی لنگر کے علاوہ حضور کے ذاتی دسترخوان سے بھی اکابر علماء اور مشائخ کی ایک جماعت استفادہ کرتی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

"ایک دفعہ مجلس گرم تھی اور حضرت قطب الاسلامؒ خواجہ حمید الدین ہورنی کا ذکر کر رہے تھے کہ طعام لایا گیا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ اور تمام درویش کھانے میں مشغول ہو گئے۔ کھانا کھانے کے بعد حضرت نے شیخ نظام الدین ابوالموید سے فرمایا کہ درویش لوگ جو کھانا کھاتے ہیں تو صرف اس

---

[1] دلیل العارفین، ص ح

غرض سے کھاتے ہیں کہ ان میں عبادت کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے، اس لیے ان کا کھانا، کھانا بھی داخلِ عبادت ہے۔"[1]

اجودھن کا مہمان خانہ

حضرت شیخ کبیر الدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ کے لنگر خانے کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ آپ نے اپنے بھانجے مخدوم علی احمد صابرؒ کو لنگر خانے کا مہتمم بنایا تھا، لیکن خود روزے سے رہا کرتے تھے اور مخدوم صابرؒ بھی دُبلے اور کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ جب حضرت مخدوم کی والدہ ماجدہ ہرات کے سفر سے واپس آئیں اور انہوں نے اپنے نور العین کو اس قدر لاغر پایا، تو حیران رہ گئیں۔ حضرت شیخ کبیر سے عرض کیا، میرے بیٹے کا یہ کیا حال ہو گیا ہے؟ کیا تیرے ہاں اس یتیم کے لیے دو ٹکڑے بھی نہیں تھے؟ حضرت شیخ کبیر نے فرمایا کہ میں نے تو برخوردار کو لنگر خانے کا مہتمم بنا رکھا ہے تمام مسافروں، مسکینوں اور درویشوں کو یہی کھانا تقسیم کرتا ہے۔ حضرت مخدوم صابر رحمۃ اللہ علیہ فوراً عرض گزار ہوئے:

"قبلہ عالم! آپ نے لنگر تقسیم کرنے کا حکم دیا ہے نہ کہ کھانے کا، میں نے تو اس سے آج تک ایک قلچہ بھی لے کر نہیں کھایا۔"

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت کے ہاں بڑے پیمانے پر لنگر جاری تھا۔ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کے تذکرہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب آپ حضرت شیخ کبیر علیہ الرحمتہ سے ملنے اجودھن جاتے تھے، تو آپ کے آرام و آسائش کا انتظام شیخ جمال ہانسویؒ کے ذمہ ہوتا تھا۔"[2]

حضرت شیخ کبیر قدس سرہٗ کا یہ ارشاد مطالعہ کرنے کے بعد کوئی شخص آپ پر فقر و تنگ دستی کا حکم لگا سکتا ہے۔ راحت القلوب کے صفحہ ۷۸ پر حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء لکھتے ہیں:

ایک دفعہ سرکار نے فرمایا کہ میرے پاس اس قدر فتوح آتی ہیں کہ اگر انہیں جمع کر دوں تو خزانے بھر جائیں، لیکن جو کچھ آتا ہے، راہِ خدا میں صرف کر دیتا ہوں۔

---

[1] فوائد السالکین ص ۲۰

[2] ڈاکٹر شمیم محمود زیدی: احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، ص ۲۱۲، بحوالہ خلاصۃ العارفین

حضرت محبوب الٰہیؒ کا مشہورِ عالم لنگر

ایک مرتبہ حضرت محبوب الٰہی کی کسی خدمت سے خوش ہو کر حضرت شیخ کبیر رحمتہ اللہ علیہ نے دُعا کی تھی :

"اگر خدا خواہد۔ در مطبخ شما ہر روز دو من نمک خواہد پخت" !

فارسی کا من آدھے سیر کے برابر ہوتا ہے، اس لیے حضور کے فرمان کا ترجمہ یہ ہوگا :

"اگر خُدا نے چاہا، تیرے مطبخ میں ۳۵ سیر نمک روزانہ خرچ ہو گا"

اور دُنیا نے دیکھا کہ بدایون کا یتیم جو دہلی میں ایک طالب علم کی حیثیت سے وارد ہوا تھا مسندِ ارشاد پر فائز ہونے کے بعد اس قدر مرجع خلائق بنا کہ ہزاروں اُمراء اور رُؤسا اس کے قدموں میں پڑے رہتے تھے۔ آپ کے دستر خوان پر اتنے اعلیٰ کھانے چُنے جاتے تھے کہ بادشاہوں کو نصیب نہیں ہوتے تھے۔ اُمرائے سلطنت، بلکہ سلطان محمد تغلق بھی حضرت کے آستان پر حاضر ہو کر اس دستر خوان سے بہرہ مند ہوتا تھا۔

قطب الدین مبارک شاہ کے زمانے میں آپ کی داد و دہش اس قدر بڑھی کہ وہ آپ سے خطرہ محسوس کرنے لگا۔ ایک دفعہ لکھا کہ شیخ تارکِ دُنیا ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں، مگر معلوم ہوا ہے کہ اُن کے گھوڑے سونے کی میخوں سے باندھے جاتے ہیں، اس کا معقول جواب دیں ورنہ دہلی سے چلے جائیں۔

آپ نے اس خط کی پیشانی پر لکھوایا !

کجا انداختم در دل مگر انداختم در گل
کہ اسپانِ ما براد قادورہ مے کنند

یعنی میں نے سونے کی میخیں دل میں تو نہیں گاڑیں، مٹی[1] میں گاڑی ہیں اور میرے گھوڑے اس پر

---

[1] چشتی اولیاء نامہ ص ۲۳۲۔ از مفکرِ فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

پیشاب کرتے ہیں "۔

یہ صحیح ہے کہ جس جوادِ اعظم کے دستر خوان پر سلاطین سے مساکین تک ہزاروں کی تعداد میں روزانہ قسم قسم کے لذیذ کھانے کھاتے تھے۔ خود روزہ سے رہتا اور شام کو ایک ٹکیہ سے افطار کرتا تھا، لیکن اگر کوئی مہمان عزیز آجاتا، تو اس کے ساتھ مکلف طعام بھی کھا لیتے تھے۔ ایک دفعہ جب حضرت قطب الاقطاب شاہ رکن عالم قدس سرہٗ آپ سے ملنے آئے تو حضرت نے اپنے خادمِ خاص خواجہ اقبال کو اشارہ کیا، کھانا لاؤ اور نذر پیش کرو۔ اقبال فوراً لنگر خانے میں چلے گئے اور کھانے کا خوان لے آئے اور حضرت قطب الاقطاب کے سامنے کھانا چُنا گیا اور انہوں نے اپنے رفیقوں کے ساتھ کچھ تناول فرمایا۔ اس کے بعد خواجہ اقبال نے ایک باریک کپڑے میں سو اشرفیاں باندھ کر حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے قطب الاقطاب کے آگے رکھ دیں۔

اس موقعہ پر عجیب لطیفہ ہُوا۔ اشرفیوں کی زردی اور چمک کپڑے سے باہر نظر آرہی تھی حضرت قطب الاقطاب نے اس کو دیکھ کر تبسم فرمایا اور ارشاد کیا:

یَا مَوْلَانَا اسْتُرْ ذَهَبَكَ (اپنی دولت کو چھپاؤ)

جواب میں حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا:

بَلْ مَذْهَبَكَ وَذِهَابَكَ (بلکہ اپنے رستے اور سفر کو بھی چھپاؤ)

اگر چشتی حضرات کی گذر اوقات تنگ دستی سے ہوتی تھی، تو پھر اتنا وسیع لنگر اور اشرفیوں کی نذر کیا معنی رکھتی ہے؟

اور سُنیئے:

حضرت محبوب الٰہیؒ نے وفات سے کچھ دیر پہلے جو کچھ لنگر میں تھا، وہ سب غریبوں اور مسکینوں کو تقسیم کرا دیا۔ دُوسرے دن خواجہ اقبال سے فرمایا "کوئی چیز باقی نہ رکھو، سب لٹا دو۔ ورنہ سب ذمہ داری تم پر عائد ہو گی "۔

پھر سید حسین کرمانیؒ سے ارشاد کیا، تم جاؤ اور جا کر دیکھو کہ اقبال نے سب کچھ لٹا دیا ہے یا کچھ باقی ہے؟ سید حسین کرمانیؒ نے عرض کیا۔ اقبال نے حضرت کے حکم کی پُوری تعمیل کی ہے، صرف انبار خانوں میں غلہ باقی ہے، جو درویشوں کی خوراک کے لیے بچا کر رکھا ہے۔ یہ جواب سُن کر حضرت

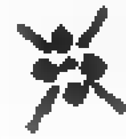
برہم ہوئے اور فرمایا۔ انبار خانوں کے دروازے توڑ ڈالو اور زمین کی اس ریت (غلے) کو لٹا دو۔ چنانچہ اطراف کے فقراء اور مسکینوں کو خبر دی گئی اور وہ بکثرت جمع ہو گئے۔ کرمانی صاحب نے انبار خانوں کے دروازے کھول دیئے۔ فقیروں نے سب کچھ لوٹ لیا[1]۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت محبوب الہیٰ کے ہاں درویشوں، مسکینوں اور مہمانوں کے لیے شاہانہ انتظام تھا۔ لنگر خانے میں ایسے عمدہ اور اعلیٰ کھانے پکتے تھے کہ سلاطین اور امراء کو بھی نصیب نہیں ہوتے تھے۔ لنگر کے لیے اجناس کے ذخائر، انبار خانوں میں مقفل تھے چار پائیوں، بستروں اور برتنوں کا معقول انتظام تھا۔ اس کے باوجود لاکھوں کا اَن داتا خود روزہ سے رہتا تھا۔ اس کیفیت کو فقر و فاقہ اور تنگ دستی کا نام دینا کہاں مناسب ہے؟

مولانا فخر الدین دہلویؒ، قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی، حافظ محمد جمال اللہ، قاضی محمد عاقل، اور خواجہ محمد سلیمان تونسوی (رحمہم اللہ علیہ) ان سب کے ہاں دونوں وقت مسکینوں اور درویشوں کو کھانا ملتا تھا اور خود علما اور مشائخ کے ساتھ ایک ہی دستر خوان پر ماحضر تناول کرتے تھے۔

حضرت خواجہ غلام فرید (چاچڑاں شریف) کے مطبخ میں روزانہ ½ ۱۲ من آٹا پکتا تھا اور حضرت نے اپنی زندگی میں اسّی لاکھ روپے[2] فقراء اور مساکین میں تقسیم کئے تھے۔ خدام کو ہدایت تھی کہ نذر و نیاز کی رقمیں صبح کو پیش کی جایا کریں تاکہ ظہر تک تمام رقم ٹھکانے لگ جائے اور ہم دامن جھاڑ کر نماز کے لیے مسجد میں جائیں۔ کیا ایسے گنج بخش اولیائے کاملین کے بارے میں یہ کہنا موزوں ہے کہ:-[3]

"گاہی برای سیر کردن شکم وسائل کافی در دسترس نداشتند"



[1] "تذکرہ شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ" ص ۱۸۳

[2] ملفوظ حضرت نازک کریم، ص ۷

[3] "احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ" ص ۱۲

سہروردیوں کا جُود و سخا

سہروردیوں کے شیخ الکل حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی علیہ الرحمۃ ہیں ان کو "احوال و آثار" کے مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ مالدار ہونا چاہیئے۔ ان کی بابت حضرت شیخ العالم فرید الدین گنج شکر علیہ الرحمۃ کا مشاہدہ ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اس دُعا گو نے شیخ شہاب الدین سہروردی کی زیارت کی ہے اور چند روز آپ کی خدمت میں بسر کئے ہیں۔ اس عرصے میں تقریباً چھ ہزار دینار ہر روز آپ کی خانقاہ میں بطورِ نذر آتے اور سب راہِ خدا میں صرف کئے جاتے اور رات کو ایک پیسہ بھی نہ بچاتے۔ ساتھ ہی یہ فرماتے تھے کہ اگر میں کچھ بچاؤں تو لوگ مجھے درویش نہیں کہیں گے بلکہ کہیں گے کہ یہ درویش مالدار ہے[1]"

خدا کی شان! باوجود اس احتیاط کے لوگوں نے آپ کو "مردانِ پولدار" و "متموّل" میں شامل کر ہی دیا[2]۔

شیخ الشیوخ کے مُریدوں میں حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ خصوصی شہرت کے مالک ہیں، سیلانی بزرگ تھے۔ ساری عمر "سیروا فی الارض" کی نذر ہوئی۔ ایک جگہ میزبان نے کھانے میں جو ذرا تکلف برتا، تو آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا "ہائے دعوتِ شیراز"

آپ ہی "گلستان" میں لکھتے ہیں!

"جُوتی پھٹ گئی تھی، نئی جُوتی خریدنے کے لیے پیسہ پیسہ جمع کیا اور جُوتا خریدنے کے لیے روانہ ہوئے، مگر جب ایک مسجد سے نماز پڑھ کر نکلا تو اچانک ایسا درویش نظر پڑا، جس کے پاؤں ہی نہیں تھے، میں نے وہ رقم اسکے حوالے کر دی کہ جُوتی نہیں تو کیا ہوا، پاؤں تو ہیں۔"

---

[1] "راحت القلوب" ص ۶

[2] "احوال و آثار شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی"

ترکِ دُنیا کے بارے میں حضرت محبوبِ الٰہی کا نظریہ

ترکِ دُنیا کے بارے میں اولیائے کرام کے نظریات ملاحظہ ہوں۔ حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

"ترکِ دُنیا سے یہ مراد نہیں کہ انسان اپنے تئیں ننگا رکھے اور لنگوٹا باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ ترکِ دُنیا کا مفہوم یہ ہے کہ انسان لباس بھی پہنے اور کھائے بھی، لیکن جو کچھ اُسے ملے، اس کی طرف راغب نہ ہو اور نہ اس سے دل لگائے۔"[1]

جو لوگ حضرت شیخ الاسلام کے تموّل پر طنز کرتے ہیں، وہ آپ کے منصب سے واقف نہیں۔ حضور اپنے دور کے شیخ کامل تھے اور شیخ کامل کا ہر فعل شریعت کے تابع ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخ شریعت کے تقاضے کو پورا کیا اور روپے پیسے کو صحیح مصرف پر خرچ کیا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، دارالعلوم کے ساتھ ایک دارالاقامہ طلباء کے لیے تھا، ایک علماء اور مشائخ کے لیے۔ ان کے علاوہ ایک سرائے تھی۔ جس میں آ کر مسافر ٹھہرتے تھے۔ ان سب کو ان کی حیثیت کے مطابق کھانا دیا جاتا تھا۔ صبح سویرے حضرت سرائے میں تشریف لے جاتے اور مسافروں سے تبادلۂ خیال فرماتے۔ اسی تاریخی سرائے میں قلندروں کے ہمراہ مولانا عراقی آئے۔ اسی سرائے میں حضرت کی پکار گونجی۔ میر حسینی گیسٹ، اسی طرح ہر دو رسالکین کی جماعت ملتان پہنچی اور سرائے میں قیام کر کے حضرت کے فیضان سے بہرہ ور ہوتی۔

سرائے کے پہلو میں ایک محتاج خانہ تھا، جس میں لولے، لنگڑے اور آنکھوں سے معذور لوگ رہتے تھے۔ ان کی غور و پرداخت پر حضور سب سے زیادہ توجہ دیتے تھے۔ حضرت سید جلال بخاریؒ کی روایت کے بموجب حضور کے ملازمین، طلباء اور حجرہ نشینوں کے علاوہ جو لوگ آ کر حضرت کے ہاں قیام کرتے تھے، ان کی تعداد روزانہ سات سو سے ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔

---

[1] فوائد الفواد ۹ ص

حضور کا شمار اغنیاتِ شاکر میں ہوتا ہے۔ جیسے انبیاء علیہم السلام میں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کا مقام ہے اور انہیں بادشاہ کہنا سوءِ ادبی ہے یا جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کو اللہ کریم نے دین اور دُنیا کی تمام نعمتوں سے نوازا تھا۔ کثیر الاولاد تھے۔ عالی شان محلات میں رہتے تھے، جانوروں کے گلّے اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی انتہا نہ تھی۔ ایک روایت کے بموجب اُن کے کتّوں کو بھی سُنہری زنجیروں سے باندھا جاتا تھا، اس کے باوجود کوئی اُنہیں مالدار نہیں کہتا۔ اسی لیے مرشدِ رومیؒ نے فرمایا ہے۔ ؏

چیست دُنیا از خدا غافل بدن

بایں ہمہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے سوا سُہروردیوں میں ایسا کون ہے، جس پر پولدار کا اطلاق ہو سکے۔ حضرت شیخ الاسلام صدرالدین عارف کو ترکہ میں ستر ہزار اشرفی ملی تھی۔ تین دنوں میں محتاجوں اور درویشوں میں بانٹ کر فارغ ہو گئے۔ زندگی بھر مقروض رہے۔ حضرت شاہ رکن عالم کو دہلی جانے پر لاکھوں اشرفیاں شہنشاہ کی طرف سے نذر کی جاتی تھیں۔ حضور وہ تمام خزانہ دہلی کے محتاجوں اور مسکینوں میں بانٹ کر خالی ہاتھ واپس آتے تھے۔

سلطان محمد تغلق ملتان آیا، اُس نے آپ کو سو دیہات نذر کیے۔ لیکن حضور نے یہ تمام اراضی اپنے مُریدوں، جوبہ اور پوستوں میں بانٹ دی، ایک مرلہ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ سلطان نے اپنے والد کا تعمیر کردہ مقبرہ نذر کیا، تو آپ نے مدرسہ کو دے دیا۔

سلطان حمیدالدین حاکم سہروردی کیچ مکران کے بادشاہ تھے۔ تخت و تاج چھوڑ درویشی اختیار کر لی اور حضرت شاہ رکن عالم کے مُرید ہوئے۔ شیخ احمد ملتان کے بہت بڑے سوداگر تھے۔ حضرت عارف باللہ کے مُرید ہوئے تو تمام مال و اسباب منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد اللہ کے نام بانٹ دی، حتیٰ کہ لنگوٹی باندھ لی اور کپڑے بھی اُتار دیئے[1]۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت بخاری قدس سرہ کے ہاں دن کو جو کچھ آتا، سب درویشوں میں بانٹ دیتے۔ رات کو سوتے وقت پانی سے گھڑوں کو بھی خالی کر دیتے۔ تفرید و تجرید کی اس

---

[1] خزینۃ الاصفیاء جلد دوم، ص ۵

سے روشن مثال اور کیا ہو سکتی ہے ؟

ملک محمد اختیار گجرات کے وزیر اعظم تھے، سہروردی سلسلے میں بیعت ہوئے تو وزارت سے مستعفی ہو گئے اور زندگی بھر کا سرمایہ لٹوا دیا۔ امیرانہ کپڑے اُتار پھینکے۔ فقیروں جیسے میلے کچیلے کپڑے پہنے اور ریش و بروت بلکہ سر کے بال بھی منڈوا دیئے کہ یہ وزارت کی دنوں کے پیداوار ہیں اور انہیں بھی نہیں رہنا چاہیئے۔[1]

ملک عبدالطیف سلطان محمود مکڑہ کے سپہ سالار ایک مہم سے واپس آ رہے تھے، تھکے ہوئے تھے، ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ فوجوں نے گھوڑے کھیت میں چھوڑ دیئے۔ دوسرے گھوڑے چرتے رہے، لیکن ملک عبدالطیف کا گھوڑا خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ آپ جب اُٹھے تو انہوں نے چارہ قیمتاً خرید کر گھوڑے کو کھلایا۔[2]

خواجہ حسام الدین متقی خود ہل چلا کر روزی پیدا کرتے اور طلباء و درویشوں کو کھلاتے تھے۔ ان سے خدمت لینا گناہ جانتے تھے۔[3] اسی طرح اگر پورے سلسلے کا جائزہ لیا جائے، تو معدودے چند بزرگوں کے سوا باقی سارے چشتی حضرات کی طرح خالی ہاتھ نظر آتے ہیں۔ بایں ہمہ خداوندِ عالم نے انہیں تمام خزائن پر دسترس عنایت کر رکھی تھی (اس لیے) کسی اہل اللہ پر متموّل یا تنگدست ہونے کی پھبتی کسنا۔ ان کے احوال سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

شیخ الاسلامؒ کی روحانیت کا ملک کی معاشرت پر اثر

حضرت شیخ الاسلامؒ کی آمد سے قبل مُلتان کی اخلاقی و سماجی حالت انتہائی پست تھی۔ دفتروں میں رشوتیں چلتی تھیں۔ بازار کا لین دین صحیح نہیں تھا۔ نہ چیزیں اچھی ملتیں اور نہ نرخ مناسب۔

---

[1] تحفتہ الکرام، جلد اوّل، ص ۵۸، ص ۵۹۔

[2] تذکرہ شاہ رکن عالم ملتانی ص ۵۹۲ [3] شیخ حسام الدین متقی ص ۲۱۳

ملازم، مزدور بھی مُنہ مانگی مزدوری مانگتے تھے۔ دیانت، رُخصت اور خیانت کا بازار گرم تھا۔ راہزنی اور ڈکیتی آئے دن کا معمول بن چکا تھا۔ لوگ قافلوں کی صورتوں میں چلتے، مگر پھر بھی لوٹ لیے جاتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے ان تمام خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے سب سے پہلے لوگوں کے دلوں میں خدا خوفی کا جذبہ پیدا کیا۔ اس کے بعد ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے پوچھتے کہ تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ حلال کھانے کی ترغیب دیتے اور فرماتے کہ اگر تم اپنے اپنے فرائض کو نیک نیتی اور دیانت داری سے انجام دو گے، تو تمہاری کمائی میں برکت ہو گی اور آخرت میں اللہ کریم بہشت عطا کریں گے۔

خاکسار کو ایک قلمی رسالہ ملا ہے جو شیخ الاسلامؒ کے کسی مُرید کا لکھا ہوا ہے۔ اس کا نام کسب نامہ ہے۔ یہ فارسی زبان میں ہے اور اس میں حجام، ترکھان، دھوبی، جولاہوں اور دکانداروں کے بارے میں ہدایات درج ہیں۔

حجام کا ذکر سب سے پہلے ہے۔ اس میں پہلے حجامت کے اوزاروں کا ذکر درج ہے کہ یہ کیونکر اور کس طرح اُتارے گئے۔ پھر حجام کے لیے چند دُعائیں درج ہیں کہ بجائے بے ہودہ باتیں کرتے کے حجامت کے دوران یہ دُعائیں پڑھے۔ اُسترے اٹھانے اور استعمال کرنے کی دُعا اور ہے اور قینچی چلانے کی دُعا اور ہے۔

اسی طرح دھوبی کے لیے کپڑوں کے اُٹھانے، لکڑی کے پھٹے پر دھونے، سُکھانے، لپیٹنے کی الگ الگ دُعائیں ہیں اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی ہے کہ اگر تم عمداً کپڑا پھاڑو گے یا بے پرواہی کرو گے، تو تمہارا حشر قیامت کے دن یہودیوں کے ہمراہ ہو گا۔ اسی طرح جولاہوں کے لیے جنہیں نوربافت کہتے تھے، ہدایات دی گئی ہیں۔

آج عورتیں چکی پیسنے بیٹھتی ہیں، تو دُنیا جہان کے تمام جھوٹ ایک دُوسری کو سُناتی ہیں، مگر آپ پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ شیخ الاسلامؒ کی نوکرانیاں چکی پیسنے بیٹھتیں تو قرآن ختم کر کے اُٹھتی تھیں۔ اسی طرح دوکان داروں نے ڈنڈی مارنی چھوڑ دی تھی۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں پر بھی خوشگوار اثر پڑا۔ اُنہوں نے لین دین میں فریب اور دھوکے سے کام لینا ترک کر دیا۔ چیزیں اصلی اور عمدہ ملنے لگیں۔ پہلے ملازم چاکر اپنے مالکوں کی چیزیں اُڑا لیتے تھے۔ کام

نیک نیتی سے نہیں کرتے تھے۔ اب سب ہوشیار ہو گئے اور کیا مجال کہ مالک کا سونا پڑا ہو، تو کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔ راستے محفوظ ہو گئے۔ چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں ختم ہو گئیں۔ وہی قزاق اور راہزن جو پہلے مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے، اب سایہ دار درختوں کے تلے پانی کے مٹکے بھر کر رکھتے تاکہ آنے جانے والے اپنی پیاس بجھائیں۔ اگر کہیں راستے میں دفعتاً ڈاکوؤں سے واسطہ پڑ جاتا، تو مسافر حضرت شیخ الاسلامؒ کے نام کی دُہائی دیتے، تو ڈاکو بھاگ جاتے۔ مولانا جمالی سیر العارفین میں لکھتے ہیں کہ شیخ عبداللہ قوال اجودھن سے ملتان جا رہا تھا۔ راستے میں راہزن ننگی تلواریں ہاتھ میں لیے للکارتے ہوئے آپہنچے۔ اس نے گھبرا کر شیخ الاسلام کو پکارا۔ راہزن اُسی وقت ڈر کر بھاگ گئے اور یہ شخص صحیح سلامت ملتان پہنچ گیا۔ جب حضرت کے قدم بوس ہوا، تو حضرت شیخ الاسلامؒ نے از خود دریافت فرمایا کہ ڈاکوؤں سے کیسے چھٹکارا پایا[1]۔

اسی طرح جب سامانِ تجارت سے لدا ہوا جہاز غرق ہونے لگا تو خواجہ کمال الدین رئیس التجار نے گھبرا کر کہا:

یا پیر دستگیر المدد! المدد!

اس پر حضرت شیخ الاسلامؒ فوراً تختۂ جہاز پر نمودار ہوئے اور اہلِ جہاز کو تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں، خیر ہے۔ چنانچہ جہاز بھنور سے بخیریت نکل گیا۔ چنانچہ اب تک برِصغیر کے ملاحوں میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ جب کشتی کہیں بھنور میں پھنس جاتی ہے، تو وہ "مدد! بہاء الحق" کا نعرہ لگاتے ہیں، خدا کے فضل وکرم سے وہ خطرہ ٹل جاتا ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت کے چند مُرید ملتان آرہے تھے۔ راستے میں ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں آپھنسے، جہاں انہیں پانچ روز تک پانی نہ ملا۔ پیاس سے سخت بدحواس ہوئے، قریب تھا کہ ہلاک ہو جائیں، موت و حیات کی اسی کش مکش کے اندر انہوں نے شیخ الاسلامؒ کا نام لے کر پکارا۔ اسی اثنا میں ایک درویش نمودار ہوا اور انہیں کوزہ سے پانی پلا کر چلا گیا۔ انہیں شیخ الاسلامؒ کی زیارت کا پہلے اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب ملتان پہنچے تو دیکھا کہ جس درویش نے

---

[1] "سیر العارفین" از مولانا جمالی، ص ۲۲

لق و دق صحرا میں پانی پلایا تھا، وہی شیخ الاسلامؒ کے نام سے مسندِ ارشاد پر بیٹھا، خلقِ خدا کو صراط المستقیم پر گامزن کر رہا ہے۔ بے اختیار اپنی ٹوپیاں اُتار کر حضور کے قدموں میں ڈال دیں۔ غرض اس قسم کے روحانی تصرفات دیکھ کر عوام حضرت کے گرویدہ ہو گئے تھے اور ان کے دلوں سے نفسانیت کی میل کچیل دُھل گئی تھی۔ اُمراء سے غرباء تک حجام، جولاہے، ترکھان، دوکاندار اور ملازمین تک سب اپنے اپنے فرائض کا اچھی طرح سے احساس کرنے لگے تھے اور اخلاقی معاشرتی اور جنسی کمزوریاں ایک ایک کر کے رُخصت ہو گئی تھیں اور ملتان خیر و برکت کا شہر بن گیا تھا۔ اسی لیے ایک موقعہ پر بے اختیار حضرت کی زبان سے نکل گیا:

ملتانِ ما بجنتِ اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہ کہ ملک سجدہ مے کنند

مکتب سہروردیہ کا تعارف

"احوال و آثار" کے مقالہ نگار نے فرقہ سہروردیہ کا تعارف اس طرح سے کرایا ہے:

"در قرن ہفتم و ہشتم ہجری دو مکتب بزرگ در تصوف اسلامی ایرانی بوجود آمد، اوّل مکتب مولوی کہ سراسر وجد و سماع و قول و ترانہ بود و دوم مکتب "سہروردی" کہ سراسر زہد و عبادت و مجاہدہ و مداومت در آداب و سنن و اوراد و اذکار و رعایت فرائض بود[1]۔"

عبارت بالا میں لفظ تصوف اسلامی ایرانی، مکتب مولوی اور پھر "سراسر" قابلِ غور ہیں۔ پہلے تو ہمیں لفظ "ایرانی" سے تعجب ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق ہر مُلک کا تصوف جُداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اب تک تصوف سلاسل سے پہچانا جاتا تھا۔ یعنی سلسلۂ قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور سہروردیہ وغیرہ۔ اب مقالہ نگار نے اوطان کی زنجیر بھی ڈال دی ہے۔ یعنی عربی تصوف، ایرانی تصوف، ہندی تصوف، مصری تصوف وغیرہ۔

پھر مکتبِ مولوی" اور سراسر" سے عجیب نکتے پیدا کیے ہیں۔ یعنی حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ

---

[1] مقالہ "احوال و آثار" شیخ بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ ص ۸

کا مکتب سراسر وجد و سماع اور مکتب "سہروردی" سراسر زہد و عبادت تھا، مبالغے کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ ایک عالمِ دین اور ولی اللہ کے مکتبِ فکر سے کیا زیادتی ہو سکتی ہے کہ اُسے ہمہ وقت ڈھوم ڈھاڑیوں کی طرح دھنک دھنیا میں مصروف دکھایا جائے "مکتب" کی شکایت شیخ المکتب کی شکایت ہے۔ مولانا کے قول و عمل کی سب کی موثق شہادت ان کی مثنوی ہے۔ کیا اس کی کسی حکایت سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آپ ہر وقت وجد و سماع میں غرق رہتے تھے۔

مولانا کے اہلِ مکتب شمس الدین ایکی، شرف الدین موصلی، شیخ سعید فرغانی، حضرت سلطان ولد، حسام الدین چلپی اور مولانا صدرالدین جیسے فخرِ روزگار علماء تھے۔ جن کا کوئی قول و فعل شریعت کے خلاف نہیں تھا اور حضرت شیخ صدرالدین کا کہنا یہ تھا:

"اگر بایزید بسطامی اس زمانے میں ہوتے تو وہ حضرت مولانا کی غاشیہ برداری پر ناز کرتے[1]"

اب آپ کی وصیت پر توجہ فرمائیے، جب آپ دارِ فانی سے ملکِ بقاء کو تشریف لے جانے کی تیاری میں تھے، تو اپنے ارادت مندوں کو بلا کر فرمایا:

اوصیکم بتقوی اللہ فی السر والعلانیۃ وبقلۃ الطعام وقلۃ المنام وقلۃ الکلام وھجران المعاصی والآثام ومواظبۃ الصیام ودوام القیام وترک الشھوات علی الدوام واحتمال الجفاء من جمیع الانام وترک مجالسۃ السفھاء والعوام ومصاحبۃ الصالحین والکرام وان خیر الناس من ینفع الناس وخیر الکلام ما قل ودل والحمد للہ وحدہٗ[2]۔

"یعنی اے دوستو! مَیں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ خدا سے ظاہر اور باطن میں ڈرتے رہو، تھوڑا کھاؤ، تھوڑی نیند کرو، تھوڑی باتیں کرو، گناہ چھوڑ دو، ہمیشہ روزہ

---

[1]، [2] نفحات الانس اردو از مولانا عبدالرحمٰن جامی ص ۴۹۲، ص ۴۹۳

رکھا کرو اور رات کو مصلّی پر قیام میں گزارو۔ جنسی خواہشات کو ذہن سے نکال دو۔ مظالم برداشت کرو اور اُف تک نہ کرو۔ عوام سے بالعموم اور بدکار لوگوں سے بالخصوص میل جول ترک کر دو۔ نیک بختوں اور بزرگوں سے صحبت رکھو۔ اچھا شخص وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے اور اچھی بات وہ ہے جو مختصر اور بامعنی ہو اور تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جو وحدہٗ لاشریک ہے۔"

اب ناظرینِ کرام ہی بتائیں کہ کیا حضرت مولانا کے اس آخری وصیت نامے میں جو اُن کے مکتبِ فکر کے دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے، کہیں طبلے کھڑکانے اور اس کی تھاپ پر رقص کرنے کا اشارہ ملتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر کسی کو یہ الزام تراشنے کا حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ "مکتب مولوی سراسر وجد و سماع و قول و ترانہ بود"

بلاشبہ حضرت مولانا سماع سُننے اور عالمِ کیف میں رقص بھی فرماتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ حضرت شیخ الہند خواجہ غریب نواز اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہم کا معمول تھا۔ مولانا کے بارے میں سراسر وجد و سماع اور قول و ترانہ بود کی پھبتی کتنا مناسب نہیں ہے۔

مکتبہ سہروردیہ کا مؤسس

"احوال و آثار حضرت شیخ الاسلامؒ" کے مقالہ نگار کا یہ بھی دعوٰے ہے کہ "در بارۂ مؤسس مکتب سہروردی اختلاف رائی ہست۔" [1] (الی آخرہ)

یعنی اس بارہ میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ مکتب سہروردیہ کے مؤسس شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی تھے یا حضرت شہاب الدین عمر سہروردی۔ یہ ایک نیا نظریہ ہے، اس میں آج تک کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ حضرت شیخ ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی، حضرت شیخ الشیوخ کے چچا اور مرشد تھے۔ مکتب سہروردیہ کی داغ بیل بھی انہوں نے ڈالی۔ پھر اس سلسلہ کو شیخ الشیوخ کی سعی و کوشش سے فروغ نصیب ہوا اور آج تک کسی نے شیخ ابوالنجیب اور شیخ الشیوخ میں فرق روا نہیں رکھا اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔

---

[1] احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ص ۵

مبالغہ آرائی

"احوال و آثار" کے مقالہ نگار نے سہروردیہ بزرگوں کے لیے "سراسر زہد و عبادت اور مجاہدہ و مداومت در آداب سنن" (الی آخرہ) لکھ کر یہ تاثر دیا ہے کہ گویا یہ حضرات راہبانہ زندگی بسر کرتے تھے اور دُنیا سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ حالانکہ مقالہ نگار نے ایک دُوسری جگہ پر اُنہیں "مردمانِ پولدار و متموّل بودند" کا اعزاز بخشا ہے۔ نیز مقالہ نگار نے حضرات چشت اہل بہشت و حضرات سہروردیہ کا مابہ الامتیاز یہ بتایا ہے:

"سہروردیہ با آن ہمہ تعصب معتقد بودند کہ اگر با ارباب اقتدار رابطہ داشتہ باشند می توانند کار را بطور احسن انجام بدہند و ہم می توانند از این راہ بہ مردم کمک کردہ باشند و برای ہمین منظور برخلاف چشتیہ آنان با حکمرانانِ وقت رابطۂ نزدیکی استوار ساختند۔ ولی نفوذ خود را ہمیشہ برای استفادہ رسانیدن بہ خلقِ خدا بکار بُردند"[1]

یعنی سہروردیہ اُمراء دولت سے رابطہ پیدا کر کے عوام الناس کی مشکلات حل کرتے تھے، مگر چشتی بزرگ سلاطین سے نزدیک ہونے کے باوجود عوام کی طرف متوجہ رہتے تھے، یعنی امراء سے میل جول نہیں رکھتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ سہروردی اپنے نظامِ اوقات کے مطابق عبادت کے وقت عبادت کرتے تھے اور اُمورِ دُنیاوی کو بھی سرانجام دیتے تھے۔ سلاطین اور اُمراء سے ملاقات، اصلاحِ احوال کے لیے دُور دراز مقامات کا سفر، ازدواجی زندگی، عوام سے میل ملاقات یہ سب کچھ تھا۔ اس لیے ان پر سراسر زہد و عبادت کا فتویٰ لگانا مناسب نہیں ہے۔

سہروردی اہلِ قلم

کہا گیا ہے کہ سہروردیوں میں اہلِ قلم کی کمی رہی ہے:

"سلسلۂ سہروردیہ مثل چشتیہ قدیمی است و شاید از نظر امور تبلیغاتی

---

[1] ڈاکٹر شمیم محمود زیدی: "احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریاؒ"، ص ۱۲ ۞

بر سلسلۂ چشتیہ برتری ہم دارد ولے ولی چوں عدۂ اہل قلم بین اُنہا کم بود تا حدی خدمات مذاہبی اُنہا در پاکستان غربی و شرقی ثبت نشدہ است "

اس اقتباس کا ملخص یہ ہے کہ سلسلہ سہروردیہ سلسلہ عالیہ چشتیہ کی طرح قدیم ہے اور تبلیغی خدمات کے سبب سلسلۂ چشتیہ پر برتری رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ اس سلسلے میں اہل قلم کم ہوئے ہیں، اس لیے ان کی تبلیغی خدمات کو جو انہوں نے شرقی اور غربی پاکستان میں انجام دی ہیں، سپرد قلم نہیں ہو سکیں۔

ہم ان دونوں سلاسل میں تقابل کے روادار نہیں۔ تبلیغی خدمات دونوں سلاسل کی اظہر من الشمس ہیں۔ حضرت خواجہ غلام فریدؒ سلسلہ شریف میں حضرت شیخ الہند اجمیری غریب نواز قدس سرہٗ سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

اے تازہ شدہ ایمان ز تو　　صد ذوق بہر یکجان ز تو

اسلام بہندوستان ز تو　　اے شیخ معین الدین مددے

" اسلام بہندوستان ز تو " میں سلسلہ چشتیہ کی تمام تبلیغی خدمات سمو جاتی ہیں۔ حضرات سہروردیہ اور چشتیہ نے مل کر تبلیغِ دین کی خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا علیہ الرحمۃ اور حضرت شیخ العالم فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ نے اکٹھے تبلیغی دورے کئے ہیں۔ تقریباً نصف پنجاب حضرت گنج شکر کے ہاتھوں حلقہ بگوشِ اسلام ہوا ہے۔ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء، حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت گیسو دراز اور ان کے خلفاء نے دہلی سے راس کماری تک اسلام کی شمعیں روشن کیں۔

یہ دعوےٰ بھی بے اصل ہے کہ سہروردیوں میں اہلِ قلم حضرات کا فقدان تھا۔ سب سے پہلے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ چشتی حضرات کے جس قدر تذکرے متداول ہیں، سب میں سہروردی حضرات کا جگہ جگہ ذکر ملتا ہے۔ ان میں مغائرت نہیں تھی۔ انہیں سہروردیوں سے بھی پیار تھا۔ انہوں نے اپنے تذکروں کو ان کے ایمان افروز حالات سے مزین کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں ؎

راحت القلوب، سیر الاولیاء، راحت المحبین، افضل الفوائد، فوائد الفواد، مطلوب الطالبین، جوامع الکلم۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سہروردیوں نے کسی زمانے میں بھی اہلِ قلم حضرات کی کمی محسوس نہیں کی۔ حضرت شیخ الشیوخ کی جناب سعدی اور حضرت شیخ الاسلام کی میر حسینی، جلال بخاری اور عراقی جیسے مصنفین کفش برادری پر ناز کرتے تھے۔ حضرت شاہ رکن عالمؒ کے مرید علی بن احمد غوری اور حضرت مخدوم جہانیاں اور سلطان حمید الدین حاکم جیسے فاضل اہلِ قلم حضرات نے کیا کچھ نہیں لکھا۔ "کنز العباد"، "ملفوظ المخدوم" اور "تذکرہ سہروردیہ" جیسی تصنیفات اسی دور میں مدون ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں سہروردیوں نے اشاعتِ اسلام کا جو کام کیا ہے، اسے سہیل یمنی جیسی ملفوظی تصانیف ہی میں نہیں، بلکہ سرجادوناتھ سرور اور ڈاکٹر کالیکا رنجن جیسے غیر مسلم مورخین نے بھی اپنی تاریخوں میں تفصیل سے لکھا ہے۔ کشمیر، گجرات اور وسط ہند میں سہروردیوں نے جو تبلیغی خدمات انجام دی ہیں، وہ علی شیر قانع کی تحفۃ الکرام سے ظاہر ہیں۔

مولانا جمالیؒ نے سہروردی مشائخ کا سیر العارفین کے نام سے شاندار تذکرہ مدون کیا ہے۔ خزینۃ الاصفیاء کے مصنف مفتی غلام سرور لاہوری حضرت شیخ الاسلامؒ کی اولاد سے ہیں اور سہروردی ہیں، انہوں نے اپنی تصنیف میں ہر چہار سلاسل کے مشائخ کا وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس لیے بڑے اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ سہروردیوں کی تبلیغی خدمات کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہیں ہے۔

سہروردی مرکز کی اُچ میں منتقلی

کہا جاتا ہے کہ چونکہ حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ لاولد تھے۔ اس لیے اُن کے انتقال پر رُشد و ہدایت کا مرکز ملتان سے اُچ میں منتقل ہو گیا۔ سب سے پہلے جو بزرگوار تبلیغ کے سلسلے میں اُچ تشریف لائے، وہ مخدوم سید جلال بخاریؒ تھے۔ ان کے پوتوں میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور مخدوم راجن قتالؒ زیادہ معروف ہیں۔ مقالہ نگار "احوال و آثار" نے سنین کے سلسلے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ تاریخ ہائے وفات ملاحظہ

ہوں :-

شیخ الاسلام صدرالدین عارف کی تاریخ وفات بالاتفاق ۲۳ر ذی الحجہ ۷۰۹ھ ہے، مگر مقالہ نگار نے ۶۸۶ھ درج کیا ہے۔

حضرت شاہ رکن عالم قدس سرہٗ کی تاریخ ولادت ۹ر رمضان ۶۴۹ھ ہے، مگر ۶۴۷ھ درج ہوئی ہے۔

حضرت سید السادات جلال بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات مقالہ میں ۶۶۰ھ درج ہے، جو اس لیے غلط ہے کہ آپ کے پیر دستگیر حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ ۶۶۱ھ کو فوت ہوئے۔ حضرت جلال بخاری نے آپ کا جنازہ پڑھا اور تدفین میں شریک رہے۔

حضرت مخدوم جہانیاں لکھتے ہیں کہ دادا حضور کو بعد وفات شیخ الاسلام حضرت عارف باللہ نے کچھ عرصہ اپنے پاس رکھا پھر اُچ جانے کی اجازت دی[1]۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے آپ کی تاریخ وفات ۶۹۵ھ لکھی ہے۔

مقالہ نگار نے شیخ جمال خنداں[2] رو کو بھی آپ کا پوتا لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔ ان کا یہ دعویٰ بھی کہ حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد صوفیانہ تعلیمات کا مرکز ملتان سے اُچ منتقل ہو گیا تھا، اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتا۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے جانشین حضرت عارف باللہ نے سید السادات جلال بخاری علیہ الرحمۃ کو اُچ تشریف لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر اُنہوں نے ملتان کے مقابلہ میں اپنی الگ خانقاہ قائم نہیں کی تھی، بلکہ زندگی بھر اُن کا مرکزِ توجہ ملتان ہی رہا۔

حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت شاہ رُکن عالمؒ کے خلیفہ تھے۔ وہ بھی زندگی بھر ملتان کی مسند کا احترام کرتے رہے۔ حضرت شاہ رُکن عالم کے بعد شیخ الاسلامی کا منصب حضرت مخدوم

---

[1] ملفوظ المخدوم ص ۶۶۸

[2] مقالہ نگار نے مقالہ کے صفحہ ۱۴ پر ۶۶۰ھ کو ۱۲۹۱ء سے مطابقت دی ہے۔ اس حساب سے حضرت جمال خنداںؒ کی وفات ۱۳۳۱ء کو ہونی چاہیئے۔ کیونکہ وفات کا سنہ ۷۰۰ھ ہے۔

صدرالدین محمدؒ کو ملا تھا۔ جو آپ کے بھتیجے تھے۔ شیخ الاسلامی کا عہدہ مملکتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا دینی عہدہ تھا۔ شہاب الدین ابوالعباس احمد دمشقی المتوفی سالک الابصار فی ممالک الامصار میں شیخ مبارک کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ محمد تغلق کے زمانے میں قاضی القضاۃ اور شیخ الاسلامی کے دو مُوقر عہدے ہوتے تھے۔ جنہیں دس دس قصبات جاگیر میں ملتے تھے۔ ان کی آمدنی ساٹھ ہزار تنکہ سے کم نہ ہوتی تھی۔ قاضی القضاۃ کا کام مقدمات کی سماعت اور احکامِ سزا وغیرہ دینا تھا۔ شیخ الاسلامؒ کا کام شرع کے مطابق مسائلِ عامہ طے کرنا تھا۔ علماء و فقہائے کے جُملہ امور قاضی القضاۃ سے اور مشائخ و فقراء کے تمام معاملات شیخ الاسلام کی وساطت سے طے پاتے تھے[1]۔

حضرت شاہ رکن عالم قدس سرہٗ کے بعد جب حضرت مخدوم صدرالدین مسند نشین ہوئے، تو سلطان فیروز شاہ نے سندھ کی مہم سے واپسی پر ملتان پہنچ کر آپ سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ آپ کے آباءِ کرام گاہے گاہے دارالسلطنت میں تشریف لاکر سلاطینِ وقت کی بزرگانہ نصائح سے راہنمائی فرمایا کرتے تھے۔ آپ بھی اُن کی سُنت کو زندہ کرنے کے لیے ضرور تشریف لایا کریں۔ شیخ کو سلطان کا یہ نیاز و انکسار بے حد پسند آیا اور دہلی آنے کا وعدہ فرما لیا۔ چنانچہ جب سلطان بنگال کی مہم سے فارغ ہو کر دہلی واپس آیا اور جشنِ استقلال منعقد کیا۔ تو اس موقع پر حضرت شیخ الاسلام صدرالدین محمد بھی تشریف لے گئے۔ حصار کے شاہی محل میں سلطان نے آپ سے شیخ الاسلامی کے منصب کو قبول کرنے کی درخواست کی اور ساتھ ہی گراں بہا خلعت، شمشیر مرصع اور زریں ہودج کا ہاتھی نذر کیا[2]۔

اس سے ظاہر ہے کہ شاہ رُکن عالم کے بعد نہ صرف مسند درویشی کی شان قائم رہی، بلکہ صاحب سجادہ کو شیخ الاسلامی کا منصب بھی نذر ہوا جو اس دَور کا سب سے بڑا دینی منصب تھا۔ حضرت مخدوم جہانیاں کی نیازمندی کا یہ عالم تھا کہ جس کسی کو مرید کرتے، فرماتے کہ تم مرید تو حضرت

---

[1] "اسلامی ہند" ص ۲۰۱

[2] تاریخ معصومی از سید محمد معصوم نامی۔ تاریخ ہند۔ از مولوی ذکاء اللہ۔ خلاصۃ الاحباب از محمد افضل

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ کے ہو، مَیں تو صرف اُن کا وکیل ہوں۔

پھر فرمایا کہ جس وقت خلیفہ شیخ کی طرف سے وکالت کرتا ہے اور مرید کو اس کے حوالے کرتا ہے، تو حق تعالیٰ ایک فرشتے کو حکم کرتے ہیں کہ اس شیخ کی رُوح کو اطلاع دے کہ فلاں بن فلاں نے تیرے خلیفہ سے بیعت کی ہے۔ پس وہ شیخ اس کا ممد رہتا ہے[1]۔

حضرت مخدوم جہانیاں کی وفات کے بعد حضرت مخدوم راجن قتال ان کے جانشین قرار پائے۔ چونکہ حضرت مخدوم کی اہلیہ محترمہ اپنے بیٹے ناصرالدین محمود کو سجادہ نشین دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس فیصلہ سے وہ ملولِ خاطر ہوئیں۔ مخدوم راجن قتال اگرچہ بی بی کے دیور تھے، لیکن اس وقت صرف اُن کے ذہن پر مُرشد کا تصوّر چھا رہا تھا اور وہ اپنے مُرشد کی اہلیہ محترمہ کو ناراض دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے اُچ سے ملتان منتقل ہو گئے۔ زندگی بھر ملتان رہے۔ وفات کے بعد اُنہیں اُچ میں دفن کیا گیا۔ اس لیے یہ دعویٰ کہ شاہ رکن عالم کے بعد ملتان کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی، صحیح نہیں۔

کشمیر میں اسلام کی اشاعت

مشائخ سہرورد (کشمیر) کے ضمن میں "احوال و آثار" کی معلومات درج ذیل ہیں :۔

"شیخ بزرگ آنہا (سہروردیہ) حمزۂ کشمیری متوفی ۶۸۴ھ است۔ او مرید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت متوفی ۱۳۸۳ء میلادی بود۔ مے گویند شیخ خود بہ کشمیر رفتہ بود و مدتی آنجا بود و بعداً حمزۂ کشمیری را خلیفہ خود تعیین نمود۔ او در ۹۸۴ھ میلادی فوت کرد۔ بعد از او سید علی ہمدانی ایں فرقہ را رواج داد"[2]

---

[1] الدرالمنظوم، ص ۲۹۵۔

[2] احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی، ص ۱۴۔

مقالہ نگار کے اس اقتباس سے حسب ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں :-

- حضرت مخدوم جہانیاں کشمیر گئے ۔
- مخدوم حمزہ کشمیری کو بیعت کیا اور پھر اپنا خلیفہ مقرر کیا ۔
- حضرت حمزہ کشمیری ۷۸۴ھ میں فوت ہوئے ۔
- ان کے جانشین سید علی ہمدانی ہوئے اور انہوں نے فرقہ سہروردیہ کے لیے بڑا کام کیا ۔

اب ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیے :

مخدوم جہانیاں " جہان گشت " کہلاتے ہیں ۔ ممکن ہے وہ کشمیر تشریف لے گئے ہوں ، یہ کوئی عجیب بات نہیں ۔ البتہ مخدوم شیخ حمزہ کشمیری قدس سرہٗ کے متعلق " احوال و آثار " کی معلومات صحیح نہیں ۔ یہ بزرگوار مخدوم جہانیاں کے نہیں ، بلکہ سید جمال الدین بخاریؒ کے مرید ہیں ۔ سید جمال الدین بخاری ، حاجی سید عبدالوہاب بخاری علیہ الرحمۃ کے مرید تھے ۔ وہ حضرت مخدوم راجن قتال کے اور حضرت راجن مخدوم جہانیاں جہان گشت کے ۔ گویا آپ تین واسطوں سے مخدوم جہانیاں کے مرید ہیں ۔ آپ کی تاریخ وفات مقالہ نگار نے ۷۸۴ھ غلط لکھی ہے ۔ صحیح ۹۸۴ھ ہے ، جسے مقالہ نگار نے میلادی بنا دیا ہے ۔

مندرجہ بالا اقتباس میں یہ دعوے درست نہیں ہے کہ حضرت سید علی ہمدانیؒ نے مخدوم شیخ حمزہ کے بعد سلسلہ سہروردیہ کو فروغ دیا تھا ۔ مخدوم حمزہ کے خلفاء میں بابا داؤد خاکیؒ ، علامہ فیروز الدین ، مفتی کشمیر اور بابا روپی ریشی کا بڑا مقام ہے ۔ سلسلہ سہروردیہ کو کشمیر میں اُن کے دم قدم سے فروغ نصیب ہوا ۔

گجرات کے سہروردی مشائخ

اس کے بعد مقالہ نگار نے گجرات (کاٹھیاواڑ) کے سہروردی مشائخ کا ذکر کیا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے :

" از تذکرۂ اولیائے گجرات معلوم میشود کہ شیخ حسام الدین ملتانی اہالی گجرات را بہ دین اسلام راغب کرد ، بعد از او شیخ جمال الدین آچی در ۷۳۰ھ بہ پتن آمد ، او مرید مخدوم جہانیاں جہان گشت بود در ۷۵۳ھ فوت شد "[۱]

---

[۱] احوال و آثار ، شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ص ۱۴۹ ، ۱۵۰ ۔

منازل الاولیاء، جس کے مصنف صوفی شیخ جہاں ہیں اور "مراۃ احمدی" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اس دیار کو مشرف بہ اسلام کرنے والے شیخ عبداللہ محمد تھے۔ ان کے بعد محمد تغلق کے زمانے میں شیخ حسام الدین ملتانی نے پٹن میں توحید کے چراغ روشن کئے اور ۷۳۱ھ میں فوت ہوئے۔ ان کے بعد شیخ جمال الدین اُچی تشریف لائے اور آٹھ سال مسند رشد وہدایت کو زینت دینے کے بعد ۷۴۵ھ میں راہگزائے عالم جاودانی ہوئے، لیکن سب سے زیادہ جس بزرگ نے اس ملک میں رشد وہدایت کا کام کیا ہے، مقالہ نگار نے اُنہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ حضرت مخدوم جہانیاں رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے سید برہان الدین قطب عالم بخاری ہیں۔ اُن کے خلفاء میں مخدوم سید محمود، سید خوندمیر، سید احمد بخاری، سید حامد بخاری، سید صالح بخاری، شیخ عثمان، شیخ عبداللطیف اور حضرت شاہ عالم بخاری جیسے ہزاروں اقطاب و ابدال ہیں، جن کی کوششوں سے گجرات کی سرزمین مسبط انوار الٰہی بن گئی تھی۔

شیخین کے بارے میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ شیخ جمال اُچی کی آمد ۷۳۷ھ اور وفات ۷۳۵ھ لکھی ہے جو کہ صحیح نہیں ہے۔ ان کی تاریخ وفات ۷۴۵ھ ہے۔

افغانستان کے سہروردی مشائخ

احوال و آثار کے مقالہ نگار نے افغانستان کے ضمن میں صرف "آبِ کوثر" سے استفادہ کیا ہے، جیسا کہ اُن کے ذیلی حوالہ سے ظاہر ہے۔ اور پھر جدتِ بیان ملاحظہ ہو:

"تذکرہ نویسیاں نوشتہ اند"۔

گویا اُن کے نزدیک تذکرہ نویسوں کے سربراہ "آبِ کوثر" کے مؤلف صاحب ہیں۔ کیونکہ آپ نے اسی کے حوالے پر قناعت کر لی ہے۔ اب متن ملاحظہ ہو:

"یکی از مریدان شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی بہ اسم حسن افغان فرقۂ سہروردیہ را در افغانستان رواج داد[1]"۔

بلاشبہ حضرت خواجہ حسن افغان حضرت شیخ الاسلام کے محبوب مرید تھے۔ انہوں نے

---

[1] احوال و آثار، شیخ بہاء الدین زکریا، ص ۱۵ پ

اپنے قبائل میں کچھ عرصہ اصلاحِ احوال کا کام کیا تھا، مگر افغانستان میں سہروردی سلسلہ کو رواج دینے والے سید میر حسینی ہیں، جنہوں نے ہرات کو سہروردی سلسلے کی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور بڑا کام کیا۔

سُہروردی سلسلے کے مفرُوضہ فرقے

سہروردیہ سلسلہ کی شریعت کے ساتھ اتنی زبردست وابستگی کے باوجود بعض تذکرہ نگاروں نے مستشرقین کے زیرِ اثر اس سلسلۂ عالیہ کو درج ذیل تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ ملامتیہ

۲۔ باشریعت

۳۔ بے شریعت

یہ تقسیم بے اصل ہے، کیونکہ خود ایسے مصنفین نے اعتراف کیا ہے کہ سلسلۂ سہروردیہ زُہد و تقویٰ اور سُنّت و فرائض کا سختی سے پابند تھا۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس۔

"مکتب سہروردی سراسر زہد و عبادت و مجاہدہ و مداومت در آداب و سنن و اوراد و اذکار و رعایت فرائض بود۔"

سلسلۂ عالیہ سہروردیہ نے اپنے پیروؤں کو شدت سے شریعت مطہرہ پر عمل کرایا ہے اور کسی کو سرِ مو انحراف کرنے کی اجازت نہیں دی۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کے عہد کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ خانقاہ کے درویشوں نے حالتِ بے اختیاری میں مولانا عراقی کو اشعار گنگناتے سُن لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ پوری خانقاہ میں کہرام برپا ہو گیا۔ حضرت کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔

"حضور! ہمارے مسلک میں تو ان چیزوں کی ممانعت ہے، پھر عراقیؒ اس امر کے مرتکب کیوں ہو رہے ہیں؟"

حضرت شیخ الاسلامؒ، عراقی کی قلبی کیفیت اور سکر و مستی سے واقف تھے، فرمایا:

"شمارا ازیں چیزہا منع است او را منع نیست"
یعنی تمہیں ان چیزوں کی اجازت نہیں، مگر وہ مغلوب الحال ہونے کے سبب معذور ہے۔
درویش اس وقت تو ادباً خاموش رہے، مگر جب سرکار کا انتقال ہو گیا، تو انہوں نے پھر واویلا کیا۔ اگرچہ حضرت مخدوم صدرالدین عارف باللہ کا زمانہ تھا اور حضرت شاہ رکن عالم رحمۃ اللہ علیہ بھی بھرپور جوان تھے۔ سید جلال بخاری، میر حسینی، خواجہ حسن افغان اور سلطان حمیدالدین حاکم جیسے اولیائے کاملین اس خانقاہ کی زینت تھے۔ مگر چونکہ بات سلسلہ کے مسلک کی تھی۔ اس لیے کوئی انہیں خاموش نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ عراقی خانقاہ کے ماحول سے دل برداشتہ ہو کر حجاز کو روانہ ہو گئے۔

اس لیے ملامتی ہوں یا بے شریعتی، ان فرقوں کا سلسلۂ سہروردیہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں بعض مصنفین سے بجا طور پر یہ شکایت ہے کہ وہ مشائخ کے حالات مدوّن کرتے وقت افراط تفریط سے بڑھ جاتے ہیں۔ مثلاً گجرات کے مشہور بخاری بزرگ سید محمد شاہ عالمؒ کے حالات میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

"سید محمد شاہ عالم کے زمانے میں گجرات کے سہروردی سلسلہ کا سیاسی اقتدار اپنے منتہائے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ بہت سے امراء اور گورنمنٹ کے حکام ان کے مرید و معتقد تھے۔"

احوال و آثار شیخ الاسلام میں اسی اقتباس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں اس طرح سے ادا کیا گیا ہے:

"سید محمد شاہ عالم متوفی ۱۴۷۵ء میلادی معروف تر از پدر بودہ و درمیان زمان خود نقش مہمی در زمینۂ سیاست و مذہب بازی کرد[1]"

"در زمینۂ سیاست و مذہب بازی کرد" ایسے خدا یاد درویشوں کے بارے میں لکھنا بہت بڑی بے ادبی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر شمیم محمود زیدی: احوال و آثار شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، ص ۱۶

کیا یہ حضرات ثابت کر سکتے ہیں کہ حضرت سید محمد شاہ عالم قدس سرہٗ اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی بادشاہ یا امیر کے گھر چل کر گئے۔ یا انہوں نے اپنے کسی فرزندِ ارجمند یا معتمد خاص کو کسی کام کے لیے کسی حاکم کے ہاں بھیجا یا رقعہ کے ذریعے کسی سے وجہ معاش کے لیے نہ سہی لنگر کے نام پر کچھ مانگا؟ بلکہ دُنیا تو یہ سمجھتی تھی کہ غیب سے حضرت کے ہاں درہم و دینار کی بارش ہوتی ہے۔ آپ کے چہرۂ اقدس کی نورانیت کا یہ عالم تھا کہ راؤ منڈلیک آپ کو دیکھتے ہی پکار اُٹھا:

"جو آپ کا دین ہے، وہی میرا دین ہے" اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

اپنے قطب زمانؒ کے بارے میں عوام کو یہ تاثر دینا کہ انہوں نے مذہب اور سیاست پر پنجے گاڑ رکھے تھے، غضبِ الٰہی کو دعوت دینا ہے۔

طرفداران شریعت کا ذکر کرتے کرتے احوال و آثار کے مقالہ نگار نے ایک گروہ کو اُٹھا کھڑا کیا ہے، جس نے بھارت کے ایک معروف شہر پنیو کنڈاہ[ل] کو اپنا مرکز بنا رکھا ہے۔ اس کی مخصوص عادات ہیں جن کا سید جلال بخاری کی ذات یا سلسلۂ سہروردیہ کے مسلک سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ انتساب تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے فقیروں کا ایک گروہ اعلانیہ بھنگ پیتا اور یا علی کے نعرے لگاتا ہے۔ اور اپنے الاؤ کو جو ہر وقت تیار رہتا ہے، اسے یا علی کا پڑ یعنی آتش کدہ کہتے ہیں۔ اگر بھنگ، چرس اور افیون پینے پلانے کا تعلق حضرت امیر علیہ السلام کی ذات سے قطعاً نہیں ہے تو کیا پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نشہ کرنے والے فقیر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذاتِ پاک سے تعلق رکھتے ہیں۔ استغفر اللہ العظیم۔

گروہ اسمٰعیل شاہی

مولانا محمد اسمٰعیل المعروف میاں وڈہ شاہجہان کے زمانے میں لنگر مخدوم سے لاہور تشریف لائے اور یہاں درس کی بُنیاد رکھی۔ بے شمار عالم اور حافظ پیدا کیے۔ آپ کا مدرسہ سکھوں کے دور تک موجود تھا۔ آپ کی قبر کچی ہے کہ وصیت ہی ایسی تھی۔ آپ نے پوری زندگی قرآن حفظ کرانے اور

ل PEND KONDAH

حدیث و فقہ کا درس دینے میں بسر فرمائی۔ نہ کسی کے ہاں چل کر گئے اور نہ کوئی جماعت بنائی۔

ایسے دیندار، زاہد، متقی اور مبلغ اسلام کو متعصب اور تنگ نظر قرار دینا ان ہی لوگوں کا کام ہے جو فتنۂ اشتراکیت سے متاثر ہوں۔ جیسا کہ درج ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:

"مؤسس ایں سلسلہ مرد متعصب و تنگ نظر می بود و اجازت نداد کہ بعد از مرگ او مریدانش بر مقبرہ او گنبدی بنا کنند"

مولانا کی جائے سکونت تل پورہ تھی۔ مقالہ نگار نے اُسے تالپور (TALPUR) لکھا ہے[۱]۔

گروہِ شاہ دولہؒ

حضرت شاہ دولہ علیہ الرحمۃ سہروردی سلسلہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ انہیں رفاعی کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ گجرات اور سیالکوٹ میں کئی مساجد اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ راستے میں جگہ جگہ ندی۔ دں پر پُل بنوائے اور مسافروں کے لیے چاہات احداث کرائے۔ آپ عمر بھر مجرد رہے اور عالمِ تجرید میں ہی اپنی ساری زندگی بسر کر دی[۲]۔

آپ سے جو عجیب الخلقت بچوں کی پیدائش کی داستانیں منسوب ہیں، اُن کی کوئی اصل نہیں یہ سب اُن کے مجاوروں کی کارستانیاں ہیں، جن کا پردہ اب چاک ہو چکا ہے۔

مناسب ہے کہ مؤرخین اور تذکرہ نویس بھی تحقیق سے کام لیں۔ احوال و آثار میں عجیب الخلقت بچوں کے سلسلے میں جو لکھا ہے وہ محل نظر ہے[۳]۔



---

۱ احوال و آثار، شیخ الاسلام قدس سرہٗ ص ۱۱۱ ۔

۲ احوال و آثار، شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ ص ۱۵ ۔

۳ احوال و آثار حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین قدس سرہٗ العزیز ص ۱۵ ۔

لعل شہبازیہ

حضرت مخدوم سید عثمان المروندی المعروف بہ لعل شہباز قلندر پابندِ شریعت بزرگ تھے۔ آپ اگرچہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ کے مرید اور خلیفہ تھے، لیکن حضور آپ کو دوستوں میں شمار کرتے ہیں۔ صوفیاء میں جو چار یار مشہور ہیں، ان سے حضرت شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا علیہ الرحمۃ حضرت شیخ العالم فریدالدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ، سید السادات جلال بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور مخدوم شیخ عثمان المروندی رحمہم اللہ مراد ہیں۔

شروع شروع میں معراج الولایت کی عبارت سے نیاز مند کو بھی حضرت مخدوم لال شہباز کے بارے میں یہ شبہ ہوا تھا کہ

"چوں جذب و مستی بنہایت داشت پابندِ احکام شرع نبود"

لیکن جب احقر نے سہوان شریف میں چپے چپے پر ان کی عبادت گاہیں دیکھیں تو مجھے معارج کی صحت پر یقین نہ آیا اور پھر وہ ذاتِ گرامی جو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ جیسی سرکار شریعت کی صحبت میں ایک دو دن نہیں بلکہ کئی سال بسر کر چکی ہو، اس سے متعلق اس قسم کے رائے تہمت نہیں تو کیا ہے؟

اسی بناء پر درج ذیل عبارت سے بھی ہمیں اختلاف ہے:

"ایں عارف بزرگ لال شہباز بہ مسلک قلندریہ متمائل بود و بطوری در عشق خود بہ خدا مستغرق بود کہ از علائق دنیوی و دینی بے پرواہ شدہ بود و عشق او بہ درجہ ای رسیدہ بود کہ خودش متقاضی اللہ شدہ بود[1]"

یہ بے شریعت اور بے عمل گروہ جو قلندر قلندر کے نعرے لگاتا اور بدمستیاں دکھاتا ہے، اس کا حضرت شہباز کی ذات سے کوئی تعلق نہیں۔

---

[1] احوال و آثار، شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی ص ۱۹

گروہِ سہاگیہ

گروہِ سہاگیہ کے بانی حضرت شاہ سہاگ، حضرت سیّد جلال بخاری کے مرید تھے جو سراپا عمل تھے۔ ان کے برتنوںؔ کے بارے میں بھی لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ ذکر کرتے ہیں۔ اُن کے ایک مرید کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرنا کہ وہ طوائفوں اور رقاصاؤں میں ہر وقت دُلہن کی طرح بنے ٹھنے رہتے تھے۔ نہ نماز پڑھتے، نہ روزہ رکھتے۔ سلسلۂ سہروردیہ کو بلاوجہ بدنام کرنا ہے[2]

گروہِ رسول شاہیؔ

سلسلہ رسول شاہیہ کے بانی سید رسول شاہ رحمتہ اللہ علیہ ہیں جو بارہ واسطوں سے حضرت مخدوم راجن قتال کے مرید ہیں۔

سید رسول شاہ۔ شاہ نعمت اللہ ولی۔ شاہ داؤد مصری۔ شاہ حبیب اللہ۔ شاہ اسماعیل شاہ۔ مرتضٰے آنند۔ شاہ عبدالرزاق۔ شاہ اللہ داد۔ شاہ پیرن بندگی شاہ منجھن گوشہ نشین۔ شیخ محمد۔ خواجہ اسحاق۔ شیخ داؤد قریشی۔ مخدوم راجن قتال رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

اس فرقے میں بہت سی ہندوانہ باتیں داخل ہوگئیں ہیں۔ شیخ پیرن تک تو یہ سلسلہ متبع شریعت رہا ہے۔ کیونکہ ان کی دوسری شاخ میراں سید احمد سلیم مالک پوری اور ان کے خلفاء دیوان شاہ عبدالرشید جونپوری، سہروردی میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ اس سلسلہ کے

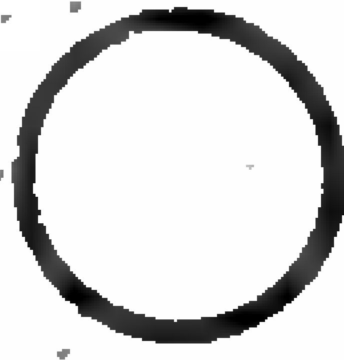
---

[1] خزینۃ الاصفیاء، بحوالہ منظہر جلالی ص ۳۷

[2] احوال و آثار، شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی ص ۱۹

ایک بزرگ شاہ حبیب ملتان میں دفن ہیں، وہ بھی اس اعتقاد کے نہیں تھے۔

شاہ نعمت اللہ نے حلول کا اعتقاد اپنے مُریدوں میں پیدا کیا اور پھر مریدوں نے انہیں مظہر الٰہی سمجھ کر پُوجنا شروع کر دیا۔ داڑھی مُونچھ اور سر کے بال ترشوانا، شادی نہ کرنا اور نغمہ سرائی میں مست رہنا، یہ سب باتیں انہیں سلسلہ عالیہ سہروردیہ سے الگ کرتی ہیں۔




عروس البلاد
ملتان

سُلطان ناصرالدین قباچہؒ

(سندھ کا مغرور تاجدار)

جب حضرت شیخ الاسلامؒ کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی، تو سندھ اور مُلتان کے تاجدار سلطان ناصرالدین قباچہ کو آپ کے ملنے کا شوق ہوا۔ اُسے فقراء اور مشائخ سے عقیدت نہ تھی، اس لیے ایک دن امتحان کی غرض سے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی:

"ولی کی شناخت کیا ہے؟"

اس وقت اتفاق سے ایک مکھی سلطان کی ناک پر آ بیٹھی۔ اُس نے اُڑایا، مگر پھر آ بیٹھی الغرض کئی مرتبہ یہ نوبت آئی کہ وہ ناک سے مکھی کو اُڑاتا، مگر وہ پھر آ بیٹھتی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ یہ کیفیت ملاحظہ فرما رہے تھے۔ اسی اثنا میں قباچہ نے دوبارہ سوال کیا:

"نشانِ اولیاء چیست؟"

شیخ الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ولی کی شناخت یہ ہے کہ اُس پر مکھی نہیں بیٹھتی۔ قباچہ کھڑا ہو گیا اور اُس نے اقرار کیا کہ واقعی آپ ولی ہیں۔ حضرت محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگ سے سُنا ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے بدن اور لباس پر کسی نے عمر بھر مکھی کو بیٹھتے نہیں دیکھا[1]۔

فیاضی

قباچہ کے عہدِ حکومت میں ایک بار سخت قحط پڑا۔ حضرت کے لنگر خانہ میں گندم کی کافی مقدار

---

[1] خلاصۃ العارفین بہ تصحیح و تحشیہ ڈاکٹر شمیم محمود زیدی، مطبوعہ دین پریس لاہور ۱۹۷۴ء۔ ص ۱۴۰

موجود تھی۔ اس نے آپ سے کچھ گندم طلب کی۔ آپ نے فرمایا کہ فلاں سٹور کی گندم دے دی جائے، جب سلطان کے نوکر آئے اور سٹور سے گندم اُٹھانا شروع کی، تو اُس میں سے نقری سکوں کے سات کوزے برآمد ہوئے۔ سلطان کو اطلاع ہوئی، تو اُس نے حکم دیا کہ یہ کوزے حضرت شیخ الاسلامؒ کی خدمت میں واپس کر دیئے جائیں۔ کیونکہ یہ غلّہ سے برآمد ہوئے ہیں، لیکن حضرت نے فرمایا، ہمیں اِن کوزوں کا پہلے سے علم تھا اور گندم کے ساتھ ہم نے چاندی کے یہ کوزے بھی بخش دیئے تھے[1]۔

علامہ قُطبُ الدین کاشانیؒ

سلطان ناصر الدین قباچہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے بے پناہ اثر و نفوذ کو اپنی حکومت کے لیے مستقل خطرہ خیال کرتا تھا اُس نے بڑے سوچ بچار کے بعد کاشان کے علامہ قطب الدینؒ کو مُلتان آنے کی دعوت دی۔ وہ بھی فقرا اور مشائخ کے چنداں معتقد نہ تھے۔ علامہ بڑی شان سے مُلتان میں داخل ہوئے۔ حکومت نے جامع مسجد کے ساتھ بہت بڑا مدرسہ تعمیر کرایا اور مولانا اس کے شیخ الدرس مقرر ہوئے۔

قباچہ ان کا بہت ادب کرتا تھا اور امرائے دربار کو بھی حکم تھا کہ اُن کا زیادہ سے زیادہ احترام کریں۔ حضرت شیخ الاسلام کو سب کچھ معلوم تھا، لیکن اس کے باوجود اپنے محل سے چل کر جامع مسجد میں پہنچتے اور ان کی اقتدا میں صبح کی نماز ادا کرتے تھے۔ ایک دن علامہ نے عرض کی:

"حضور! نماز اپنی مسجد میں ہی ادا فرمالیا کریں، اس قدر تکلیف کی کیا ضرورت ہے؟"

فرمایا:

"میں اس حدیثِ پاک پر عمل کرتا ہوں "من صلّی خلف عالم فکانما صلّی خلف نبی مرسلٍ" یعنی جس نے کسی باعمل عالم کے پیچھے نماز پڑھ لی، گویا اس نے نبی مرسل کے پیچھے نماز ادا کی۔"

مولانا خاموش ہو گئے۔

---

[1] بزمِ صوفیہ، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء ص ۹۴۔

ایک مرتبہ جب حضرت شیخ الاسلامؒ صبح کی نماز پڑھنے کے لیے تشریف لائے۔ مولانا ایک رکعت پڑھا چکے تھے۔ حضرتؒ دُوسری رکعت میں شریک ہوئے۔ لیکن ابھی علامہ نے پہلا سلام ہی ادا کیا تھا کہ شیخ الاسلامؒ کھڑے ہو گئے۔ نماز کے بعد علامہ کو کسی نے یہ معاملہ بتا دیا۔ انھوں نے حضرت سے سوال کیا کہ آپ نے میرے دُوسرے سلام کا انتظار کیوں نہ فرمایا ؟ اگر مجھے سہو ہو جاتا، تو پھر آپ کیا کرتے ؟

فرمایا کہ "اگر کسی کو نورِ باطن سے معلوم ہو جائے کہ امام کو سہو نہیں ہُوا، تو وہ پہلے سلام پر ہی کھڑا ہو سکتا ہے۔"

علامہ نے فرمایا :

"ہر وہ نور جو احکامِ شرع کے موافق نہیں ہے، ظلمت ہے۔"

حضرت شیخ الاسلام کو یہ جواب شاق گزرا اور پھر کبھی اس مسجد میں تشریف نہ لائے۔[۱]

مولانا جامی لکھتے ہیں کہ انھی ایام میں مولانا کے کسی بے تکلف دوست نے اُن سے پُوچھا کہ فقراء پر آپ کے اعتقاد نہ رکھنے کی وجہ کیا ہے ؟ انھوں نے فرمایا کہ مَیں نے ایک درویش ایسا دیکھا ہے کہ کوئی دُوسرا اس جیسا نظر نہیں آتا اور پھر اس کا ذکر شروع کیا۔

فرمایا :

"ایک دفعہ مَیں کاشغر میں مقیم تھا۔ ایک عمدہ اور نفیس چاقو اپنی جیب میں رکھتا تھا، اچانک اُس کا دُنبالہ ٹوٹ گیا۔ مَیں اُسے بازار میں لے گیا۔ تمام کاریگروں سے ملا اور اُنھیں کہا کہ جس طرح یہ پہلے تھا، اسی طرح بنا دیجئے۔ سب نے جواب دیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟ پہلے سے کچھ نہ کچھ تو ضرور کم ہو گا۔ مَیں اسی جھمیلے میں کُوچہ گردی کرتا پھرتا تھا کہ ان میں سے ایک شخص نے مجھے بُلا کر کہا کہ فلاں دُکان پر چلے جائیے، وہاں ایک پیر مرد ملے گا۔ وہ بڑا کاریگر اور صاحبِ کمال ہے، ممکن ہے کہ اس کے ہاتھوں تیرا چاقو درست ہو جائے۔ مَیں یہ جواب سُن کر اس

---

[۱] ، سے ۔ بوستانِ غوثیہ، مطبوعہ افضل المطابع دہلی، سنہ ۱۹۰۱ء ص ۲۱

دُکان پر پہنچا۔ ایک پیر مرد دیکھا، جس کے چہرے سے بُزرگی ظاہر تھی اور پیشانی نُور سے جگ مگا رہی تھی۔ مَیں نے سلام کے بعد تمام قصّہ ان کی خدمت میں عرض کیا۔ اس بزرگوار نے نظر اُٹھا کر مجھے دیکھا، چاقو طلب کیا اور فرمایا:

"تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کرلو۔"

مَیں نے اُن کے کہنے پر ظاہرا آنکھیں بند کرلیں، لیکن گوشۂ چشم سے دیکھتا رہا کہ یہ بزرگ کیا کرتے ہیں؟

مَیں نے دیکھا کہ وہ حضرت چاقو کو ہونٹ تک لے گئے اور زیرِ لب کوئی دُعا پڑھ کر دَم کی اور پھر واپس لوٹا دیا۔ مَیں نے دیکھا کہ اب وہ پہلے سے بھی کئی درجے بہتر ہو گیا ہے۔ مَیں اُن کے قدموں میں گر گیا۔ ایک روپیہ اُن کے آگے رکھا۔ مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔ مَیں نے بڑی منت سماجت کی۔ فرمایا:

"تمہارا چاقو درست ہو چکا ہے، اب مجھے کیوں پریشان کرتے ہو۔"

جب مولانا نے یہ حکایت ختم کی، اُن کے دوست نے کہا:

"اے قطب الدین! وہ کاریگر جس نے آپ کا چاقو درست کر دیا تھا، نجم الدین یوسف ہے اور وہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کے ادنیٰ مریدوں میں سے ہے۔"

مولانا کاشانیؒ[لہ] یہ سُن کر دم بخود رہ گئے۔ حضرت شیخ الاسلام کی بلند شخصیت کا رُعب کچھ اس طرح سے اثر انداز ہُوا کہ ملتان میں رہنا اُن کے لیے از بس مشکل ہو گیا۔ نماز کے سلسلے میں جو گفتگو حضرت سے ہُوئی تھی، وہ بار بار ذہن میں آکر کوفت کا موجب بنتی۔ انتشار اور انفعال کی اسی کیفیات میں ملتان چھوڑ کر دہلی روانہ ہوگئے۔

لہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی وفات کے بعد علامہ کاشانی پھر ملتان تشریف لائے اور زندگی کے بقیہ ایام یہیں بسر کرکے دار العلوم کے مشرق میں دفن ہُوئے۔ آپ کا مدرسہ آپکے بعد بھی سالہا سال تک قائم رہا۔ چنانچہ دسویں صدی ہجری میں جب مولانا حسین بخشؒ کے مورثِ اعلیٰ حضرت مولانا وجیہ الدینؒ ملتان تشریف لائے تو آپ اس درس گاہ کے پروفیسر مقرّر ہُوئے۔ کافی عرصہ درس و تدریس میں بسر کرنے کے بعد فوت ہُوئے اور علامہ کاشانی کے پہلو میں دفن

(باقی صفحہ ۱۱۹ پر)

سُلطان جلالُ الدّین خوارزم شاہ

حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں خوارزم شاہ کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۸ سے) ہُوئے۔ مُلّا نادرؒ نے جو ملتان کے قاضی القضاۃ تھے۔ اپنی منظوم تاریخ کے اندر مولانا وجیہ الدینؒ کا ذکر اس طرح سے کیا ہے ؎

بُود آں علامۂ دورِ زماں، بحر فیضِ علم زو گشتہ رواں
درس گُفت و عالمے شد فیض یاب، خود نظیر خویش بود عالی جناب
بعد ازاں آورد رو در مولتان، بود درسِ قاضی قطب الدین رشاں
اندرون نہاد رخت و شُد مقیم، عالمے را داد او فیضِ عمیم!
آخر اندر نہ صد ہفتاد یک، جاں پاکش برد در جنت ملک
سوئے مشرق در مدرسہ جائے او!
متصل قاضی قطبؒ ماوائے او

محولہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۷۱ھ تک علامہ کاشانی کی یونیورسٹی میں کافی رونق تھی۔ حضرتِ علامہؒ کو اس درس گاہ سے جو نسبت تھی۔ اس کا تقاضا یہی تھا کہ مر کر بھی اسی میں دفن ہوں، لیکن ان کے بعد صرف مولانا وجیہ الدینؒ کو ہی یہ شرف حاصل ہُوا۔ ان کے علاوہ کسی اور مدرس کے یہاں دفن ہونے کا تاریخی طور پر کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

حسین آگاہی سے کھڑے ہو کر شمالی درس گاہ کی جانب نظر دوڑائیں تو پُرانے قلعہ کے ایک مرتفع چبوترے پر دو سادہ مگر باعظمت مزار نظر آتے ہیں۔ یہی ان بزرگوں کی آخری آرام گاہیں ہیں۔

اسلامی دَور میں ان پر خوب صورت اور اُن کے شایانِ شان مقبرہ تھا۔ سامنے وسیع و عریض درس گاہ اور پاس ہی عظیم الشان جامع مسجد تھی۔ جس میں حضرت شیخ الاسلامؒ، مولانا کاشانیؒ کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ جہاں مُلتان شہر اور قلعہ کی مسلم آبادی آ کر جمعہ کی نماز ادا کیا کرتی تھی، جہاں صُبح کو روزانہ درسِ قرآن ہوتا تھا اور

(باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

تباہی و بربادی کا اجمالاً ذکر ہو چکا ہے۔ اس کا نوجوان اور اولوالعزم ولی عہد سلطان جلال الدین آخر دم تک مغلوں سے بے جگری اور بہادری سے لڑتا رہا۔ جب اُسے ایران اور افغانستان سے کوئی کمک نہ ملی۔ تو وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا۔

چنگیز خان بھی لاؤ لشکر سمیت پیچھے چلا آتا تھا۔ سندھ کے قریب پہنچ کر جلال الدین نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اور بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا تھا کہ اگر بخت یاوری کرے، تو مغلوں کی فوج پر جا پڑے۔ مغلوں نے اس کے تعاقب میں اپنے گھوڑے دریا میں ڈال لئے

(بقیہ حاشیہ صـ۱۱۹ سے)

ہزاروں سعید رُوحیں قال اللہ وقال الرسول سے دلوں کو گرماتی تھیں۔

سکھوں کے زمانے میں مسجد اور مقبرہ کو بارود سے اُڑا دیا گیا۔ مخدوم شیخ سید محمد یوسف صاحب سجادہ نشین شاہ گردیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" قبر و قبہ اش در قلعہ ارک متصل جامع مسجد بود، در روز انہدام مسجد مذکور از بارودت قبر و قبہ اش نیز بر باد رفت "

مُلا نادر کے اشعار سے علامہ کاشانی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ اور مسجد کے محلِ وقوع کا سراغ ملتا ہے۔ یعنے وہ عظیم الشان درس گاہ علامہ کی قبر کے مغرب میں واقع تھی اور جامع مسجد اس کے متصل بیان کی جاتی ہے[۱]۔

---

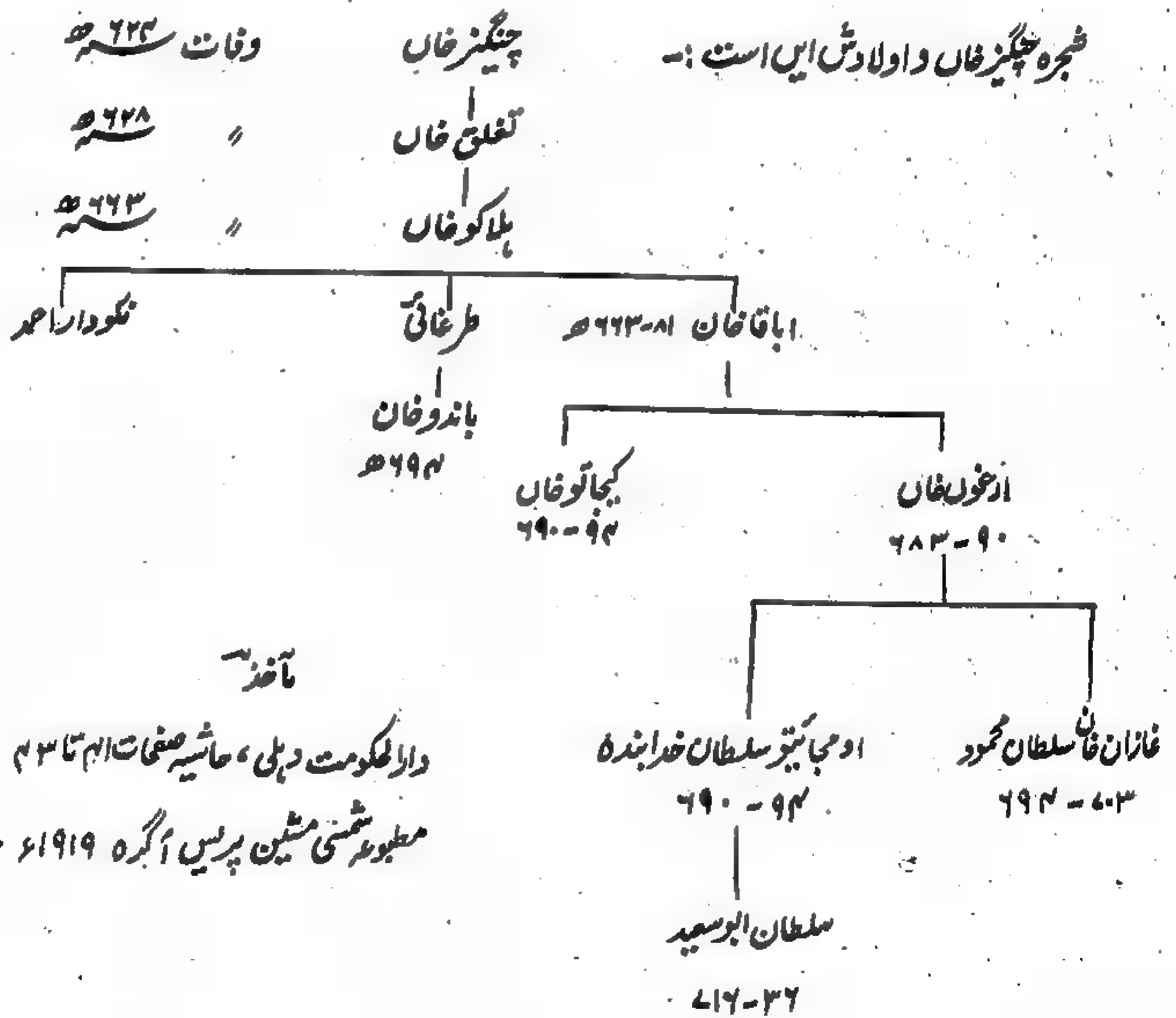
[۱] تذکرۂ ملتان، از مخدوم محمد یوسف گردیزی۔
ترجمہ : فیض الحسن صاحب (گھوٹہ شریف) قلمی
المرقوم : ۱۹۳۸ء
صـ : ۲۵، ۲۷، ۲۸۔



چاہیے۔ لیکن چنگیز خاںؔ اس کی ہمت وشجاعت کو دیکھ کر ایسا خوش ہو رہا تھا کہ اُس نے سواروں کو وہیں روک لیا اور بیٹوں سے مخاطب ہو کر کہا :
"مادرِ گیتی ایسے فرزند گاہے گاہے پیدا کرتی ہے۔ اگر قسمت نے اس کا ساتھ دیا، تو یہ

۱؎ چنگیز خان از فرقہ کفار تاتار است نام پدرش لبوکی بود۔ در ۵۴۹ھ متولد شدہ در ۶۰۲ھ بپادشاہی سر برآوردہ در ۶۱۱ھ بر ملکِ چین و تاتار مستولی گشتہ و بعد ازاں رُخ بطرف ایران نمودہ بر سر محمد خوارزم شاہ کہ سلطان غزنہ و خوارزم بود رفت، و بعد محاربہ متواتر در ۶۱۸ھ او را مستاصل ساخت چندے با پسرش سلطان جلال الدین جنگ ہا داشت تا آں کہ او را نیز کشتہ تمامی ملک غزنہ خوارزم، بخارا، سمرقند وغیر آنہا در عرصہ قلیل بدست آورد و پس از سلطنت بست و دو سال بعمر ہفتاد و پنج سال روز یک شنبہ ۱۵ رمضان ۶۲۴ھ درگذشت (مفتاح التواریخ)

شجرہ چنگیز خاں و اولادش این است :-



ماخذ

دار الحکومت دہلی، حاشیہ صفحات ۴۱ تا ۴۳
مطبوعہ شمسی مشین پریس آگرہ ۱۹۱۹ء -

اپنے باپ دادا کا نام روشن کرے گا۔[۵۱]

جلال الدین نے لاہور پہنچ کر سلطان شمس الدین التمش اور ناصر الدین قباچہ سے امداد طلب کی۔ مگر وہ چنگیز جیسے سفاک دشمن سے لڑائی مول لینے کو تیار نہ تھے۔ جس کا ایمان ہی یہی تھا کہ جہاں جائے، وہاں انسان کی نسل مٹائے۔ التمش نے جلال الدین کے نام پیغام بھیجا کہ یہاں کی آب و ہوا آپ کو راس نہ آئے گی۔ جلال الدین اس بات کو سمجھ گیا اور سندھ کی طرف روانہ ہوا۔ ناصر الدین قباچہ کو علم ہوا تو وہ پورے لشکر کے ساتھ مقابلے میں نکلا۔ سلطان کے جرنیل ازبک پائی نے کھوکھروں کی مدد سے اوچ شریف کے مقام پر قباچہ سے ٹکر لگائی۔ جس میں اُسے شکست ہوئی اور وہ بھکر کی طرف بھاگ گیا۔ سلطان ملتان کو روانہ ہوا۔ قباچہ یہ خبر سُن کر فوراً ملتان آیا اور قلعہ بند ہو بیٹھا۔ ازبک پائی نے ملتان کا بھی محاصرہ کیا۔ لیکن سلطان کی حمیت نے مسلمانوں کی خونریزی کو گوارا نہ کیا اور یہ جنگجو مگر حوصلہ مند نوجوان اپنی قسمت سے ایک بار پھر ٹکرانے کے لیے سیوستان کی راہ سے اپنے مُلک کو واپس لوٹ گیا۔ جہاں وہ آخر دم تک مغلوں سے برسرپیکار رہا۔ آج تک نجتہ طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس شجاع اور جری سُلطان کا کیا حشر ہُوا؟ اغلب گمان یہی ہے کہ اُس نے مُغلوں کے کسی معرکہ میں بہادری سے لڑتے ہوئے اپنی جان مُلک اور ملت پر قربان کر دی ہو گی۔

مُغلوں کا مُلتان پر حملہ

تمام تاریخوں کا اس پر اتفاق ہے کہ چنگیز خاں نے دریائے سندھ کو عبور نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کا جرنیل طرطائی[۵۲] سندھ کو عبور کر کے بھیرہ تک آ پہنچا اور اس شہر کی کل آبادی کو حکم دیا کہ فوج کے لیے کشتیاں تیار کرے۔ چنانچہ تھوڑے سے عرصہ میں کشتیاں تیار ہو گئیں۔ طرطائی نے ان کشتیوں کو دریائے جہلم میں ڈال دیا اور بڑے بڑے پتھر[۵۳] اُن میں بھروائے تاکہ ان

---

۵۱ THE MOGHAL EMPIRE BY MICHAL PROWDA PAGE 260

۵۲ آئین اکبری میں اس جرنیل کا نام "ترتم تائی" لکھا ہے۔ ۵۳ تاریخ روضۃ الصفا

سے ملتان پر حملہ کر سکے۔ جب یہ فوج ملتان پہنچی تو اُس نے منجنیقوں[1] سے قلعہ پر سنگباری شروع کی۔ فصیل جگہ جگہ سے شکستہ ہو گئی۔ ہاورتھ صاحب کے بیان کے بموجب طرطائی کے ساتھ مغل شہزادہ "بیلا" بھی تھا۔ یہ دونوں جرنیل فوج کو لڑا رہے تھے۔

قباچہ درویشوں کی پناہ میں

ان ایام میں شیخ الاسلامؒ شیخ الشیوخ سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے سخت فکرمند ہو رہے تھے۔ مغلوں کی فوج نے اسلامی ممالک میں جو دھاندلی مچائی تھی۔ طوفانِ نوحؑ کے بعد یہ بہت بڑی مصیبت تھی۔ جو نوعِ انسانی پر نازل ہوئی تھی۔ منگولیا کی اس تند و تیز آندھی نے ہزاروں شہروں کو بے چراغ کر دیا تھا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ پریشانی کے اسی عالم میں بغداد کو روانہ ہوئے۔ ابھی ایک منزل چلے تھے کہ سید جلال الدین تبریزیؒ[2] اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملاقات ہوئی جو بغداد سے چلے آتے تھے۔ شیخ جلال الدین تبریزی نے فرمایا:

"شیخ الشیوخ کا فرمان یہی ہے کہ آپ واپس چلے جائیں"[3]۔

مرشد کی خیر و عافیت سن کر آپ کو اطمینان ہوا اور اپنے باکمال مہمانوں کے ہمراہ ملتان کو واپس لوٹ آئے۔

۱۔ تاریخ جہانکشائے جوینی

۲۔ شیخ جلال الدین تبریزیؒ اگرچہ شیخ ابوسعید کے مرید تھے۔ لیکن اُن کی وفات کے بعد بغداد میں چلے آئے اور شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں رہنے لگے۔ ہر سال ان کے ہمراہ حج کو جاتے اور زیارت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوتے۔ شیخ الشیوخ جب بوڑھے ہو گئے تو توشہ جو اُن کے ہمراہ لے کر چلتے تھے ٹھنڈا ہو جانے کے سبب ان کے مزاج کے موافق نہ رہتا۔ اس لیے شیخ جلال الدین ہمیشہ شیخ کے محافہ کے ہمراہ چولہا و دیگ سر پر اٹھائے پیدل چلا کرتے تھے اور جب شیخ کو کھانے کی اشتہا ہوتی، وہیں طعام گرم کر کے حضرت کے پیش کرتے۔ پہلی مرتبہ شیخ الاسلامؒ کے ہمراہ بغداد سے خراسان آئے تھے۔ لیکن جب شیخ الاسلام انہیں چھوڑ کر ملتان چلے آئے، تو وہ پھر بغداد میں پہنچے اور شیخ الشیوخ کی خدمت میں رہنے لگے۔ جب قطب الاقطاب بختیار کاکیؒ بغداد سے ہندوستان کو روانہ ہوئے تو یہ ساتھ ہو لئے۔

۳۔ فوائد الفواد، جلد چہارم، ص ۱۲۶۔

شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج فرماتے ہیں کہ جن دنوں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ جلال الدین تبریزی و شیخ المسلمین بہاؤالدین زکریا یکجا ملتان میں مقیم تھے۔ تینوں بزرگوار عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے تھے اور نوافل میں پورا قرآن مجید ختم کرتے تھے[1]۔ انہی لیل و نہار میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ مغلوں نے ملتان پر حملہ کر دیا۔ سنگباری سے قلعہ کی دیوایں مسمار ہو گئیں۔ قباچہ گھبرا کر شیخ الاسلام کی خانقاہ میں آیا اور عرض کی:

"اے خدا یاد درویشو! کوئی چارہ گری کرو۔ خدا کی قسم! اگر مغل شہر میں گھس آئے تو ایک متنفس بھی زندہ نہ بچے گا۔

اسی وقت قطب الاقطاب نے ایک تیر منگوایا اور قباچہ کے حوالے کر کے فرمایا:

"یہ تیر لے جاؤ اور رات کے اندھیرے میں اسے بُرج پر سے دشمنوں کی طرف پھینک دو"

حضرت فریدالدین مسعودؒ فرماتے ہیں کہ قباچہ وہ تیر لے کر چلا گیا اور حسب الارشاد رات کو کمان لے کر قلعہ کے ایک بُرج پر پہنچا اور چلّہ چڑھا کر پوری قوت سے مغلوں کی فوج پر دے پھینکا۔ خدا کی شان! کہ رات کی تاریکی میں وہ بے پناہ لشکر اس طرح غتربود ہوا کہ صبح کو اس کا نشان تک نہ رہا۔ مولانا جمالیؒ اس واقعہ کو اپنے الفاظ میں اس طرح لکھتے ہیں:

"نقل است از حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین محمد بدایونی قدس سرہٗ درآنچہ حضرت سلطان العاشقین شیخ قطب الدین اوشی و برہان العارفین شیخ جلال الدین تبریزی و شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرھم در یکجا مے بودند۔ یکایک ہزارہا ملاعین از جانب خطا و فتن رسیدند و حصن ملتان را در محاصرہ کشیدند چنانچہ خلق ملتان

---

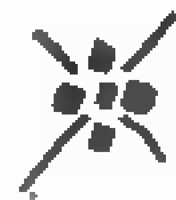
[1] شیخ فریدالدین مسعودؒ فرمود کہ وقتے شیخ قطب الدین بختیار اوشی و شیخ جلال الدین تبریزی و شیخ بہاء الدین یک جا بودند۔ ہر سہ بزرگوار شب نماز ختم قرآن مجید مے کردند۔ و ہمدراں وضو نماز بامداد مے گذاردند۔ (خلاصۃ العارفین)

دست از جان شستند۔ و آں قباچہ بیگ توجہ بحضرت خواجہ قطب الدین اوشی نمود۔ و دعائے از بہر دفع آں بلا از حضرت ایشاں درخواست۔ حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہٗ تیرے طلبیدہ و بدست قباچہ داد و فرمود کہ چوں نماز شام در آید۔ بہ بُرج حصار برآئے۔ و بجانب کفار فجار بینداز۔ قباچہ مذکور آں تیر را گرفت و بہ بُرجے برآمد و آں تیر را بکمانے در آوردہ بجانب آں ملاعین برتاب داد۔ و بخانہ آمد۔ بفرمان خداوند تعالیٰ شباشب آں قوم شوم از نواحی آں بوم چناں غائب و نایاب شدند کہ اثرے از ایشاں پدید نگشت "۔

اس واقع کا قباچہ کے معتقدات پر یہ اثر ہوا کہ وہ درویشوں کو ملک کے لیئے "آیہ رحمت" سمجھنے لگ گیا۔ چنانچہ چند روز بعد جب حضرت قطب الاقطاب بختیار کاکی دہلی کو اور شیخ جلال الدین تبریزی غزنی کو روانہ ہونے لگے تو اس نے بڑی منت خوشامد سے انہیں کچھ اور عرصہ ٹھہرانے کی کوشش کی اور عرض کی :

"چندگاہ دیگرے سایہ برکت دریں مقام ارزانی فرمائید"۔

لیکن حضرت قطب الاقطاب نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم لوگ زیادہ عرصہ یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ کیونکہ یہ مقام[1] حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کی تحویل میں دیا جا چکا ہے۔ ہمیشہ اُن کی پناہ میں رہے گا۔ یہ کہہ کر دونوں بزرگ اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔



---

[1] ایں مقام در ذمہ و حوالہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ است و ہموارہ در پناہ او خواہد بود۔
(سیر العارفین ، قلمی ص ۱۹)

سوانح

۶۲۱ھ تا ۶۲۵ھ

۶۲۱ھ میں حضرت شیخ الاسلامؒ کے مشکوئے معلّٰی میں حضرت صدرالدین محمد عارف پیدا ہوئے۔ اس تقریبِ سعید پر ارادت مندوں نے بڑی خوشیاں منائیں اور حضرت شیخ الاسلامؒ نے اہلِ ملتان کے غرباء و مساکین کے دامن زر و جواہر سے بھر دیئے۔ اس زمانے میں حضرت کا دستر خوان بہت وسیع ہو گیا تھا اور اس پر نہایت پُر تکلف اور مختلف النوع کھانے ترتیب دیئے جاتے تھے۔ اس پر سینکڑوں علماء و مشائخ اور ہزاروں فقراء دونوں وقت کھانا کھاتے تھے۔ حضور مہمانوں کو شریکِ طعام دیکھ کر نہایت مسرور اور محظوظ ہوتے تھے اور جس قدر لوگ زیادہ آتے تھے، اتنی ہی رُخِ انور پر بشاشت زیادہ نظر آتی تھی۔ چنانچہ ایک روز جبکہ بے شمار درویش حاضر تھے، اسی اثناء میں دستر خوان بچھایا گیا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ بھی کھانے کے دوران میں کسی درویش کے ساتھ شریکِ طعام ہو گئے۔

اسی دوران میں ایک درویش کو دیکھا کہ نوالہ شوربا میں تر کر کے کھا رہا ہے۔ آپ نے خوش ہو کر فرمایا:

"سبحان اللہ! اتنے بڑے مجمع میں یہی شخص بہترین کھانا کھا رہا ہے۔ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ثرید کو باقی کھانوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے، جیسے مجھے انبیاء علیہم السلام پر اور عائشہؓ کو مستوراتِ عالم پر۔"

الغرض حضرت شیخ الاسلامؒ ان بزرگوں میں سے تھے جن پر یہ آیت صادق آتی ہے:

كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ط (المؤمنون: ۵۱)

"یعنی پاک کھانا کھاؤ اور نیک عمل کرو۔"

آپ کا دستر خوان بھی شاندار تھا اور ذوقِ عبادت بھی۔

لطیفہ ایک مرتبہ ایک یاوہ گو آدمی ایسے وقت حضرت شیخ الاسلامؒ کی خدمت میں آیا جبکہ کھانے کی کوئی چیز آپ کے پاس موجود نہ تھی۔ اُس نے کہا حضرت! کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ "مَنْ ذَارَ حَیًّا وَّلَمْ یَذُقْ مِنْهُ شَیْئًا فَکَاَنَّمَا ذَارَ مَیِّتًا"۔ یعنی جس نے کسی زندہ کی زیارت کی اور اس کی کوئی شئے نہ چکھی، گویا اُس نے مردہ کی زیارت کی۔ حضور نے مسکرا کر فرمایا:

"ہاں! صحیح ہے! مگر عوام اس حدیث کے معنی نہیں جانتے۔ کیونکہ خلق کی دو قسمیں ہیں، عوام و خواص۔ عوام سے مجھے غرض نہیں، خواص جب آتے ہیں، اپنی استعداد کے مطابق فیض پاتے اور ذوق حاصل کرتے ہیں۔ اس حدیث شریف کے یہی معنی ہیں[1]۔"

ایک مقروض کی امداد حضرت کا خزانہ غرباء اور مستحقین کے لیے ہر وقت کھلا تھا۔ محتاج اور مساکین آتے تھے اور حضرت کے دربار سے مالا مال ہو کر جاتے تھے۔ بعض اوقات یہ داد و دہش اعجاز کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ الاسلامؒ حجرہ شریف میں مصروفِ عبادت تھے۔ چند درویش بھی چُپ چاپ پاس بیٹھے تھے۔ دفعتاً حضور دامن سمیٹتے ہوئے مصلیٰ سے اُٹھے اور ایک تھیلی روپوؤں کی ہاتھ میں لیے باہر نکل گئے۔ درویش بھی حیرانی کے عالم میں لپک کر ساتھ ہو لیے باہر آکر دیکھا کہ چند آدمی ایک غریب الحال شخص کو اپنے قرضہ کی وصولی کے لیے تنگ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اُس آدمی کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ حضرت نے اُنہیں بلا کر فرمایا "یہ تھیلی لے لو اور جس قدر روپے اس شخص سے لینے ہیں۔ نکال لو۔"

قرض خواہ نے اپنے قرض سے کچھ روپے زیادہ لینے چاہے۔ فوراً اُس کا ہاتھ خشک ہو گیا۔ چلّا کر بولا "حضور معاف فرمائیے، میری زیادہ لینے سے توبہ ہے۔"

---

[1] مرا با عوام کار نیست و زیارت ایشاں را اعتبار ے نہ۔ اما چوں خواص بر من مے آیند بقدر حال خویش فیضے مے یابند و ذوقے مے گیرند معنی حدیث ایں است۔ (سیر العارفین قلمی ص ۲۱)

معاً ہاتھ درست ہو گیا۔
مفلوک الحال مقروض حضرت کو دُعائیں دینے لگا۔ آپ درویشوں کے ہمراہ خلوت خانہ کو واپس تشریف لے آئے اور فرمایا کہ خداوند کریم نے مجھے اس شخص کی امداد کے لیے بھیجا تھا۔ الحمدللہ! کہ اس کا مطلب پُورا ہو گیا۔

چور اندھے ہو گئے ایک دفعہ چند ڈاکو چوری کے ارادے سے حضرت کی خانقاہ میں گھس آئے۔ آپ مصلّٰی پر بیٹھے اللہ اللہ کر رہے تھے۔ جونہی حضور کی نظر چوروں پر پڑی ، سب کے سب اندھے ہو گئے اور فریاد کرنے لگے کہ "خدا کے لیے ہمیں اس عذاب سے نجات دِلائیے۔ آئندہ کے لیے چوری سے ہماری توبہ ہے"۔
شیخ الاسلامؒ نے رحم کھاکر جو توجہ فرمائی ، سب کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور فسق و فجور سے توبہ کر کے بڑے مرتبہ کے درویش بن گئے ؎

آہن کہ بپارس آشنا شُد فی الحال بصورت طلا شُد

افطاری میں شرکت ایک مرتبہ رمضان المبارک کے مہینے میں شہر کا حاکم آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ میرا ایک مصاحب اہلِ علم ہونے کے باوجود اولیاء کی کرامت کا قائل نہیں۔ آپ یہ سُن کر خاموش رہے۔ حاکم نے مکرر سہ کرر یہ ماجرا بیان کیا اور التجا کی کہ براہِ کرم اسے گمراہی سے نکالنے کے لیے کوئی تجویز کی جائے۔
آپ نے ایک خادم کو بُلا کر فرمایا ، شہر میں اعلان کرادو کہ آج کوئی شخص بغیر ہمراہی بہاءالدین کے روزہ افطار نہ کرے اور افطاری کے وقت پر ہر شخص اپنے گھر میں مقیم رہے۔
الغرض اس دن حضرت شیخ الاسلامؒ شہر کے تمام مُسلمانوں کے ساتھ افطاری میں شریک ہُوئے اور حاکمِ ؎ شہر کے مصاحب کے ساتھ ساتھ سینکڑوں دوسرے آدمی بھی اہل اللہ

؎ تذکرہ نگاروں نے حاکم کا نام نہیں لکھا۔ اغلب گمان یہی ہے کہ سُلطان ناصرالدین قباچہ نے ہی آپ سے یہ استدعا کی ہو گی۔

کی کرامت پر ایمان لے آئے کہ یہ خاصانِ خدا کا تصرف ہے۔ ہر آدمی کو ایسا کرنے کی طاقت نہیں۔

قباچہ کی بے راہروی

سلطان ناصر الدین قباچہ درشت خو انسان تھا۔ روزانہ لوگ اس کے مظالم کی آ کر فریاد کرتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام کبھی تو قباچہ کو سفارش فرماتے اور کبھی اُنہیں خلعت و دینار دے کر راضی کر دیتے۔ بجائے اس کے کہ قباچہ حضرت کی کرم بخشی کا معترف ہوتا۔ اُلٹا حضور سے بدگمان رہتا اور حضور کے اثر و نفوذ کو اپنے حق میں زہر ہلاہل خیال کرتا تھا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت شیخ الاسلامؒ سلطان التمش کے دوست تھے۔ لیکن اب تک حضور نے قباچہ سے بھی کوئی دشمنی نہیں کی تھی۔ التمش سے دوستی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُسے شیخ الاسلامؒ کے مرشد شیخ الشیوخ[1] نے دُعا کی تھی اور وہ خود دیندار اور پارسا انسان تھا۔ قباچہ اُوچ شریف، ملتان اور ٹھٹھہ کا حاکم تھا

---

[1] مولانا سراج منہاج صاحب طبقات ناصری لکھتے ہیں کہ شمس الدین التمش ترک نوجوان تھا۔ جب یہ گرفتار ہُوا، خواجہ جمال الدین بخاری اُسے خرید کر تجارت کے سلسلے میں بغداد لے گیا۔ اس وقت یہ پندرہ سالہ حسین و جمیل نوجوان تھا۔ خواجہ نے اُسے کھانا لینے کے لیے بازار بھیجا۔ اچانک اُس کا گزر حضرت شیخ الشیوخ کی خانقاہ سے ہُوا۔ اُس کی نظر جونہی حضرت کے چہرے پر پڑی۔ بے اختیار اندر چلا گیا اور چند پیسے جو اس وقت جیب میں رکھتا تھا، نکال کر آگے رکھ دیئے اور طالبِ دُعا ہُوا۔ حضرت شیخ الشیوخ نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور اسے دیکھ کر فرمایا کہ مجھے اس نوجوان کے چہرہ میں بادشاہی کی تجلیات روشن دکھائی دیتی ہیں (من در چہرہ ایں شخص انوارِ سلطنت لامع مے بینم) شیخ اوحد الدین کرمانی پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی شفقت کی نظر سے التمش کو دیکھا اور فرمایا کہ آپ کی برکت سے دنیاوی سلطنت میں اس کا دین بھی محفوظ رہے گا۔ یہ اُنہیں بزرگوں کی دُعا کا صدقہ تھا کہ دہلی کا تاجدار ہونے کے باوجود التمش اپنے زمانے کا بہت بڑا درویش بھی تھا۔ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا محبوب مرید کہ جب حضرت کا انتقال ہُوا تو جنازہ اسی درویش صفت تاجدار نے پڑھا۔ سچ ہے ؎

این سعادت بزور بازو نیست   تانہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ صوبے قدیم سے دہلی کے تابع چلے آتے تھے۔ لیکن قباچہ بیگ نے نہ صرف خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بلکہ اس نے سلطان التمش کے خلاف سازشوں کے جال پھیلانے شروع کر دیئے۔ احکامِ شرع کی ترویج میں بھی سستی ہونے لگی اور بادشاہ کے متعلقین نے فسق و فجور شروع کر دیا۔

اتفاق سے انہی دنوں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے غریب ہمسایہ کو ایک ہزار تنکہ کے عوض گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا بوڑھا باپ روتا ہوا آیا۔ آپ نے ایک ہزار تنکہ کی تھیلی اُسے مرحمت فرمائی کہ بادشاہ کو ادا کر کے اپنے بیٹے کو چھوڑا لائے۔ اسی قسم کی اور بہت سی شکائتیں جمع ہو گئیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے قباچہ کو بہت کچھ سمجھایا، لیکن جب کوئی نتیجہ مرتب نہ ہُوا تو حضرت نے سلطان التمش کو ایک خط لکھا کہ یہاں شریعت کی بہت بے حرمتی ہو رہی ہے اور نیز قباچہ آپ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ان دنوں ملتان شہر کے حاکم قاضی شرف الدین اصفہانی تھے۔ وہ بھی عالم باعمل اور متدین ہونے کے سبب قباچہ کی حرکتوں سے نالاں تھے۔ انہوں نے بھی اسی نہج کا ایک خط سلطان کے نام ارسال کیا۔

سوءِ اتفاق سے دونوں خطوط پکڑے گئے۔ قباچہ اُنہیں پڑھ کر سخت مشتعل ہُوا اور ایک محضر کے ذریعے دونوں کو طلب کیا۔

شیخ الاسلامؒ قباچہ کے دربار میں

اتفاق سے حضرت شیخ الاسلامؒ اور قاضی شرف الدین بیک وقت دربار میں پہنچے۔ قباچہ استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کو تو تخت پر اپنے دائیں جانب بٹھایا اور قاضی صاحب کو اپنے سامنے بیٹھنے کا حکم دیا اور ان کا لکھا ہُوا خط جیب سے نکال کر اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ قاضی صاحب خط کو دیکھ کر دم بخود چُپ ہو رہے۔ قباچہ نے جھنجھلا کر جلاد کو اشارہ کیا۔ اُس نے بڑھ کر قاضی صاحب کا سر اُڑا دیا۔ اس کے بعد قباچہ نے دُوسرا خط نکالا اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے آگے رکھ دیا۔ حضرت نے دیکھتے ہی فرمایا:

"ہاں! یہ میرا خط ہے، میں نے خُدا کے حکم سے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے۔
تُم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟"

قباچہ نے جب یہ سُنا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اشارہ کیا کہ کھانا لاؤ۔ اس خیال پر کہ اگر شیخ کا دل صاف نہیں ہوگا تو وہ کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائیں گے اور اس طرح انہیں ایذا پہنچانے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔ لیکن جب کھانا لایا گیا، تو حضرت بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ پڑھ کر کھانے میں شریک ہو گئے۔

یہ دیکھ کر قباچہ بہت شرمندہ ہُوا اور اُس نے حضرت کو اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا۔[1]

قباچہ کا عبرتناک انجام

مولانا ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

"سلطان ناصر الدین قباچہ کو جب جلال الدین کی لوٹ کھسوٹ سے فرصت ملی تو اُس نے پھر سلطان التمش سے پرخاش شروع کی اس لیے سلطان ۶۲۵ھ میں دہلی سے اُوچ کو روانہ ہُوا۔ ناصر الدین قباچہ قلعہ اوچ کو محکم کر کے خود قلعہ بھکر کی طرف بھاگ گیا اور اپنے وزیر عین الملک حسین اشعری کو حکم دیا کہ خزانہ کو قلعہ اوچ سے منتقل کر کے بھکر میں پہنچا دے۔ سلطان التمش نے خود قلعہ اُوچ کا محاصرہ کیا اور اپنے وزیر نظام الملک جنیدی کو ناصر الدین قباچہ کے تعاقب میں روانہ کیا۔ ایک مہینہ تک قلعہ اوچ کا محاصرہ رہا۔ پھر صُلح سے فتح ہو گیا۔"

ناصر الدین قباچہ کے سر پر جو گزری وہ تاریخ ملتان کے مؤلف مخدوم شیخ سید محمد یوسف صاحب کی زبانی سُنیئے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] حاشیہ بزم صوفیہ ص ۱۹۴

"وملک قباچہ در بھکر نیز توقف خود مقرون بصلاح ندیدہ ازانجا بعزم فرار مع اہل وعیال در کشتی سوار شدہ خواست کہ بساحل نجات رسد۔ امّا چوں سفینۂ او میانِ دریا رسید غرق بحر فنا گردید وفتح وظفر نظام الملک رانصیب شُد"

یعنی وہ فرعون جو مُلتان کے تخت پر بیٹھ کر سلطان التمش کو خاطر میں نہ لاتا تھا، جس نے قاضی شرف الدین اصفہانی کو دربار میں طلب کر کے بے گناہ شہید کیا تھا۔ اس قدر ہراساں ہُوا کہ سُلطان کے مقابلے میں بھی نہ نکل سکا۔ تاب مقاومت نہ لاکر اُچ سے ملتان اور ملتان سے بھکر پہنچا۔ لیکن جب نظام الملک نے قشون قاہرہ کے ساتھ تعاقب کیا تو بھکر میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ اپنے اہل وعیال سمیت کشتی میں سوار ہُوا تاکہ سندھ کی طرف نکل جائے۔ لیکن قاضی شرف الدین اِصفہانی کے جبار خدا کی "بطش شدید" نے اسے عین منجدھار میں اس طرح لاپکڑا کہ سنبھلنے تک کی مہلت نہ دی۔ سندھ کی خوف ناک لہریں ڈائن کی طرح اُسے بال بچّوں سمیت نگل گئیں۔ مصر کے فرعون کی لاش تو بچ رہی تھی، لیکن ملتان کے فرعون کا ایک بال بھی اس گرداب سے نہ بچ سکا۔ کسی عارف نے کیا خُوب کہا ہے ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دُعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید



یارانِ طریقتؒ

فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

حضرت شیخ الاسلام کی زندگی میں جن قدسی نفوس کو آپ کی مصاحبت کا شرف حاصل ہُوا ہے اُن میں حضرت گنج شکرؒ زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں۔ محبّت اور اخوّت کا یہ رشتہ دونوں بزرگوں میں اخیر دم تک قائم رہا۔ اس یگانگت اور مودّت سے بعض مؤرخین کو عجیب غلط فہمی ہوئی ہے کہ اُنھوں نے اُنہیں خالہ زاد بھائی مشہور کر دیا۔ یہاں تک کہ حضرت محدّث دہلوی بھی "اخبار الاخیار" میں "مے گویند" کی آڑ لے کر یہی کچھ کہہ گئے۔ حالانکہ یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔

صاحب "بزمِ صوفیہ" نے حضرت گنج شکرؒ کی تاریخ ولادت ۵۸۲ھ لکھی ہے۔ لیکن سیر الاولیاء اور دوسری ثقہ تاریخوں میں ۵۶۹ھ مرقوم ہے۔ حضرت کے روضۂ مبارکہ پر بھی یہی تاریخ کندہ ہے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بیعت کے وقت حضرت کی عمر شریف اٹھارہ برس تھی اور بیعت کے بعد تقریباً اسّی برس تک زندہ رہے۔ اس لحاظ سے بھی آپ کی تاریخِ ولادت ۵۸۲ھ قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضرت کی تاریخِ وفات بالاتفاق ۶۶۴ھ ہے۔

حضرت گنج شکرؒ کوٹھوال[۱] (ضلع ملتان) کے بہت بڑے عالم مولانا جمال الدین سلیمان کے صاحب زادے تھے۔ ابھی آپ چھوٹے سے بچّے ہی تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُتر

---

[۱] یہ مقام ملتان شہر سے بارہ میل جانب مشرق بدھلہ سنت روڈ پر واقع ہے۔ اور اس میں حضرت گنج شکر قدس سرّہٗ کے والد بزرگوار کا مزارِ پُرانوار زیارت گاہِ خلائق ہے۔ یکم، ۲ اپریل کو آپ کا عُرس بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے۔

گیا۔ حضرت کی والدہ نے آپ کو گاؤں کے عالم کے پاس پڑھنے بٹھایا۔ جب یہاں سے تعلیم پوری ہو گئی تو تکمیلِ علوم کے لیے آپ کو ملتان بھجوا دیا۔ یہاں آپ نے قرآن حفظ کیا اور مولانا منہاج الدین کی مسجد میں فقہ کی مشہور کتاب "نافع" شروع کی۔

ایک دن حضرت اسی مسجد میں بیٹھے کتاب نافع کا مطالعہ کر رہے تھے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھنے کے لیے اس مسجد میں چلے آئے۔ آپ کو کتاب کے مطالعہ میں معروف دیکھ کر پوچھا:

"میاں صاحبزادے کیا پڑھ رہے ہو؟"

آپ نے کتاب سے نظر اُٹھا کر دیکھا اور جواب دیا:

"حضرت! نافع پڑھ رہا ہوں۔"

خواجہ صاحب نے مُسکرا کر دوبارہ سوال کیا:

"کیا یہ کتاب تجھے نفع دے گی؟"

حضرت گنج شکرؒ نے عرض کی:

"حضور اس کتاب نے تو کیا نفع دینا ہے، البتہ حضرت کی نظر کیمیا اثر سے نفع پہنچنے کی اُمید ضرور ہے۔"

یہ کہہ کر خواجہ صاحب کے چہرہ پر دوبارہ نظر کی۔ عجب جاہ و جلال برستا نظر آیا۔ آنکھیں چار ہوتی تھیں کہ دل کی کائنات میں تہلکہ برپا ہو گیا۔ فوراً سر قدموں میں رکھ دیا اور حضرت کے دستِ حق پرست پر بیعت کر لی۔ صاحب بزمِ صوفیہ لکھتے ہیں کہ خواجہ بختیار کاکیؒ نے بیعت کے وقت گنج شکر کو مخاطب کر کے یہ رباعی پڑھی تھی:

مقبول تو جز مقبل جاوید نشد ── وز لطف تو ہیچ بندہ نومید نشد

لطفت بکدام بندہ پیوست دمے ── کان ذرہ بہ از ہزار خورشید نشد

مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی صاحب لکھتے ہیں کہ خواجہ بختیار کاکیؒ نے دہلی میں آ کر حضرت گنج شکر کو مرید کیا تھا۔ لیکن مولانا جمالی کا دعویٰ یہ ہے کہ بیعت ملتان میں ہوئی تھی۔ "ہمدراں حین حضرت شیخ فرید الدین مسعود بشرفِ ارادت مشرف شد۔" سے اس امر کی صاف

طور پر وضاحت ہوتی ہے۔ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"بتحقیق پیوستہ است کہ حضرت فریدالدین مسعود در ملتان بشرف بیعت حضرت زبدۃ الاسرار شیخ الاسلام قطب الدین بختیار اوشی مشرف شدہ"

اب بحث طلب امر یہ رہ جاتا ہے کہ کیا حضرت گنج شکرؒ نے اسی تقریب پر بیعت کی تھی جبکہ مغلوں نے ملتان پر حملہ کیا تھا یا کوئی اور موقع تھا۔ بقول سیر العارفین بابا صاحب کی تاریخ پیدائش ۵۶۹ھ ہے اور مغلوں کا حملہ ۶۱۸ھ میں ہوتا ہے۔ یعنی مغلوں کے حملہ کے وقت آپ ۴۹ برس کے تھے۔ لیکن تذکرہ نگار بیعت کے وقت آپ کی عمر ۱۸ برس بتاتے ہیں۔ اور یہ امر اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ کتاب "نافع" کا مطالعہ اسی عمر میں ہی موزوں معلوم ہوتا ہے۔ پھر خواجہ قطب صاحب کا یہ کہنا کہ پہلے علوم ظاہرہ کی تحصیل میں کوشش کیجئے کیونکہ بے علم زاہد مسخرہ شیطان ہے۔ اس سے بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ ابھی طالب علم ہی تھے اور طالب علم کی عمر ۱۸ برس ہی ہونی چاہیئے۔ اگر حضرت کی تاریخ پیدائش کو ۵۶۹ھ تسلیم کیا جائے تو ۵۸۶ھ اور اگر ۵۸۲ھ تاریخ ولادت صحیح باور کی جائے تو ۶۰۰ھ میں حضرت فریدالدین گنج شکرؒ نے خواجہ قطب صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت قطب الاقطاب ۵۸۶ھ یا ۶۰۰ھ میں ملتان سے گزرے ہوں اور ۶۱۸ھ میں اجمیر سے ہوکر دوبارہ ملتان تشریف لائے ہوں۔ اس پر بھی سید جلال الدین تبریزیؒ کی معیت ایک اشکال بن کر سامنے آجاتی ہے۔

کیونکہ اگر قطب صاحب ۶۰۰ھ میں ہندوستان آئے ہوں تو سید جلال الدین تبریزی بھی لامحالہ ہمرکاب ہوں گے، تو کیا وہ اتنا طویل عرصہ حضرت کے ہمراہ پھرتے رہے ہوں گے۔ بہرحال شیخ جلال الدین تبریزی کا ۶۱۸ھ میں خواجہ قطب الاقطاب بختیار کاکیؒ کے ہمراہ ملتان تشریف لانا اور پھر یہ کہ بغداد سے ہی ہمراہ چل کر ملتان پہنچنا مورخین کے لیے بحث کا ایک اور دروازہ کھول دیتا ہے۔ الغرض جب حضرت بختیار کاکیؒ نے دہلی کا رخ کیا تو شیخ فریدالدین مسعود بھی ہمرکاب روانہ ہوئے۔ تین منزلیں طے کی تھیں کہ حضرت نے آپ کو طلب کر کے فرمایا:

"ابھی یہاں ٹھہریئے اور علومِ ظاہرہ کی تحصیل میں پوری کوشش کیجئے۔ کیونکہ بے علم زاہد مسخرہ شیطان ہے۔"

چنانچہ حضرت فرید الملت مرشد کے حکم سے ملتان لوٹ آئے۔ کچھ عرصہ یہاں تعلیم پائی پھر قندھار تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ یہاں سے بغداد پہنچے اور شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی، سیف الدین باخرزی، سعد الدین حموی، بہاء الدین حموی، شیخ اوحد الدین کرمانی، شیخ فرید الدین نیشاپوری جیسے اکابر صوفیاء سے صحبتیں کیں اور استفادہ کیا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ سے بھی پہلی ملاقات اسی سفر کے دوران میں ہوئی۔ لیکن کب اور کہاں؟ تاریخ کے اوراق اس بارے میں خاموش ہیں۔

مولانا جمالیؒ لکھتے ہیں کہ پانچ برس کی سیاحت کے بعد حضرت گنج شکرؒ اپنے پیر کی خدمت میں دہلی پہنچے۔ خواجۂ خواجگان نے غزنی دروازہ کے برج کے نیچے ایک حجرہ آپ کو مرحمت کیا۔ جہاں آپ ریاضت و مجاہدہ میں مشغول ہوگئے۔ پندرہ روز کے بعد پیر کی جناب میں حاضری دیتے تھے۔ بخلاف اس کے کہ شیخ بدر الدین غزنوی اور شیخ احمد نہروانی جیسے درویش آٹھوں پہر حضرت کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور ایک لحظہ کے لیے جدا نہیں ہوتے تھے۔

سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ اس ریاضت اور مجاہدہ میں آپ کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ جب شیخ الہند معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو ملنے کے لیے آپ کے حجرہ میں تشریف لائے تو آپ ضعف کے سبب تعظیم کو نہ اٹھ سکے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے آپ کے لیے دعا کی۔ اسی وقت ہاتف نے ندا دی:

"فرید را برگزیدم"

چنانچہ شیخ الہندؒ نے آپ کو خلعت عطا کی اور حضرت بختیار کاکیؒ نے اپنی خلافت کی دستار ان کے سر پر باندھی۔ شیخ الہندؒ نے حضرت شہید المحبت بختیار کاکیؒ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"بابا قطب الدین! عجب شاہبازے در دام آوردۂ کہ بجز سدرۃ المنتہی آشیانہ

نمے گیرد۔"

جب دہلی میں آپ کا چرچا زیادہ ہونے لگا، تو حضرت فرید الملت اپنے مُرشد کی اجازت سے ہانسی چلے آئے۔ لیکن یہاں بھی معتقدین نے نہ رہنے دیا۔ ہر وقت ہجوم رہنے لگا۔ بالآخر آپ یہاں سے ملتان کی جانب تشریف لے آئے اور اپنے قدیم مسکن کوٹھوال[۱] میں قیام فرمایا۔

حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ جب حضرت شیخ جلال الدین تبریزیؒ ملتان سے دہلی کو جا رہے تھے تو پہلی منزل کوٹھوال میں ہوئی۔ لوگوں سے پُوچھا کہ یہاں کوئی درویش بھی ہے تاکہ اس کی زیارت کروں۔ انہوں نے کہا ہاں! قاضی شہر کے صاحب زادے اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کے خلیفہ یہاں ہیں۔ جو عید گاہ کے عقب میں رہتے ہیں۔ چنانچہ شیخ جلال الدین آپ کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں کسی نے انار پیش کیا۔ آپ نے حضرت گنج شکر علیہ الرحمۃ کے ہاں پہنچ کر اُسے توڑا اور آپ کی طرف بڑھایا حضرت نے فرمایا: "مجھے روزہ ہے" اور حضرت شیخ جلال الدین نے کھالیا اور رخصت ہو گئے۔ اُن کے روانہ ہونے کے بعد حضرت گنج شکر نے نظر کی تو شیخ کی مسند پر ایک دانہ انار کا نظر پڑا اور شام کو اسی سے روزہ افطار کیا۔ اس دانے کا کھانا تھا کہ دل میں روشنی پیدا ہو گئی۔ یہ دیکھ کر آپ نے دل میں افسوس کیا کہ کاش! شیخ کا کہا مان کر زیادہ دانے کھاتا۔ لیکن جب دہلی میں حضرت خواجہ قطب الاقطاب سے گفتگو ہوئی تو آپ نے فرمایا، وہی ایک دانہ تمہارے لیے کافی تھا اور وہ تجھے مل گیا، کوئی فکر نہ کرو۔

چونکہ کوٹھوال ملتان سے بہت زیادہ قریب تھا، آپ کی شہرت سُن کر ملتان سے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور ہر وقت آپ کے ہاں زائرین کا ہجوم رہنے لگا۔ انجام کار یہاں سے آپ اجودھن[۲] کو روانہ ہو گئے۔ یہاں کے لوگ درشت مزاج تھے۔ کوئی پرسانِ حال

۱؎ سیر الاولیاء، بختیار پرنٹرز، داتا دربار لاہور، ص ۶۹

۲؎ " " " " ص ۷۰

نہ ہُوا، تو لُطف آگیا۔ تنہائی اور سکون کی نعمت کے متلاشی تھے۔ وہ یہیں مل گئی، چنانچہ اسی جگہ کو مسکن بنالیا۔

حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ الاسلام کے پیر و مُرشد حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی سے بڑی عقیدت تھی۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف عوارف المعارف ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی اور اسے درس کے طور پر پڑھاتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ "آپ کے پڑھانے میں یہ اثر تھا کہ سُننے والوں کے ہوش بجا نہیں رہتے تھے۔ مَیں نے اس کتاب کے پانچ ابواب آپ ہی سے پڑھے اور آپ کے بیان کی لذّت سے مجھ پر ایسی بے خودی طاری ہو جایا کرتی کہ اگر ایسی حالت میں موت آجاتی تو ایک بڑی دولت ملتی[۱]"

اس سے بھی شیخ الشیوخ سے عقیدت اور محبّت کا پتہ چلتا ہے کہ جب آپ کے گھر میں فرزندارجمند تولد ہُوا تو اس کا نام شیخ کے نام کی رعایت سے شہاب الدین رکھا۔

حضرت فریدالملّت نے سلوک کی منازل طے کرنے میں بڑی بڑی ریاضتیں طے کیں۔ اُن کا اپنا بیان ہے کہ وہ بیس (۲۰) سال تک عالمِ تفکّر میں کھڑے رہے۔ اُن کے پاؤں متورم ہو گئے اور ان سے خون بہنے لگا۔ اس دوران میں انہیں یاد نہیں کہ کچھ کھایا پیا ہو[۱]۔ ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور اگر کوئی عارضہ بھی لاحق ہوتا یا فصد لیتے تو بھی روزہ افطار نہ کرتے تھے[۲]۔ رمضان میں ہر رات تراویح کے اندر دو کلام پاک ختم کرتے تھے۔ کبھی دس دس پارے زیادہ بھی پڑھ جاتے تھے۔

حضرت محبوب الٰہی کو کئی بار آپ کے ساتھ تراویح پڑھنے کا اتفاق ہُوا۔ ان کا بیان ہے کہ ابھی کچھ رات باقی ہوتی تھی کہ ہم لوگ تراویح سے فارغ ہو جاتے تھے[۲]۔ خشیتِ الٰہی کا یہ عالم تھا کہ مریدوں کے حلقہ میں بات بات پر گریہ طاری ہو جاتا تھا اور

---

[۱] ، [۲] بزمِ صوفیہ ، مطبوعہ معارف اعظم گڑھ ، ص ۱۳۲

[۲] راحت القلوب

اور کبھی کبھی تو دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ یہ شعر آپ کے قلب و دماغ پر خاص طرح سے اثر انداز ہوتا تھا۔ سنتے تو ہائے ہائے کرکے روتے، پڑھتے تو نعرے لگاتے اور بے ہوش ہو جاتے ؎

در کوئے عاشقاں چناں جاں بدہند
کانجا ملک الموت نگنجد ہرگز!

حضرت شیخ الاسلامؒ اور حضرت گنج شکرؒ کے درمیان بڑی محبت تھی۔ سالہا سال تک دونوں نے یکجا بسر کئے اور سفر و حضر میں ایک دوسرے کے شریک حال رہے۔ ان کا باہمی اخلاص دنیاوی راہ و رسم سے وراء الورا تھا۔

ایک موقعہ پر حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے گنج شکر علیہ الرحمۃ کو کسی تقریب پر لکھا:

"میانِ ما و شما عشق بازی است"

چونکہ "عشق بازی" کے لفظ سے عمومیت ٹپکتی تھی، اس لیے حضرت بابا صاحب نے جواب دیا:

"میانِ ما و شما عشق است، "بازی" نیست"[۱]

حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ سے جو عقیدت اور محبت تھی، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مریدوں کو پند و نصائح کرتے وقت حضرت شیخ الاسلامؒ کے ارشادات کو دہراتے اور ان کی عبادت و ریاضت کے ذکر کو مزے لے لے کر بیان کرتے۔

ایک موقعہ پر فرماتے ہیں کہ برادرم بہاء الدینؒ چالیس سال کامل گوشہ نشین رہے اس دوران میں بہت کم لوگوں کو زیارت کا موقعہ ملتا تھا۔

ایک اور موقع پر آپ نے اپنے مریدوں سے ذکر کیا کہ شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریاؒ نے

---

[۱] اخبار الاخیار۔

فرمایا ہے کہ جو شخص تصوّف کی دُنیا میں داخل ہونے کا آرزومند ہو، اُسے چاہیئے کہ سب سے پہلے توبہ کرے اور اپنے دل کو عاداتِ ذمیمہ سے پاک کرے۔ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرّہٗ کے قول کے مطابق وہ عاداتِ ذمیمہ یہ ہیں:
غلّ، غشّ، حقد، حسد، حرص، کبر، بخل، ریا اور غضب۔

حضرت زکریا ملتانیؒ نے فرمایا ہے کہ جب تک آدمی دل کو ان اوصافِ ذمیمہ سے پاک نہ کرلے، گلیم اور صوف پہننا اُسے روا نہیں[1]۔

زہد کی تعریف

فرمایا کہ ایک مرتبہ میں اور برادرم بہاء الدین یکجا بیٹھے تھے۔ زہد کے بارے میں بات چل نکلی۔ شیخ الاسلام ملتانی نے فرمایا:

"زہد تین چیزوں کا نام ہے۔ جس میں یہ نہیں ہیں اُسے زاہد کہلانے کا حق نہیں ہے۔

اوّل: دُنیا کو پہچاننا اور اُس سے مایوس ہونا۔

دوم: مولا کی خدمت کرنا اور اس کے حقوق کی نگہداشت کرنا۔

سوم: آخرت کی طلب اور اس کے حصول میں لگاتار کوشاں رہنا۔

کارِ خود بکجا رسانیدہ

حضرت فرید الملّتؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ملتان پہنچا اور برادرم بہاؤ الدین سے ملاقات کی۔ مصافحہ کے بعد پوچھا:

"فرمائیے! کہاں تک کمال حاصل کیا ہے؟"

میں نے جواب دیا کہ اگر آپ فرمائیں، تو جس کرسی پر ہم بیٹھے ہیں، ہوا میں اُڑنے لگے۔ ابھی یہ جملہ ختم نہیں ہوا تھا کہ کرسی اُڑتی نظر آئی۔

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے کرسی پر ہاتھ مارا، کرسی اپنے مقام پر واپس آگئی۔ فرمایا:

"مولانا فرید الدین! کارِ خود را بکو رسانیدہ۔"

---

[1] تا ازیں جملہ اوصافِ ذمیمہ صافی نشود و پاک نگردد۔ گلیم و صوف پوشیدن او را روا نیست۔

پائے برآب نہادیم وگذشتیم

حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ یہ دُعاگو اور حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا قدس سرہٗ سفر میں تھے۔ اچانک ایک دریا پر جا پہنچے۔ کشتی موجود نہ تھی کہ اس پر سوار ہوکر دریا عبور کرتے۔ سامنے حدِ نگاہ تک خوف ناک موجیں ایک دُوسرے سے ٹکراتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم دونوں بلا تامّل آگے بڑھے اور پانی پر چلتے ہُوئے دریا کے پار پہنچ گئے۔

حضرت گنج شکر علیہ الرحمتہ اگرچہ مستقل طور پر اجودھن (پاک پٹن) میں رہتے تھے، لیکن جب جی چاہتا ملتان آ پہنچتے۔ خاص خاص مہینے سفر کے لیے مقرر تھے جن میں یارانِ طریقت دہلی سے بخارا اور کشمیر سے سراندیپ تک خوف ناک جنگلوں، بے آب وگیاہ ریگستانوں اور مہیب پہاڑوں میں خلقِ خدا کو نیکی کا راستہ دکھانے کے لیے سفر کیا کرتے تھے۔ سردست حضرت گنج شکرؒ کا تذکرہ یہیں ختم کرتے ہیں۔ باقی حالات اپنے اپنے موقع پر پیشِ خدمت کئے جائیں گے۔

آہ! یخِ بخارا

جن دنوں حضرت شیخ الاسلامؒ بخارا میں رہتے تھے۔ ایک نجیب الطرفین سید حضرت علیؒ کو آپ سے بڑی عقیدت ہو گئی۔ آپ کے ملتان چلے آنے کے بعد بھی وہ ہمیشہ آپ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ اُن کے نوجوان صاحبزادے سید جلال اپنے والد کی زبان سے بار بار تعریف سُن کر حضرت شیخ الاسلامؒ کے معتقد ہو گئے اور یہ ارادت وعقیدت یہاں تک پہنچی کہ ایک مرتبہ والدِ بزرگوار سے اجازت لے کر ملتان کو چل پڑے۔ اگرچہ وہ زمانہ بے حد تشویشناک تھا، بخارا سے ملتان تک خُون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ اس کے باوجود آپ سچی تڑپ اور طلبِ صادق کی حفاظت میں بخیر وعافیت ملتان آ پہنچے۔

مولانا جمالیؒ اپنے پیرِ حضرت سماء الحق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سید جلال بخاری ایک سرد علاقے کے رہنے والے تھے۔ ملتان جیسے گرم خطہ میں اگر حضرت شیخ الاسلامؒ کی ذاتِ بابرکات مقیم نہ ہوتی تو شاید وہ ایک لحظہ بھی نہ رہ سکتے۔ اپنے پیر کی وجہ سے اس شہر کی تمازت کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے تھے۔ ایک دن ہوا مطلقاً بند تھی اور آفتاب کا آتشیں کُرّہ عین نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ حضرت سید جلال سرائے غوثیہ میں بے چینی سے بیٹھے پنکھا کر رہے تھے۔ دفعتہً آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور لمبی سانس کھینچ کر فرمایا:

"آہ! یخ بخارا و ر چنیں حرارت کجا یا یم۔"

شیخ الاسلامؒ اس وقت محلسرائے میں تشریف فرما تھے۔ آپ کو کشف کے ذریعے اس صورتِ حال کا علم ہو گیا۔ آپ نے فوراً خدامِ درگاہ کو جماعت خانہ کی صفیں لپیٹنے اور جھاڑو دینے کا حکم دیا۔ اس سے پہلے کبھی حضرت نے دوپہر کے وقت ایسا حکم نہیں دیا تھا۔ اس وقت مطلع بالکل صاف تھا اور بادل کا کہیں نشان نہ تھا۔ لوگ جاکر ابھی جھاڑو دینے میں مصروف تھے کہ دفعتہً نیلے آسمان پر ایک چھوٹا سا لکۂ ابر نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے خانقاہ مبارک پر پھیل گیا۔

سید جلال یہ عجیب طرفہ تماشا دیکھ ہی رہے تھے کہ بادل نے گرجنا اور بجلی نے چمکنا شروع کیا اور مرغی کے انڈے کے برابر اولے گرنے لگے۔ چنانچہ طرفۃ العین میں خانقاہ مبارک کا صحن اولوں سے بھر گیا۔ سید جلال اور خانقاہ کے دوسرے درویشوں نے بڑی خوشی منائی اور ژالے اٹھا اٹھا کر کھانے لگے۔ شہر کے لوگ خانقاہِ غوثیہ پر بارانِ رحمت کے نزول کی خبر سن کر جوق در جوق آنے شروع ہوئے اور تبرک کے طور پر ژالے اٹھا لے گئے۔ سب لوگ حیرت میں تھے کہ یہ عجیب اسرار ہے، سوائے خانقاہ معلیٰ کے کہیں بارش کی بوند تک نہیں پڑی۔

جب ظہر ہوئی خدامِ درگاہ نے صفیں بچھائیں اور حضرت شیخ الاسلامؒ خلوت خانۂ نیاز سے نماز کے لیے برآمد ہوئے، سید جلال پر نظر پڑی تو مسکرا کر فرمایا:

"سید جلال! دریں حال ژالۂ ملتان بہتر است یا یخ بخارا؟"

شاہ صاحب نے ادب سے کھڑے ہو کر جواب دیا:

"ژالۂ ملتان از یخ بخارا بہزار درجہ بہتر و اولیٰ است۔"

اسی روز حضرت شیخ الاسلامؒ نے سید جلال کو خرقہ مرحمت کیا اور شرفِ مصاحبت سے ممتاز فرمایا۔ وہ اسرار و رموز جو حضرت کو شیخ الشیوخ سے ودیعت ہوئے تھے، سید جلال کو اُن سے بہرہ مند کر کے اُچ کی طرف روانہ کیا۔

میر حُسینی کیست[1]

سید نجم الدین رحمۃ اللہ علیہ ہرات کے بہت بڑے سوداگر تھے۔ ایک دفعہ تجارتی قافلہ کے ہمراہ ملتان تشریف لائے اور حضرت شیخ الاسلامؒ کا شرفِ نیاز حاصل کیا۔ اس وقت ان کا نوجوان فرزند میر حسینی بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ اُس نے بھی شیخ کی زیارت کی۔ مگر عمومی حیثیت سے۔ اور کچھ دن بعد یہ دونوں باپ بیٹے قافلے کے ہمراہ واپس ہرات چلے گئے۔

یہاں پہنچ کر میر حسینی نے شاہی فوج میں نوکری کر لی۔ ایک روز شکار کے لیے صحرا کو نکل گیا۔ ایک ہرن نظر آیا۔ یہ گھوڑا دوڑا کر اُس کے قریب پہنچا۔ چاہتا تھا کہ تیر نکال کر اس کا شکار کرے کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو کر نہایت فصاحت سے بولا:

"اے سید! خدا تعالےٰ ترا از اہلِ بیت محمدؐ پیدا کرد محض برائے کار اطاعت و عبادتِ خود آفریدہ نہ برائے شکار کہ کار بیکاران است۔ حالا تو ہمہ کارہائے خود را بیکار ساختی و بکار شکار من پرداختی[2]۔"

---

[1] صدر الدین احمد نام، میر حسینی عرف۔

[2] "اے سید! خدا تعالیٰ نے تجھے اپنے رسول کے اہل بیت سے پیدا کیا ہے۔ تیرا کام خدائے بے نیاز کی اطاعت و عبادت کرنا ہے نہ کہ شکار کہ کارِ بے کاراں ہے۔ تیری یہ حالت ہے کہ اپنے تمام کاروبار چھوڑ کر میرے پیچھے دوڑا پھرتا ہے۔"

یہ کہہ کر ہرن نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جب میر حسینیؒ نے ہرن کی یہ تقریر سنی تو طلب حق کی فرو نہ ہونے والی آتش اس کے سینہ میں بھڑک اٹھی۔ گھر میں آیا اور تمام اثاثہ خدا کی راہ میں لٹا دیا۔ ایک قافلہ ملتان کو جا رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ہولیا۔ چند دنوں کے بعد یہ قافلہ ملتان پہنچا اور کاروان سرائے شاہی میں جا کر قیام کیا۔

جب رات ہوئی شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ نے خواب دیکھا کہ حضرت رسولِ خدا صلے اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں:

"فرزندم میر حسینیؒ در قافلہ است اورا از ایشاں بیروں آرو بکار حق مشغول کن[1]"

صبح سویرے حضرت شیخ الاسلامؒ خود بنفس نفیس کاروان سرائے میں تشریف لے گئے اور بلند آواز سے پکار کر فرمایا:

"میر حسینی درمیانِ شما کیست[2]؟"

سب لوگوں نے میر حسینی کی طرف اشارہ کیا۔ آپ چند قدم اور آگے بڑھے۔ ادھر میر حسینی نے جلال و جمال کے ایک نورانی پیکر کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ادب و احترام سے سروقد کھڑا ہوگیا۔ حضور قریب پہنچے۔ وہ قدموں پر گر پڑا۔ حضرت نے بڑی دلسوزی سے اٹھا کر سینے سے لگایا اور پیار و محبت سے اپنے ہمراہ خانقاہ میں لائے اور مرید کر کے اپنے ارادت مندوں میں جگہ دی۔ بقول مولانا جمالی آپ نے تین برس تک بڑی بڑی ریاضتیں کیں تب جا کر ولایت کے درجے پر فائز ہوئے۔

میر حسینی اپنے زمانے کے بہت بڑے شاعر اور صاحب تصنیف تھے۔ نثر میں نزہت الارواح اور طرب المجالس اور نظم میں زاد المسافرین اور کنز الرموز اپنے شیخ کی آغوشِ شفقت میں بیٹھ کر لکھیں۔ یہ مسودات حضرت شیخ الاسلامؒ کی خدمت میں پیش ہوتے تھے

---

[1] میرا فرزند میر حسینی قافلے میں ہے اسے نکال لا اور خدا شناسی کا راستہ دکھا۔

[2] تم میں میر حسینی کون ہے؟

آپ غور سے اُن کا مطالعہ فرماتے اور مصنف کی کاوش کو سراہتے ۔ وہ سوالات جن کے جواب میں علامہ محمود شوستری رحمۃ اللہ علیہ نے گلشنِ راز تصنیف کی تھی، میر حسینی نے یہیں مرتب کئے تھے۔

بیا بیا عراقی!

انہی ایام میں مولانا فخر الدین عراقی آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ ان کی بیعت کا قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ اس لیے ہم ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں۔

مولانا فخر الدین حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی کے خواہر زادہ تھے[1]۔ ہمدان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں پڑھنے بیٹھے اور نو مہینے میں پورا کلام پاک حفظ کر لیا۔ ہمدان کے لوگ ان کی خوش گلوی پر فریفتہ تھے۔ اس کے بعد علوم متداولہ کی تحصیل میں مصروف ہوئے اور سترہ سال کی عمر میں معقولات و منقولات پڑھ کر آپ فارغ ہو گئے۔

صاحب خزینۃ الاصفیاء[2] کی تحقیق کے مطابق آپ ہمدان میں مدرس مقرر ہوئے۔ آپ کی قابلیت اور تبحر علمی کا بڑا شہرہ تھا۔ دُور دور سے طالبانِ علم و ادب آپ سے استفادہ کرنے کے لیے ہمدان آرہے تھے۔ اہل بلدیہ اور شیخ المکتب کو آپ کی ذات پر ناز تھا۔ عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ آپ بہت بڑے شاعر بھی تھے اور یہ چیز اکتسابی نہیں وہبی تھی۔ زبان میں کافی سوز و گداز تھا۔ مشاعروں میں جب آپ اپنا کلام سنانے کھڑے ہوتے ہر طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسنے لگتے تھے۔ الغرض آپ قابلِ رشک زندگی بسر کر رہے تھے کہ یکایک ایک ایسا سانحہ در پیش آیا، جس نے آپ کی دُنیا ہی بدل ڈالی۔

لہ خزینۃ الاصفیاء، جلد دوم ص ۳۲ ۔ مطبوعہ نولکشور پریس، کان پور

۲ہ نفحات الانس ص ۱۲ام ، مطبوعہ اسلامیہ سیم پریس لاہور و خزینۃ الاصفیاء جلد دوم ص ۳۲ ۔ مطبوعہ نولکشور پریس کان پور۔

صاحب بزمِ صوفیہ لکھتے ہیں کہ ایک دن آپ مدرسہ میں درس دے رہے تھے کہ دفعتہً قلندروں کی ایک جماعت پہنچی اور آپ کو دیکھ کر یہ غزل پڑھنے لگی ؎

ما رخت ز مسجد بخرابات کشیدیم
خط بر ورقِ زہد و کرامات کشیدیم
در کوئے مغاں در صفِ عشاق نشستیم
جام از کفِ رندانِ خرابات کشیدیم
از زہد و مقامات گذشتیم کہ بسیار
کاس تعب از زہد مقامات کشیدیم

ان اشعار کے سنتے ہی مولانا عراقی پر وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ قلندروں کی جماعت میں ایک صاحبِ جمال لڑکا بھی تھا۔ شیخ کی نظر اس پر پڑی تو سو جان سے فدا ہو گئے۔ کئی روز تک قلندروں کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور پُر تکلف دعوتیں کھلاتے رہے۔ قلندروں کو بھی اس امر کا علم ہو گیا اور وہ کئی دنوں تک بلا ضرورت ضیافتیں اڑاتے رہے۔ مولانا عراقی تو پہلی نظر میں ہی صبر و شکیب کھو چکے تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ قلندر زادہ ذرا اوجھل ہوتا تو قیامت برپا ہو جاتی۔ شیخ سیماب وار تڑپنے لگتے۔

قلندر اس صورتِ حال سے تنگ آئے تو ایک دن بوریہ بستر لپیٹ دمشق سے چل کھڑے ہوئے۔ عراقی اُن کے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ یہ بھی ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے قلندروں نے دیکھا تو ٹھہر گئے اور مولانا سے کہا:

صاحب آپ بزرگ اور عالم آدمی ہیں، آپ کا اور ہمارا گزارہ ناممکن ہے اگر آپ بھی چار ابرو کا صفایا کرالیں تو البتہ ہم آپ کو ہمراہ لے چلنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

شیخ کے دل میں تو قلندر زادے کے عشق کی آگ بھڑک رہی تھی۔ فوراً کپڑے پھاڑ ڈالے۔ عمامہ سر سے اُتار پھینکا اور چار ابرو کا صفایا کرا یہ کہتے ہوئے قلندروں میں جذب ہو گئے ؎

چہ خوش باشد کہ دلارام تو باشی
ندیم و مونس و یارم تو باشی

عراق سے ہمدان، ہمدان سے خراسان اور خراسان سے ہوتے ہوئے یہ قلندر

ملتان وارد ہوئے اور حضرت شیخ الاسلامؒ کی سرائے میں بوریہ بستر پھیلا کر پڑ رہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ جو سرائے سے گزرے تو ایک نظر اُن پر بھی ڈالی اور مولانا عراقی کو اس ہیئت میں دیکھ کر سخت متعجب ہوئے۔ اپنے مقرب خاص شیخ عمادالدین سے فرمایا :

"درین جوان استعداد تمام یافتم اورا ایں جا مے باید بودن"۔

مولانا عراقی نے بھی حضرت شیخ الاسلام کی طرف کشش محسوس کی اور قلندروں سے کہا :

"برمثال مقناطیس کہ آہن را کشد، شیخ مرا جذب می کند و مقید خواہد کرد۔ ازیں جا زود ترمے باید رفت"۔

چنانچہ پچھلی رات کو ملتان سے دہلی چل دیئے اور دہلی سے سومنات کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ میں سخت آندھی آئی۔ اس طوفان میں کسی کو ایک دوسرے کا ہوش نہ رہا کسی نے کوئی راستہ لیا اور کوئی کدھر کو چل دیا۔ چونکہ مولانا عراقی کی قسمت میں ہدایت مقدر ہو چکی تھی، اس لیے اِدھر اُدھر پریشان پھرتے ایک دن بلا ارادہ حضرت شیخ الاسلام کی خانقاہ پر حاضر ہو گئے۔

حضرت نے کشف کے ذریعے معلوم کر لیا کہ عراقی دروازے پر کھڑا ہے، اُسے اندر بُلایا اور فرمایا :

"عراقی ! از ما بگریختی"

علامہ عراقی بے اختیار قدموں میں گر گئے اور گلوگیر آواز میں عرض کی [۵]

از تو نگریزد دل من یک زمان
کالبد را کے بود از جان گزیر
دایہ لطفت مرا در بر گرفت
داد بیش از مادرم صد گونہ شیر

حضرت شیخ الاسلامؒ نے لپک کر عراقی کو اُٹھایا اور اپنے گلے سے لگا لیا۔ حضرت

[۵] میخانہ عبدالنبی، ص ۳۲

کے سینہ بے کینہ سے مس ہوتا تھا کہ قلندر زادے کا خیال دل سے محو ہو گیا اور اس کی محبت کی جگہ عشق حقیقی کی آگ بھڑک اٹھی۔ حضرت اپنا لباس پہنا کر مولانا عراقی کو اپنے خلوت خانہ کے قریب ایک حجرہ میں لے گئے تا کہ مخلوقات سے علیحدہ ہو کر اطاعتِ الٰہی میں مصروف رہیں۔ دس ایام اطمینان سے گزرے۔ گیارھویں روز اُن پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ روتے تھے اور یہ غزل پڑھتے تھے ؎

نخستیں بادہ کاندر جام کردند ز چشمِ مست ساقی[1] دام کردند
چو بے خود خواستند اہلِ طرب را شرابِ بے خودی در کام کردند
برائے صید مرغ جانِ عاشق ز زلف فتنہ جویاں[2] دام کردند
بہ عالم ہر کجا رنج و بلا بود[3] بہم بردند و عشقش نام کردند
چو خود کردند[4] راز خویشتن فاش
عراقی را چرا ؟ بدنام کردند[5]

حضرت شیخ الاسلامؒ کے ارادت مندوں نے مولانا عراقی کو حجرہ میں نغمہ سرائی کرتے دیکھا تو حضرت کو اطلاع دی کہ ہمارے مسلک میں تو ان چیزوں کی ممانعت ہے، عراقی اس امر کے مرتکب کیوں ہو رہے ہیں ؟

حضرت نے فرمایا :

"شمارا ازیں چیزہا منع است اورا منع نیست ۔"

اس کے کچھ دنوں بعد شیخ عمادالدین شہر میں گئے۔ ایک خرابات سے گزر رہے تھے کہ رندوں کو مندرجہ بالا غزل چنگ و چغانہ سے گاتے سنا۔ شہر سے واپس آئے تو حضرت کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا۔ حضرت نے یہ سن کر فرمایا :

۱؎ مخزن الغرائب ، خوباں ۲؎ ایضاً ۔ ز زلف قید خوباں دام کردند
۳؎ مخزن الغرائب ، رنج و بلائیست ۴؎ مخزن الغرائب ، سرّ
۵؎ منقول از تذکرہ دولت شاہ، ص ۲۱۶

"کارِ عراقی تمام شد"

اسی وقت اُٹھ کر عراقی کے حجرے میں گئے اور فرمایا :

"عراقی! مناجات در خرابات مے کنی، بیروں آ"

مولانا عراقی حجرے سے باہر نکلے۔ شیخ الاسلامؒ کے قدموں میں گر گئے اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ حضرت نے اپنے دستِ حق پرست سے اُن کا سر اُٹھایا اور اپنے سینے سے لگایا۔ عراقی نے اسی وقت ایک غزل کہی، جس کا مطلع یہ تھا ؎

در کوئے خرابات کسے را کہ نیاز است
ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است

حضرت شیخ الاسلامؒ نے اسی وقت اپنا خرقہ اُتار کر انہیں پہنا دیا اور اسی مجلس میں اُس سے اپنی ایک صاحبزادی کا نکاح کر دیا۔

مخدوم عبدالرشیدؒ کی واپسی

حضرت مخدوم عبدالرشیدؒ کو ارضِ مقدس کی طرف گئے، کئی سال گزر چکے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ بار بار یاد کرتے تھے اور ان کے فراق میں آہِ جگر دوز کھینچتے تھے۔ ان کے اہل و عیال پر تو ہر وقت افسردگی کا عالم طاری رہتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے احباب میں ان کا ذکر کر رہے تھے کہ حضرت مخدوم عبدالرشید درویشانہ لباس میں آتے دکھائی دیئے۔ حضرت شیخ الاسلام خوشی سے اُچھل پڑے۔ آگے بڑھ کر بھائی کو گلے سے لگایا اور پھر اپنی مسند پر بٹھا کر حال احوال دریافت کیا۔ تمام اعزاء و اقارب جمع ہو گئے اور ملتان شہر فرطِ مسرت سے جھومنے لگا۔

سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دیا

چند روز کے بعد حضرت شیخ الاسلامؒ نے بزرگوں کے وقت سے جو خزانہ محفوظ چلا آتا تھا، بھائی کے آگے رکھ دیا اور فرمایا "یہ تمام خزانہ اور جاگیر جو آپ مجھے امانت

دے گئے تھے، سنبھال لیں۔

مخدوم نے عرض کی "حضرت! میں تو اپنے شیخ کے حکم سے دُنیا اور اس کے کارخانے کو تیاگ چکا ہوں۔ مجھے ان چیزوں سے کیا سروکار! میں تو آبادی پر ویرانہ کو ترجیح دے چکا ہوں۔ کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کا آرزومند ہوں۔ یہ تمام کارخانہ اپنے پاس رہنے دیجئے"۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے فرمایا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو چیز آپ کی ہے، وہ آپ کو لینا ہی ہو گی۔ اس کے بعد آپ کی مرضی ہے۔ خواہ اپنے پاس رکھیں یا خدا کی راہ میں بانٹ دیں"۔ چنانچہ تمام خزانے اور جاگیریں آدھا آدھا بانٹ لیں۔ ایک ایک کروڑ اشرفی دونوں کے ترکہ میں آئی۔ اجناس خوردنی اور دیگر سامان مزید برآں تھا۔

اراضی کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ راوی اسے دو برابر حصّوں میں تقسیم کرتا تھا۔ قرعہ اندازی سے فیصلہ ہُوا۔ شرقی رقبہ مخدوم عبدالرشید کے حصّے میں آیا اور غربی حضرت شیخ الاسلامؒ کو ملا۔ حضرت مخدوم صاحب نے اپنا تمام اثاثہ درویشوں اور مسکینوں میں بانٹنا شروع کیا۔ دُور دُور تک آپ کی فیاضی کی دھوم مچ گئی۔ اطراف واکناف عالم سے مستحقین اور مساکین آپ کے درِ دولت پر جمع ہونے لگے۔ چند ایام میں ہی سارے ترکہ کی کوڑی کوڑی محتاجوں مسکینوں میں بانٹ دامن جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اور دریائے راوی کے شرقی جانب ایک جھونپڑا بنوا وہیں جا بیٹھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ ہفتے میں ایک دفعہ بھائی کو ملنے راوی پار تشریف لے جاتے تھے۔ ایک روز فرمایا:

"اے بھائی! تم ایک بڑے کنبہ کے مالک ہو۔ اگر تمہیں اپنے لیے کوئی چیز درکار نہیں تو نہ سہی، لیکن یہ لوگ کہاں جائیں؟ مناسب ہے کہ اُن کے لیے کسی موزوں مقام پر مکانات تیار کرائیے تاکہ یہ اطمینان سے اپنی زندگی بسر کر سکیں"۔

عرض کی "یہاں سے دس کوس کے فاصلے پر ابوالفتح و تاج الدین مٹرل سے کچھ زمین خریدی ہے۔ وہاں بال بچوں اور متعلقین کے لیے آشیانہ بنانے کا ارادہ ہے۔ حضور خاطر جمع فرمائیں"۔

الغرض ایک روز حضرت مخدوم عبدالرشید اپنے اعزا و اقارب اور متوسلین کے ہمراہ اپنی خرید کردہ اراضی کی طرف روانہ ہوئے۔ شیخ الاسلامؒ نے مولانا عراقی اور مخدوم سید جلال کو ساتھ کر دیا تاکہ اسباب و قبائل کو پہنچانے میں مدد کریں۔

حضرت مخدوم عبدالرشید نے منزلِ مقصود کی طرف پہنچ کر رہائش کے لیے مکانات تعمیر کرائے اور اراضی اپنے متوسلین کو بحصہ برابر بانٹ دی تاکہ کاشت کر کے اپنی گزر اوقات کریں اور آپ خود ایک حجرہ میں اپنے لیل و نہار ریاضت و عبادت میں بسر کرنے لگے۔

یکے از چہار یار

شیخ عثمان المروندی المعروف بہ لال شہباز قلندرؒ

حضرت مخدوم لال شہباز قلندر علیہ الرحمۃ کا اصل نام شیخ عثمان المروندی ہے۔ آپ کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہوتا ہے اور جیسا کہ آپ کے خطاب سے ظاہر ہے آپ قلندری شان رکھتے تھے۔ بعض تذکروں میں آپ کو ملامتی ظاہر کیا گیا ہے اور یہ کہ آپ احکامِ شرع کے پابند نہیں رہ سکتے تھے۔ خاکسار نے اس سلسلے میں اہلِ علم و فضل سے تحقیق کی، تو انہوں نے اسے تہمت قرار دیا۔ خاکسار کی بھی یہی رائے ہے۔ کیونکہ حضرت شیخ الاسلامؒ جیسے شیخ کامل کا دوست اور خلیفۂ کامل ملامتی نہیں ہو سکتا۔ بالخصوص جبکہ لال باغ اور پہاڑ کی نشست گاہ میں آپ کا مصلّٰی زبانِ حال سے آپ کے متبعِ شریعت ہونے کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔

بقول حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ؎

ہر کرا کہ جامۂ پارسا بینی
پارساداں و نیک مرد انگار

صاحب منبع البرکات لکھتے ہیں کہ اسی افواہ کی بناء پر ملتان کے قاضی قطب الدین کاشانیؒ نے حضرت مخدوم پر فسق کا فتوےٰ لگادیا۔ یہ ان دنوں ملتان کے کسی قریبی گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنی بابت قاضی صاحب کی یہ جسارت برداشت نہ ہوئی۔ برہم کر اُٹھے اور اپنے ہمراہیوں کو ساتھ لے کر ملتان کو چل دیئے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ مسند ارشاد پر تشریف رکھتے تھے۔ حضرت کا مجلس خانہ علماء اور مشائخ سے بھرا پڑا تھا، قال اللہ وقال الرسول سے مجلس گرم تھی۔ دفعتہً شور اُٹھا کہ سندھ سے شیخ عثمان نامی کوئی بزرگ قاضی قطب الدین کاشانی سے ٹکر لینے کے لیے بگولے کی طرح اُڑے چلے آرہے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے جواں سال بھتیجے شیخ حسنؒ[1] کو بھیجا کہ اُنہیں نرمی سے سمجھا بجھا کر میرے ہاں لے آؤ۔

شیخ حسن نے کچھ فاصلہ طے کر کے مخدوم عثمان کا استقبال کیا اور عرض کی کہ میرے عم بزرگوار حضرت شیخ الاسلامؒ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ مخدوم عثمان آپ کا نام سُنتے ہی ٹھنڈے پڑ گئے اور شیخ حسن کے ہمراہ دربارِ غوثیہ میں حاضر ہوئے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے آپ پر شفقت سے نظر کی اور فرمایا:

"اے لال شہباز! آگے بڑھ"

شیخ نے بے دلی سے آنکھ اُٹھا کر نظر کی اور خدا معلوم کیا دیکھا کہ جو کچھ سوچ کر آئے تھے، سب بھول گئے۔ زیرِ لب آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ یہ جمال کسی انسان کا نہیں، سُورج کا نہیں، چاند کا نہیں۔ ایسا قالب! جس کا چہرہ ہزار آفتابوں کی روشنی سے زیادہ منوّر دکھائی دے رہا ہے، یقیناً کسی عظیم شخصیت کا ہی ہو سکتا ہے۔ مُسکراتا ہے تو ساری دُنیا مسکراتی نظر آتی ہے۔ جبینِ نور پر ذرا شکن آتی ہے تو نوری ناری سب کانپ اُٹھتے ہیں۔ ایسے مردانِ خدا بار بار نہیں ملتے۔ اے عثمان! آگے بڑھ اور اپنا سر اس کے قدموں میں ڈال دے۔ یہ کہہ کر آگے بڑھا اور سرِ نیاز قدموں میں رکھ کر بولا

---

[1] فرزند ارجمند مخدوم عبدالرشید رحمۃ اللہ علیہ

"اے پیکرِ نور! خطا ہوئی، معاف فرما دیجئے۔ میں نے آپ کے شہر کے ایک عالم کو گرفت میں لانا چاہا تھا۔ لیکن خود اسی زنجیر میں جکڑ دیا گیا۔ خدارا اب مجھے زیادہ نہ ترسائیے اور اپنی بیعت میں لے لیجئے۔"

حضرت شیخ الاسلامؒ نے شیخ کو بغل میں لے کر خوب بھینچا اور اسی صحبت میں ہی آپ کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کر لیا۔ چونکہ حضور نے شیخ کو لال شہباز کہہ کر پکارا تھا، اس لیے آپ اسی نام سے مشہور ہو گئے اور لال شہباز قلندر کہلانے لگے۔ صاحب معارج الولایت آپ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے:

"وے صاحبِ کمالات ظاہری و باطنی و تصرفات صوری و معنوی بود، خوارق و کرامات بے اختیار از وے بظہور مے آمدند۔ اصل وے از سندھ است و از سادات عظام حسینی است نام نامی وے سید عثمان، مرید و خلیفہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ است۔ چوں جذب و مستی بغایت داشت پابند احکام شرع نبود۔ لباس سرخ داشتے وخطاب لال شہباز از پیشگاہ پیر روشن ضمیر لوے عطا شدہ بود۔"

صاحب تحفۃ الکرام نے آپ کو ان چار یاروں میں شمار کیا ہے، جو مل کر سیاحت کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

"شیخ عثمان مروندی عرف مخدوم لال شہباز یکے از چہار یار بود کہ یکجا سیاحت کردند۔"

یک اور جگہ لکھتا ہے کہ سہوان کے قریب پہاڑ پر چشمہ واہی ایک عجیب مقام ہے، جلدی امراض کے اکثر مریض یہاں آکر غسل کرتے اور شفاء پاتے ہیں۔ پاس ہی ایک ستون کی مسقف عمارت ہے۔ لوگوں کی یہاں آمد و شد لگی رہتی ہے اور اس کی چھت پر سیر کرتے ہیں۔ عام مشہور یہی ہے کہ اس جگہ چار یاروں یعنی مخدوم عثمانؒ، شیخ بہاء الدین زکریاؒ، شیخ فریدؒ اور سید جلال بخاریؒ نے کئی کئی دن مکاشفہ میں کاٹے ہیں۔

تحفۃ الکرام کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"برکرہش چشمہ واہی از عجائبات است، اکثر ارباب امراض لغلش شفا یابند، دیگر جائے یک ستونست کہ صفحہ بزرگی در کوہ بیک ستون باعتقاد مردم قدرتی

متکون مردم بسیر و صفا آنجا روند و بر سقفش نظارہ کنند۔ گویند آنجائے چہار یار یعنی مخدوم عثمان، شیخ بہاء الدین زکریاؒ، شیخ فریدؒ، سید جلال بمکاشفات نشستہ اند[۱]"

اس قسم کی نشستیں جو چار یاروں کے نام سے موسوم ہیں، پاکستان کے چپہ چپہ پرپھیلی ہوئی ہیں اور اب تک علی حالہ موجود ہیں۔ وہاں زبردست میلے لگتے ہیں اور خوش اعتقاد لوگ نذر ونیاز اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ درحقیقت شیخ الاسلامؒ اور ان کے یارانِ طریقت نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں بسر کیا تھا۔ جس کی نوعیت خالص تبلیغی ہوتی تھی۔ گرمائی دورہ کشمیر اور بلخ بخارا کی طرف ہوتا تھا۔ کشمیر کے دامن میں ایبٹ آباد اور بخارا کی طرف پہاڑوں پر اُن کی نشست گاہیں آج تک زائرین کو دعوتِ عمل دے رہی ہیں۔ ساون بھادوں کے مہینوں میں سہوان، ملتیر اور دیبل کی طرف دورہ ہوتا تھا۔ سخی سرور موسم بہار کا صدر مقام تھا۔ موسم سرما میں پنجاب، سندھ اور بلوچستان کا میدانی علاقہ ان کے مواعظ حسنہ سے مستفیض ہوتا تھا جس کا تفصیلی ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

خواجہ حسن افغانؒ

حضرت خواجہ حسن افغانؒ کو شیخ الاسلامؒ کی پیش گاہ میں جو مقام حاصل تھا، اس کا اندازہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے اس بیان سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ روایت کرتے ہیں:

"حضرت شیخ الاسلامؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کے دن مجھ سے پوچھا گیا کہ تم دنیا سے کیا تحفہ لائے ہو؟ تو مَیں عرض کروں گا کہ خواجہ حسنؒ کا صدق اور اعتقادِ راست لایا ہوں۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ خداوند کریم نے خواجہ حسن افغان کو اس قدر علم لدنی عطا کیا تھا کہ اگرچہ وہ بالکل اَن پڑھ تھے لیکن لوحِ محفوظ نے ان کے آئینہ دل پر اپنا عکس ڈال رکھا تھا۔ چنانچہ اگر اُن کے سامنے آیاتِ بینات، حدیث شریف اور اقوالِ مشائخ ملا جلا لکھ کر پیش کرتے تو وہ ایک نظر دیکھ لینے سے بتادیتے تھے کہ یہ قرآن شریف کی آیت ہے، یہ حدیث ہے اور یہ کسی شیخ کا ارشاد ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مَیں ان عبارتوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

ط۱ تحفۃ الکرام جلد ۳، ص ۱۳۶، بذیل سبوستان مطبع ناصری واقع دہلی در ۱۳۰۴ھ

کہ جو خدا تعالےٰ کا کلام ہوتا ہے، اُس کا نُور عرشِ اعلیٰ تک دکھائی دیتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی حدیثِ پاک کا نُور ساتویں آسمان تک اور اقوالِ مشائخ کا نُور زمین سے آسمان تک مشاہدہ کرتا ہوں ؎

نگارِ من کہ بہ مکتب نہ رفت و خط نہ نوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شُد

یہ بھی حضرت محبوب الٰہی سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ کسی گاؤں میں ایک مسجد تعمیر کی جا رہی تھی۔ قبلہ کی تعیین میں حضرات علماء اختلاف کر رہے تھے۔ اتفاق سے خواجہ حسن بھی وہاں جا نکلے۔ معمار سے پُکار کر کہا کہ "میاں! محراب اس سمت رکھو، کیونکہ قبلہ اس طرف ہے"۔ لوگ متردّد ہوئے۔ آپ نے فرمایا: "تردّد کی کیا بات ہے، جسے بیت اللہ کی زیارت مطلوب ہو، اس وقت کر لے"۔ جمیع علماء و مشائخ جو موجود تھے، سب کعبہ کی زیارت سے شرف اندوز ہوئے اور حسن افغان کا شکریہ ادا کیا۔

ایک روز حسن افغان کا گزر مغرب کے وقت ایک مسجد سے ہُوا۔ نماز ہو رہی تھی، آپ بھی نماز میں شامل ہو گئے۔ جب امام سلام پھیر کر نماز سے فارغ ہُوا تو آپ امام کا ہاتھ پکڑ کر ایک گوشے میں لے گئے اور فرمایا:

"اے امام صاحب! جب آپ نے نماز شروع کی تو مَیں آپ کے ساتھ تھا۔ آپ یہاں سے دہلی پہنچے اور وہاں سے غلام خرید کر ملتان آئے اور پھر ان بردوں کو گراں قیمت پر بیچنے کے لیے ملتان سے خراسان پہنچے۔ پھر وہاں سے ملتان آئے اور مَیں تیرے پیچھے بے سروپا، حیران و پریشان پھرتا رہا۔ اس نماز کو کیا کہیں اور اس کا کیا نام رکھیں؟"

؎ چوں شوی استادہ از بہرِ نماز — دل بود در گاؤ خرا ے حیلہ ساز
آں نماز تو شود آخر تباہ — فکرِ باطلہا کند رویت سیاہ

برزباں تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

حاجی جمال کنبوہؒ

ایک دفعہ شیخ الاسلامؒ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہُوا اور مصافحہ کے بعد خاموش کھڑا ہو گیا۔ حضور نے فرمایا:

"کیا چاہتے ہو؟"

عرض کی "حضور! سُنا ہے کہ آپ خدا کے نام پر سب کچھ دے دیتے ہیں۔ مَیں بھی ایک آرزو لے کر حاضر ہُوا ہوں"۔

فرمایا "بھائی! میرا کیا ہے؟ جو دُوں، سب اُسی کا مال ہے، جس کو چاہتا ہے دلاتا ہے۔ اگر اُسے منظور ہُوا تو تم بھی خالی نہ جاؤ گے۔ ہاں کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

سائل نے عرض کی "حضور! میری خواہش ہے کہ آپ خدا کی راہ میں اتنی اشرفیاں عنایت فرمائیں جتنے آج تک پیغمبر آئے ہیں"۔

حضرت کے چہرے پر حیرت و استعجاب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ عام روایت کے مطابق انبیاء علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی جاتی ہے۔ اتنی بڑی رقم رب العزت کے نام پر تصدق کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی، لیکن ایک غیر معروف انسان کو اس قدر دولت کا دے دینا مصلحت سے بعید تھا۔

حضرت سوچ میں پڑ گئے کہ اس معمّہ کو کس طرح حل کیا جائے۔ اس وقت بارگاہِ عالیہ میں بڑے بڑے علماء اور مشائخ موجود تھے۔ کبھی وہ سوالی کے سراپا کو دیکھتے اور کبھی اس کے سوال پر غور و فکر کرتے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ آج تک اس بارگاہ سے کوئی شخص خالی نہیں لوٹا۔ لیکن اگر حضرت اس آدمی کو اتنا بڑا خزانہ دے دیتے ہیں، تو اس سے ہزاروں مستحقین کی حق تلفی ہوتی ہے اور اگر حضور اسے مطالبہ سے کم رقم مرحمت فرماتے ہیں تو لوگوں میں مشہور ہو جائے گا کہ حضرت نے سائل کا سوال پُورا

نہیں کیا۔ تمام حاضرین اس خیال میں محو تھے کہ دفعتہً ایک گوشے سے آواز آئی۔

"حضرت! اس شخص کو میرے حوالے فرمائیے! اس کا سوال میں پورا کروں گا۔"

یہ ایک مستعد اور معاملہ فہم بزرگ تھے، حضرت شیخ الاسلامؒ کے محبِّ صادق! حاجی جمال کنبوہ!

ان کی طبع رسا ایسے موقعوں پر بڑا کام کرتی تھی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے رُخِ انوار پر بشاشت دوڑ گئی، مسکرا کر فرمایا:

"میاں جمال! سوال کو سمجھ لیا ہے۔"

"حضور! سوال اور سوالی دونوں کو سمجھ کر ہی عرض کر رہا ہوں۔"

"بہتر! اسے لے جاؤ اور راضی کرو۔"

حاجی جمال آگے بڑھے اور سائل کو اپنے ہمراہ لے کر گھر کو روانہ ہو گئے۔

حاجی جمال ملتان کے ایک خوشحال امیر تھے۔ سائل کو گھر لے جا کر اور پیر کا مہمان سمجھ کر بڑی عزت سے مسند پر بٹھایا۔ شربت سے تواضع کرنے کے بعد ایک خلعتِ فاخرہ اس کے آگے رکھی اور اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ "خزانے کی کوٹھڑی کھول کر تمام اشرفیاں نکال لاؤ۔"

خزانچی نے تھوڑی سی دیر میں اشرفیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ سائل کی آنکھیں اشرفیوں کی چمک دمک سے چندھیانے لگیں۔ اس کے منہ سے رال بہنے لگی اور اس کا دل فرطِ مسرت سے رقص کرنے لگا۔ اس نے یقین کر لیا کہ یہ تمام خزانہ اب میرا ہے۔ چند ساعتوں میں ہی میں ایک امیر کبیر بن جاؤں گا۔

وہ اس قسم کی منصوبہ بندی میں محو تھا کہ حاجی جمال اپنی مسند سے اُٹھے اور سائل کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئے، فرمایا:

"بھئی! اب تم ایک ایک پیغمبر کا نام لیتے جاؤ، تاکہ میں اُن کے نام پر ایک ایک اشرفی پیش کر سکوں۔"

سائل حاجی جمال کی اس تصریح سے گھبرا گیا۔ لیکن اب سوائے اس کے اور کوئی

چارۂ کار ہی نہ تھا کہ جو نام اُسے یاد ہوں سُنا کر ان کے بدلے میں چند اشرفیاں قبول کر لے۔ آخر سوچ کر اُس نے سر اُٹھایا اور کہا :

" آدم ! "

حاجی جمال نے فوراً ایک اشرفی اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس کے بعد شیثؑ، ادریسؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسٰیؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، الیاسؑ، صالحؑ، عیسٰیؑ، یحیٰیؑ اور خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم تک بمشکل دس، بیس نام جو اُسے یاد تھے کہہ سُنائے اور اتنی ہی اشرفیاں لے کر اپنے عجز کا اقرار کیا۔

حاجی جمال بار بار کہتے بھائی کوشش کرو، ممکن ہے کوئی اور نام یاد آجائے، مُفت میں اشرفی ضائع نہ کرو "

لیکن اُسے جو کچھ یاد تھا، عرض کر چکا تھا۔ آخر کار وہی مُٹھی بھر اشرفیاں لے کر راضی ہو گیا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کو جب تمام صورتِ حال کا پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے اور حاجی جمال اور اُن کی اولاد کے حق میں دُعا فرمائی ۔

تارکِ تخت و تاج سُلطان حمیدُالدّین حاکم قُریشی الہاشمی

آپ کیچ مکران کے بادشاہ تھے۔ ایک مرتبہ دن بھر کی سیر و تفریح کے بعد جب محل میں داخل ہوئے تو نونت نامی خادمہ کو پلنگ پر سوتے پڑا پایا۔ نونت کی یہ بے ادبی خاطرِ اشرف کو پسند نہ آئی۔ غضبناک ہو کر حکم دیا کہ اس بے تمیز کو ایسی سزا دی جائے کہ دُوسروں کے لیے باعثِ عبرت ہو۔

خدام نے لپک کر نونت کو بالوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے صحن میں لے آئے۔ سلطان کے سامنے اُسے چابک لگ رہے تھے، مگر وہ کوئی ایسے دل گُردے کی عورت تھی کہ اُف کئے بغیر مار کھائے جا رہی تھی۔ جب وہ نڈھال ہو کر گر پڑی تو سُلطان نے

اشارے سے نوکروں کو روک دیا ۔ نونت نے نیم وا آنکھوں سے سلطان پر نظر ڈالی اور خدا معلوم اُسے کیا خیال آیا کہ دفعتہً کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔

سُلطان کو اس بے محل ہنسی سے تعجب ہُوا ۔ پوچھا :

" اے نونت ! اس بے جا ہنسی کی وجہ بیان کر ۔ ورنہ تیری گردن مار دی جائے گی "۔

خادمہ نے کرب آلود نگاہوں سے ایک بار سلطان پر پھر نظر ڈالی اور بولی :

" جہاں پناہ ! مار پیٹ کے دوران میں اس خادمہ کو خیال آیا کہ میں ایک لمحہ اس بستر پر سوئی تو یہ سزا پائی ۔ لیکن جو شخص اس پر ہر روز سوتا ہے ، قیامت کے دن اس کا کیا حشر ہو گا ؟ "

لونت کے اس جواب سے سُلطان کے ہوش اُڑ گئے ۔ اس کو تو کچھ دے دلا کر اُسی وقت آزاد کر دیا ، لیکن خود بحرِ فکر میں ایسے کھوئے کہ صُبح ہو گئی ۔ خادم نے شکار کے لیے شبدیز پیش کیا سُلطان غم غلط کرنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کو نکلا ۔ امراء اور مصاحبین جلو میں تھے ۔ اُنہوں نے دل بہلانے کی ہزار کوشش کی ۔ مگر نونت کی بات تو دل میں ترازو ہو کر اُتر چُکی تھی ، چین کیونکر آتا ۔ ادھر اُدھر گھوڑے دوڑاتے رہے ۔

اسی اثناء میں ایک ہرن سلطان کے سامنے سے نکل کر بھاگا ۔ سُلطان نے نیزہ اور کمان سنبھال گھوڑے کو ایسی ایڑ لگائی کہ ہَوا ہو گیا اور امراء اور مصاحبین جو ہمرکاب تھے پیچھے رہ گئے ۔ آپ ہرن پر تیر چھوڑنے والے ہی تھے کہ وہ ایک قبر کے سُوراخ میں گھُس گیا ۔ سلطان کو تعجب ہُوا کہ خلافِ معمول ہرن زمین کے سوراخ میں کیوں گھُسا ۔ جست لگا کر گھوڑے سے اُترے ۔ قبر میں جھانک کر دیکھا ، تو وہاں اور نظارہ دکھائی دیا ۔ ایک تازہ لاش پڑی تھی جسے مینڈک کی شکل و صُورت کا بچھو جگہ جگہ سے ڈستا پھرتا تھا ۔ آپ نے رحم کھا کر کمان سے بچھو کو پرے ہٹا دیا ۔ لیکن مڑ کر دیکھا تو بچھو پھر وہیں موجود تھا ۔ تین بار آپ نے اُسے ہٹایا ۔ مگر پھر وہ آموجود ہُوا ۔ آپ نے جان لیا کہ یہ بچھو نہیں کوئی فرشتہ ہے ، جو اس میت پر عذاب کے لیے مقرر ہے ۔ آپ نے قبر کے سوراخ کو بند کر دیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر پاس کے گاؤں میں پہنچے ۔ لوگوں سے پُوچھا کہ یہ قبر کس کی ہے ؟

جواب ملا، اس گاؤں کے رئیس کی۔

رئیس کا لفظ سُن کر دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ خوفِ عقاب سے ایک جھرجھری لے کر گھوڑے کی باگ شہر کو پھیر دی۔ چونکہ قدرت کو یہی منظور تھا کہ دارِ فانی کا یہ آشیانہ نشین شہباز" اوجِ لاہوت،، کی طرف پرواز کرے۔ اس لیے رئیسِ دیہہ کے عذابِ میّت کا معائنہ اور خادمہ کا سخن" حق و باطل" میں تمیز کرنے کا سبب بن گیا۔ شوقِ الٰہی کی آتش جو اس پاک نہاد کے سینہ بے کینہ میں دبی پڑی تھی، دفعتہً بھڑک اُٹھی اور شاہدِ حقیقی کی محبّت و عشق کا بحرِ بسیط موجیں لینے لگا۔ کیچ مکران کی حکومت اپنے عم زاد بھائی امیر البقار کے سپرد کی اور خود اپنے نانا جان سیّد احمد توختہؒ کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے لاہور کو چل پڑے۔

سیّد احمد توختہؒ کی خدمت میں

سیّد احمد توختہؒ بڑے پائے کے درویش تھے۔ سلطان التارکین کو یقین تھا کہ نانا صاحب قبلہ پہلی توجہ میں ہی عرفان کی تمام منزلیں طے کرا دیں گے۔ لیکن جب کافی عرصہ اُن کی خدمت میں مختلف ریاضتیں اور مجاہدات کرتے گزر گیا اور حضرت حاکمؒ نے اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس نہ کی تو ایک دن بڑی نیاز مندی سے عرض کی:

"نانا بزرگوار! جس مقصد کے لیے تاج و تخت کو چھوڑا۔ عیش و آرام کو حرام سمجھا اور آپ کے حکم کی تعمیل میں صبر آزما ریاضتوں سے دوچار رہا۔ آج تک ان تمام مجاہدات کا کوئی بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ آپ کی صاحب زادی کی یادگار ہوں، للہ توجہ فرمایئے۔"

حضرت نے اپنے پیارے نواسے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمایا۔ بیٹا! تم نے واقعی بڑی محنت کی ہے، لیکن ابھی منزل دُور ہے۔ فلاں مقام پر ایک بوڑھا درویش جھونپڑی میں بیٹھا اللہ! اللہ کر رہا ہے۔ اس کے پاس جا کر پانی مانگو اور جب وہ

پانی لاکر پیش کرے، تو اُس کے برتن کو توڑ دو۔

اسی طرح پانی کی فرمائش کرتے رہو اور جب وہ پیش کرے تو اُس کا برتن زمین پر پٹخ دو۔ جب اس کے پاس کوئی برتن نہ رہے تو پھر اُسے خُوب مُکّے مارو۔ اس کا جو ردِّ عمل ہو، اُس سے مجھے آگاہ کرو اور پھر ہم تمہارے معاملے پر غور کریں گے۔

حضرت حاکمؒ فوراً اس بوڑھے درویش کے پاس پہنچے اور پانی طلب کیا۔ وہ فوراً مصلّٰی سے اُٹھا۔ ایک کونے سے مٹّی کا آبخورہ نکالا، اچھی طرح سے دھو کر اُس میں پانی بھرا اور بسم اللہ پڑھتے ہوئے حضرت حاکم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے آبخورے کو جھونپڑے کے باہر پھینک دیا اور ڈانٹ کر کہا، پانی لاؤ۔

درویش نے کونے سے دوسرا آبخورہ نکالا۔ اُسے خوب دھویا اور پانی سے بھر کر بسم اللہ پڑھتے ہوئے حاکم کی طرف بڑھایا۔ حضرت حاکم نے بُوڑھے درویش سے یہ آبخورہ بھی لے کر زمین پر پٹخ دیا اور اُسے پھر پانی لانے کو کہا۔ اس طرح بوڑھا درویش بار بار آبخورے نکال کر خوب احتیاط سے دھو کر پانی پیش کرتا رہا اور حضرت حاکم توڑتے رہے۔ یہاں تک کہ آبخورے ختم ہو گئے اور بُوڑھا خاموشی سے کفِ افسوس ملنے لگا۔

حاکم نے اُسے خُوب جھنجھوڑا اور ڈانٹ کر کہا، بُڈھے اگر تم پانی نہیں پلا سکتے تو پھر سڑک کے پاس کیوں بیٹھے ہو؟ پھر دو تین مُکّے زور سے لگائے۔ مُکّے کھانے کے بعد بُوڑھا آگے بڑھا اور اپنے کمزور اور کانپتے ہوئے ہاتھوں کو حضرت حاکم کی طرف بڑھایا اور عاجزی سے بولا:

"نوجوان! افسوس ہے میرے بدن پر گوشت نہیں، ہڈیوں پر مُکّے مارنے سے تمہیں تکلیف ہوئی ہوگی، لاؤ، مَیں آپ کے ہاتھوں کو دبا دُوں۔"

اس واقعہ کا حضرت حاکم پر بڑا اثر ہوا اور نانا جان کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

"حاکم بیٹا! جب تمہارے اندر اس بوڑھے درویش جیسی بے نفسی پیدا ہو گی اُس وقت تم فقر و لایت کی وادی میں قدم رکھ سکو گے۔ اے فرزند! تیرا نصیبہ سلسلۂ عالیہ سہروردیہ میں ہے۔ اللہ کی زمین فراخ ہے اس میں دُرِّ مقصود کو تلاش کرو۔"

ان دنوں بغداد کے مشائخ کی بڑی شہرت تھی۔ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے فیوض و برکات سے یہ شہر بقعۂ انوار بن گیا تھا۔ حضرت حاکم سیّد احمد توختہ سے مرخص ہو کر بغداد کو روانہ ہوئے۔ کئی دنوں کی مسافت کے بعد جب بغداد کے مضافات میں قدم رکھا تو غلبۂ شوق سے بحر شہود میں ایسے غرق ہوئے کہ تین دن تک بدن کا ہوش نہ رہا۔

شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی علیہ الرحمۃ کو کشف کے ذریعے سُلطان کی آمد کا علم ہوا تو خادم بھیج کر آپ کو طلب فرما لیا۔ حضرت حاکم نے فوراً اپنا سر شیخ کے قدموں میں رکھ دیا اور عرض کی:

"اے سرِ حلقۂ اولیائے کرام! یہ سوختۂ آتشِ عشق اور مُبتلائے ہجرانِ محبوب مطلق سیّد السادات کے ارشاد سے اس بارگاہ میں حاضر ہوا ہے۔ حیاتِ ناپائیدار کا کچھ اعتبار نہیں۔ ممکن ہے فرصت حاصل نہ ہو غنچۂ مراد ناشگفتہ رہے، اس لیے بلا تامل شرفِ بیعت سے ممتاز فرمائیں تاکہ جناب والا کے نعمت خانہ سے بے بہرہ نہ رہوں۔"

شیخ الشیوخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی پیٹھ پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے فرمایا:

"اے تشنہ کام! ابھی تیرے پیرِ بیعت نے عرصہ عدم سے ساحتِ وجود میں قدم نہیں رکھا۔ چندے اور انتظار کر۔"

سلطان التارکین نے بدل مجروح و دیدہ مطروح دوبارہ سرِ نیاز پائے مبارک پر رکھ کر عرض کی:

"جو طبیب کہ مرض کو پہچانتا ہے، وہ دوا بھی جانتا ہے، اس لیے امیدوار ہوں کہ حضور اس شیرِ بیشۂ ولایت کے اسمِ گرامی سے بھی آگاہی فرمائیں گے تاکہ اس کی تلاش میں مدد مل سکے۔"

فرمایا:

"وہ فرزند بہاء الدین زکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ کے پوتے رکن الدینؒ ہوں گے۔"

حضرت حمید الدین حاکم اس بشارتِ فیض اشارت سے بے حد مسرور ہوئے اور عرض کی:

"یہ مبتلائے دردِ اشتیاق اور سرگردانِ وادیٔ فراق اس بزرگ کے قدومِ میمنت لزوم کے شرفِ زیارت تک اُسی کے زاد بوم میں گوشہ نشین رہنے کا آرزومند ہے تاکہ خاطرِ بیقرار کو تسکین حاصل رہے۔"

شیخ الشیوخؒ نے آپ کی درخواست کو منظور فرمایا اور مصلّیٰ خاص تبرک کے طور پر مرحمت کر کے رخصت کیا۔

مُومبارک حضرت سلطان التارکین آزاد منش فقراء کی طرح مُلتان کو چلے جاتے تھے کہ ایک دن آپ کا گزر ایسے شہر سے ہُوا جس کی سرسبزی اور شادابی آپ کو بڑی پسند آئی۔ دریا اُس کے قدموں میں پڑا لوٹتا تھا۔ مکانات پُختہ اور بلند سطح پر واقع تھے۔ چاروں طرف سرسبز باغات اور پُرفضا کھیتوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ آپ نے خیال کیا کہ اس دل کشا مقام پر قیام کر کے لطیفۂ غیبی کا منتظر رہنا چاہیئے۔ چنانچہ شہر[۱] کے باہر ایک جوگی کے کنوئیں پر آپ

---

[۱] یہ شہر مُومبارک کے نام سے ریاست بہاولپور میں اب تک موجود ہے۔ شہر پناہ اور دروازے زبانِ حال سے اس کی قدامت کی شہادت دے رہے ہیں۔ البتہ دریا نے اپنا رُخ بدل لیا ہے اور وہ شہر جو کبھی مینو سوادِ خطہ نظر آتا تھا اور جس پر سلطان حمید الدین کی نظرِ انتخاب پڑی تھی۔ اب کھنڈر بن کر رہ گیا باقی صفحہ ۱۶۶ پر

نے اپنا بوریا پھیلا دیا۔ یہ جوگی فقر اور علمِ کیمیا میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس علاقے کے لوگ اس کے بڑے معتقد تھے۔ وہ شام کو ٹہلتا ٹہلتا جو ادھر آیا، اُس نے دیکھا کہ ایک پیر مرد مسافر درخت کے سایہ تلے ڈیرا جمائے بیٹھا ہے۔ اُس نے چاہا کہ کسی طرح سے نووارد کا حال دریافت کرے کہ آیا یہ کوئی گم کردۂ سامان سوداگر ہے یا ولایت باختہ بادشاہ۔ یہ سوچ کر جوگی واپس لوٹ گیا اور شہر سے سونے کی ایک اینٹ اُٹھا لایا اور بولا :

”اے فکرمند مسافر! زمانہ یونہی پہلو بدلتا رہتا ہے۔ کسی قسم کی تشویش کو خاطر میں نہ لا۔ درویش کی اس پیشکش کو زادِ راہ بنا لے مسبب الاسباب تیری مُرادیں پُوری کرے گا۔“

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵ سے) ہے۔ سلطان التارکین کا تذکرہ نگار لکھتا ہے[۱] :

”باید فہمید کہ قلعہ مَو، قلعہ ایست معظم، موہبت باہیبت، با اوج و رفعت، با بالائی و بلندی و باعظمت و رفعت مزین با برج و مینار و محکم بدہلیز و دروازہ آہنی و واقع است درمیان ملتان و بھکر کہ بعد از زمان عیسیٰ علیہ السلام رائے سہنس کہ ور آنرا بنا کردہ است، بعدہٗ رانہ کلاس آرائش و زینت داد۔ و در عہد رائے بھوج شاہ غزنی او را پامال ساخت و قلعہ مَو را ویران انداخت و آں چناں دروازہ آں مسدود مطلق نمود کہ ہیچ بنی آدم را بارائے رفتن بالائے قلعہ نماند۔“

اب بہاولپور گزیٹر کی عبارت ملاحظہ ہو۔ رحیم یار خان سے چھ میل شمال کی طرف مومبارک کا قدیمی قلعہ واقع ہے۔ یہ رائے سہاسی دوم کے چھ قلعوں میں سے ایک ہے۔ بیس گرجیوں اور برجوں کے کھنڈرات اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ان میں سے پچاس فٹ بلند تا حال قائم ہے۔ فصیل چھ سو گز ہے۔ رائے ہنس کھروڑ نے حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں اپنی ماں کی رہائش کے لیے بنوایا تھا۔ لہٰذا مَو نام ہوا۔ راجہ بھوج کے عہد میں سلطان محمود غزنوی سومنات کو جاتے ہوئے یہاں سے گزرا۔ راجہ سدِّ راہ ہوا اور یہ قلعہ تباہ و برباد ہوگیا۔ ؏

---

[۱] تذکرہ حمیدیہ۔ ص۱۸ ؏

سلطان التارکین نے جوگی کا شکریہ ادا کیا اور وہ اینٹ لے کر دریا میں پھینک دی۔ جوگی نے خیال کیا کہ یہ مرد جو بے نیازی میں یگانۂ روزگار نظر آتا ہے دو جہت سے خالی نہیں۔ یا تو یہ کیمیا گر ہے اور یا صاحب کمال درویش! اس کا حال ضرور معلوم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے مکرر سوال کیا:

اے باکمال انسان! اگر یہ اینٹ تیرے کام کی نہیں تھی تو دریا میں ڈالنے سے کیا فائدہ؟

سلطان التارکین جوگی کی طرف دیکھ کر مُسکرائے اور دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

ع مانک موتی لے وہے جنہیں پر الہد سو لے

یعنی موتیوں کا دریا بہہ رہا ہے جس کی قسمت میں ہو وہ لے۔

آپ نے اشارہ کیا ہی تھا کہ دریا پھٹ گیا اور اس کی تہہ میں سونے کی ہزاروں اینٹیں بھی دکھائی دیں۔ فرمایا:

"اے جوگی! دریا میں جا اور اپنی اینٹ پہچان کر نکال لے"

اس بیدار بخت نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔

"حضرت دریا اینٹوں سے بھرا پڑا ہے بلکہ دریا کی ساری وادی سنہری بن چکی ہے، میں اپنی اینٹ کیسے پہچانوں؟" ع

نظرت کیمیا است گر نگری درم قلب ما چوں زر گردد

اے ولی اللہ! تیری نظر کیمیا ہے۔ اگر مجھ پر گوشۂ چشم سے تھوڑی سی توجہ ہو جائے تو بس کایا ہی پلٹ جائے۔

سلطان التارکین کو جوگی کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ اس پر کرم کی ایک نظر جو کی، واقعی اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ وہ تہ دل سے مُسلمان ہو گیا اور اپنے کنوئیں پر ایک حجرہ اور مسجد تعمیر کی۔ جہاں سلطان التارکین نے سکون و اطمینان سے خدا کی بھولی بھٹکی مخلوق کو سبیل الرشاد پر چلانا شروع کیا۔ آپ کے اخلاقِ حسنہ کی کشش یہاں کے راجہ رائے لکھ سنج

کو بھی کھینچ لائی۔ حضرت نے اسلام کے محامد اور محاسن اس رنگ میں پیش کئے کہ وہ اپنے برادران بلتو رائے وہندو رائے اور فرزندان شمشیر والشبر سمیت مسلمان ہو گیا۔

ایک غریب الوطن اور اجنبی درویش اس ریاست کے سیاہ وسفید کا مالک بن چکا تھا دولت، حشمت اور امارت جسے کیچ مکران میں خیر باد کہہ آیا تھا۔ پھر قدموں میں لوٹ رہی تھی۔ حضرت نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ اس ریاست پر بھی توجّہ صرف کی۔ چونکہ اس زمانے میں شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کے سبب شیراز بہت مشہور تھا اور شیخ سے روحانی رابطہ رکھنے کے سبب سلطان التارکین کی نگاہ میں اُسے خاص مقام حاصل تھا۔ اس لیے مو کو بھی شیراز کی سطح پر لانے کی کوشش فرمائی چنانچہ بہت جلد ہی شمالی ہند کا یہ غیر معروف قلعہ ایران کے مشہور شہر شیراز کا مقابلہ کرنے لگا۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

من حاکم ولی چوُں ہوا خواہ سعدیم
مو را ز فضل رونق شیراز مے کنم

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے ؎

شد غزل سعدی ہم و نظم نظامی نظم من
قصبۂ مو شد ز فضلم گنجۂ شیراز ہم

شیخ الاسلامؒ کا مکتوب گرامی

جب چنگیزیوں نے کیچ مکران کی سلطنت امیر البقا سے چھین لی، تو وہ سید احمد توختہ ترمذی کی خدمت میں لاہور چلے گئے اور سلطان التارکین کے علاتی بھائی شیخ رکن الدین حاتم اپنی والدہ اور عم بزرگوار شیخ تاج الدین کے ساتھ مع اہل وعیال قصبہ مو میں وارد ہوئے۔ سلطان التارکین نے ان کی رہائش کا مستقل انتظام کر دیا۔

ان دنوں شیخ حاتم کے نانا بزرگوار قاضی رفیع الدین عباسی سلطان التمش کی طرف سے صوبہ بکھر کے گورنر تھے۔ جب اُنہیں اس امر کی اطلاع ہوئی تو اُنھوں نے سرکار سے پندرہ گاؤں بطور جاگیر جُدا کر کے حضرت حمید الدین حاکم کی نظر کیے اور لکھا مجھے علم ہے کہ

آپ نے دُنیا سے کنارہ کشی کرلی ہے۔ لیکن یہ قطعۂ اراضی جو آپ کے خدام کے لائق نہیں۔ اپنی لڑکی (والدہ شیخ حاتم) کے خرچ نمک کے لیے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہُوں اُمید ہے حضور لفظ "انکار" درمیان میں نہ لاکر اسے قبول فرمالیں گے۔ چونکہ قاضی صاحب کا احترام پیشِ نظر تھا، اس لیے آپ نے یہ پیش کش قبول کر کے اس کا انتظام اپنے گماشتوں کے سپرد کر دیا۔

ان دیہاتوں میں ایک گاؤں ولہر واہن جو بکھر کے قریب پڑتا تھا۔ قاضی کبیر کے زیرِ کاشت تھا۔ سلطان التارکین کے گماشتوں نے معمول سے زیادہ محصول وصول کرنا چاہا۔ قاضی کبیر سخت فکر مند ہُوا۔ اُسے اور کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کیخدمت میں ملتان پہنچا اور عرض کی :

ولہر واہن میں ایک قطعۂ اراضی اس غلام کے زیرِ کاشت چلا آتا ہے۔ سلطان التارکین کے گماشتوں نے اس کے محصول کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ بندہ اس کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ براہِ کرم حضورِ والا! ان کی خدمت میں سفارش نامہ لکھ دیں، تاکہ وہ مقررہ محصول سے زیادہ وصول نہ کریں۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے سفارش میں سلطان حمیدالدین کو یہ فقرات لکھوائے :

"شیخ ہنکاری رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے کو واضح ہو کہ ہر چند آپ کا نام حاکم ہے، مگر طریقِ سلوک میں محکوم ہوئے بغیر کام نہیں بنتا۔ اس طرح جیسے کشتی کے بغیر دریا عبور نہیں کر سکتے۔ امرِ متروکہ کا ارتکاب اربابِ حال کے مناسب نہیں۔ ایک قطعۂ زمین کے لیے درویش مسکین کو رنجیدہ کرنے سے کیا حاصل ہے

حاکم آپ ہیں حکم آپ ہی وچار
جے دن گانون سے کئی ولار ولار
جے دن لدھیا مندے بجھ نہ ہار
جیں تانک نہ تولہاسی کیویں لنکسن پار

قاضی کبیر خود یہ مکتوبِ گرامی لے کر مو مبارک حاضر ہوئے۔ حضرت حاکمؒ نے پیر بیعت کے جد امجد کے سرفراز نامہ کو سر آنکھوں سے لگا کر بڑی عقیدت سے پڑھا۔ زیارت کے آرزومند پہلے سے ہی تھے۔ اس خط نے سمندِ شوق پر مہمیز کا کام کیا۔ قاضی صاحب کو رضامند کر کے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک عرضی لکھی جو اس مضمون پر مشتمل تھی :

" کہ اگرچہ درویشوں کے خاک پا کو حاکم کہتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ محکوم حاکم الٰہی ہے ۔

منم بحکم خداوندا شانہٗ اکبر | جزآں سفینہ نباشد مرا سفینہ دگر
زر بخششِ دل درویش آنچہ بداظہار | خدا علیم نگشتہ بعلم ایں احقر
بحکم ایزد داور بعد ازیں زینہار | شور کسے نہ مزاحم بحال او دیگر

ساتھ ہی حضرت کے دوہرہ کے جواب میں ایک دوہرہ تحریر فرمایا، جس کے الفاظ سہوِ کتابت کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ جو کچھ پڑھا گیا ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے ۔

حاکم آپ ہیں حکم کراہیں وچار | جنہاں اللہ منیا اتے نبی محمدؐ یار
. . . . | جنہاں تانک نہ تولہا سی بھی لنگسن پار

قاصد کو یہ نیاز نامہ دے کر روانہ کیا اور خود بھی چند دنوں کے بعد ملتان کو چل پڑے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ سلطان حاکم کے حالات سے پوری طرح باخبر تھے۔ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور اپنے حجرۂ خاص کے پاس مکان مرحمت کیا۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ انسان کو پیر کے بغیر نہیں رہنا چاہیئے۔ جسے آپ کا دل پسند کرے اس سے بیعت کر لیں۔

عرض کی " حضور! ابھی میرے پیر عرصۂ عدم سے ساحتِ وجود میں نہیں آئے۔"

پوچھا " وہ باکمال درویش کون ہو سکتا ہے ؟"

عرض کی " وہ شیخ صدر الدین عارف کے فرزند شیخ رکن الدین ہوں گے۔"

یہ نام لیتے ہی آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ جس سے حضرت شیخ الاسلامؒ بھی بڑے

متاثر ہوئے اور اہلِ مجلس کے ہر فرد کے دل سے سوز درد نمایاں ہو گیا ؎

حالتے خوش رفت اندر کوچۂ بیت الصنم

ساقی و مطرب خراب بادہ و ما بنزعم

شرفِ دامادی

انہی ایام میں مولانا فخرالدین عراقی کی اہلیۂ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ حضرت شیخ الاسلامؒ کی صاحبزادی تھی، اس عفیفہ کے بطنِ عفت سے شیخ کبیرالدین تولّد ہوئے جو حضرت ہی کی آغوشِ شفقت میں پرورش پا رہے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد شیخ الاسلامؒ نے دوسری صاحبزادی مولانا عراقی کے حبالۂ نکاح میں دینا چاہی حضرت صدرالدین عارف سے مشورۃً پوچھا:

"بابا صدرالدین! اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

عارف باللہ نے جواب میں عرض کی کہ میں نے ایک دن مولانا عراقی کو سرائے کی چھت پر اس حالت میں کھڑا ہوا دیکھا کہ وہ کرتے کے دامن سے اپنے سینہ کو ہوا دے رہے تھے، جس شخص میں کہ حظِّ نفس کا مادّہ اس قدر موجود ہو، وہ دوسری دفعہ آنحضرت کی دامادی کا شرف حاصل کرنے کے لائق نہیں۔

حضرت نے متبسم ہو کر پوچھا:

"تو پھر آپ کے نزدیک اس نسبت کے قابل کون شخص ہو سکتا ہے؟"

آپ نے عرض کی "برادرم حمیدالدین حاکم جو کہ حسب نسب اور زہد و ورع میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔"

حضرت شیخ الاسلامؒ اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

"بابا صدرالدین! یہ کام تیرے سپرد ہے۔"

چنانچہ شیخ صدرالدین عارف نے اپنی ہمشیرہ محترمہ بی بی فاطمہؒ کی شادی خانہ آبادی سلطان حمیدالدین حاکمؒ سے کر دی۔ اس معصومہ سے سلطان حمیدالدین حاکم کے سب سے بڑے

۱۔ تاریخ جلیلہ از پیر غلام دستگیر نامی، مطبوعہ گلزار عالم پریس لاہور ۱۹۶۰ء صفحہ ۸۰ ✻

صاحبزادے شیخ نورالدین پیدا ہوئے جو خاندانِ جلیلہ کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ شیخ فرح بخش اذکارِ قلندری میں لکھتے ہیں:

"سلطان التارکین کے ہاں صدفِ بحرِ عفت عصمت یعنی بنت شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مخدوم بہاء الدین زکریاؒ سے گوشِ ہوش معرفت کے لائق و سزاوار ایسا لولوئے شہوار وجود میں آیا جو کوکبِ طالع افروز تھا اور جس کی نور آگین جبین سے انوارِ فیض یزدانی صاف چمک رہے تھے اور اس نیّرِ برجِ سعادت کے چہرے سے صبحِ اُمید مہر درخشاں کی طرح نظارہ کرنے والوں کے دیدہ میں پرتو انداز تھی۔ حضرت سلطان التارکین فرزند کا بشرہ مبارک مشاہدہ فرما کر محظوظ و مسرور ہوئے اور اسے نورالدین کے نام سے موسوم فرما کر ارشاد کیا کہ انشاء اللہ اس کی پشت سے اکثر مردانِ خدا پیدا ہوں گے۔"

عطائے خرقہ

الغرض سلطان حمیدالدین حاکم ہردم و ہر آن حضرت شیخ الاسلامؒ کے موردِ الطاف رہے۔ ایک دن گلیم پاک کو چودہ خانوادوں کے خرقہ کے طور پر سفر و حضر میں ساتھ رہتی تھی۔ شیخ حاکم کو مرحمت ہوئی اور جبّہ شریف حضرت نے اپنے بدن مبارک سے اُتار کر خود اپنے ہاتھوں سے پہنایا۔ اس وقت سید جلال بخاریؒ (المتوفی ۶۹۰ھ) بھی موجود تھے۔ انھوں نے شیخ کو علیؒ راس کا مشورہ دیا۔ آپ نے فرمایا:

"مَیں شیخ رکن الدین کا منتظر ہوں جو حضرت شیخ الاسلامؒ کے پوتے ہوں گے۔"

سلطانِ حاکم کی دُوسری شادیاں

شیخ حمیدالدین حاکم کے بارے میں اکثر تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ شیخ الاسلام کے ہمراہ سیّد جلال تبریزی کے مقدمہ کی تقریب پر دہلی تشریف لے گئے تھے اور وہاں انھوں نے سلطان التمش کی صاحبزادی بی بی عائشہ سے شادی کی تھی، لیکن کسی ثقہ شہادت سے اس دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ سلطان حاکم کی کلیات گلزار میں بی بی عائشہ نامی ایک خاتون کا مرثیہ ضرور درج ہے۔ مگر اسے قاضی وحیدالدین احمد کی دختر بتایا گیا ہے۔ شیخ

شہر اللہ نے شیخ جمال اُچی کے حوالہ سے سلطان حاکم کی ایک اور شادی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ سندھ کا راجہ جام آپ کا معتقد ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی لڑکی بی بی پتر آئی کی شادی آپ سے کر دی تھی اور سات ہندو قوموں کے آدمی بطور غلام جہیز میں دیئے تھے:

(۱) کنار مل کمہار (۲) لکھ میراثی (۳) ودھا حجام (۴) کتا باورچی (۵) ہس مہاجن (۶) ٹوٹن ملاح (۷) کنگا بنیا۔

ان کے علاوہ پلہار یا پریار قوم کے کئی آدمی دربانی کے خدمات انجام دینے کے لیے ساتھ کر دیئے گئے تھے۔ لیکن جونہی شیخ حاکم نے دریا عبور کیا۔ ان سب کو آزاد کر دیا۔ یہ لوگ آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئے۔ ان سب قوموں کے جانشین اب تک مومبارک اور اس کے مضافات میں پائے جاتے ہیں۔

ہمیں تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال شیخ حاکم نے متعدد شادیاں کیں اور غالباً بی بی فاطمہ کے انتقال کے بعد۔

شیخ حاکم کا زہد و ورع

شیخ حاکم صحیح معنوں میں سلطان التارکین تھے۔ ان کی سیرت سے پتہ چلتا ہے کہ دولت اور حکومت کئی دفعہ لونڈی بن کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ مگر انہوں نے اس طرف توجہ تک نہ کی۔ شیخ عثمان سیّاح سے منقول ہے کہ ایک دن سلطان حاکم، شیخ فخر الدین عراقی اور سیّد جلال بخاری ایک حجرہ میں مصروفِ عبادت تھے کہ دُنیا صاحبِ جمال عورت کی شکل میں میٹھی روغنی روٹیاں لیکر حاضر ہُوئی۔ سلطان حاکمؒ نے اس کی طرف جُوتا پھینکا اور مُنہ موڑ لیا۔ عراقی نے بھی توجہ نہ کی۔ لیکن سید جلال بخاری نے بڑھ کر دو روٹیاں اُٹھالیں اور کہا اپنے لئے نہیں بلکہ اپنی اولاد کے لیے لی ہیں۔ اسی دن سے شیخ حاکم سلطان التارکین کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

بہاولپور گزیٹیر میں درج ہے کہ سلطان شمس الدین نے ملتان اور بکھر کا درمیانی علاقہ آپ کو بطور جاگیر کے دے دیا تھا۔ جب آپ ملتان سے چل کر اُچ میں پہنچے تو رانی تلاؤ کے کنارہ پر آپ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ شراب پی کر بے ہوش پڑا ہے۔ آپ نے لوگوں سے اس کی بابت دریافت کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس نوجوان کا نام سیّد بدیع الدین ہے۔ اسے

ایک چاہ کی معافی کا پروانہ ملا ہے۔ اُسی کے نشہ میں غرق پڑا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"افسوس! یہ ایک چاہ کی معافی کا اثر ہے۔ اگر مَیں اتنی بڑی جاگیر قبول کر لوں، تو میری اولاد کا کیا حشر ہوگا؟ آپ نے وہیں کھڑے کھڑے جاگیر کا پروانہ چاک کر ڈالا۔"

حضرت شیخ جمال اُچی لکھتے ہیں کہ سلطان التارکین اکثر فقر و فاقہ میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک مرتبہ گھر میں کئی دن مسلسل فاقہ پڑا۔ بی بی فاطمہؒ دختر شیخ الاسلام والمسلمین اور صاحبزادہ نورالدین سخت نڈھال ہو گئے۔ بی بی سے بچّے کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ مجبور ہو کر سلطان التارکین سے اس کا تذکرہ کیا۔ شیخ نے مصلّٰی کا ایک سرا اُٹھا کر ایک انمول موتی نکال کر دیا۔ رات کو بی بی نے خواب میں دیکھا کہ ایک بڑا عالی شان محل ہے، جس کا ایک خوبصورت کنگرہ غائب ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ یہ سلطان حاکم اور ان کے اہل بیت کا گھر ہے اور اس کا کنگرہ اس موتی کی وجہ سے اُڑ گیا ہے جو اُس نے دُنیا میں لے لیا ہے۔ بی بی نے خواب سے بیدار ہو کر وہ بے بہا موتی واپس کر دیا کہ مَیں اپنے بہشتی محل کو بدزیب کرنا نہیں چاہتی۔

شیخ حسن افغان سے روایت ہے کہ ایک دفعہ بی بی فاطمہ اپنے بھائی صدرالدین عارف کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ رات کو عارف باللہ نے دیکھا کہ بستر خالی ہے اور بہن بوریئے پر سو رہی ہے۔ پُوچھا:

"بہن! بستر چھوڑ کر آپ نے بوریا کیوں پسند کیا؟"

عرض کی، مجھے ایسی ہی عادت ہے۔ کیونکہ آپ کے بہنوئی سلطان حاکم چار رکعت نماز میں تمام رات بسر کر دیتے ہیں اور اس سے فارغ ہو کر اکثر مراقبے یا سجدے میں پڑے رہتے ہیں اور شاذ و نادر ہی لیٹتے ہیں۔ ایک دفعہ مَیں نے سر کے نیچے تکیہ رکھ لیا تو فرمایا:

"شیخ کبیر کی صاحبزادی ہو کر ایسی حلاوتِ نفس پسند کرتی ہو۔"

الغرض حضرت کی ساری زندگی اسی اختیاری فاقہ میں گزری۔ شیخ کے باقی واقعات حضرت شیخ رکن عالمؒ کے حالات میں بیان ہوں گے۔

شیخ شرف الدین سعدی شیرازیؒ

نام شرف الدین، مصلح لقب اور سعدیؔ تخلص تھا۔ شیخ کے والد ایک با خدا اور عابد انسان تھے۔ اُنھوں نے سعدی کو بھی شب بیداری کا عادی بنا دیا تھا۔ گلستان میں شیخ نے ایام طفولیت کا نقشہ خود اپنے ہاتھوں سے کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں :

"یاد دارم کہ در ایام طفولیت متعبد بودم و شب خیز و مولع بزہد و پرہیز شبے بخدمت پدر نشستہ بودم و ہمہ شب دیدہ برہم نہ بستہ و مصحف عزیز در کنار گرفتہ و طائفہ نزد ما خفتہ۔ پدر را گفتم از ینان کسے سرنے بردارد کہ دوگانہ بگذارد۔ چناں در خواب غفلت خفتہ کہ گوئی مردہ اند ۔ گفت اے جانِ پدر! اگر تو نیز بخفتی ازاں بہ کہ در پوستینِ خلق اُفتی ۔"

شیخ کی تربیت اُن کے والد کی نگرانی میں ہوئی ۔ چنانچہ بوستان میں لکھتے ہیں ؎

ندانی کہ سعدی مکاں از چہ یافت ۔۔۔ نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگافت

بہ خردی بخورد از بزرگاں قفا ۔۔۔ خدادادش اندر بزرگی صفا

افسوس ہے کہ والد کا سایہ دیر تک سر پہ قائم نہ رہا۔ مگر شیخ نے یتیم ہو جانے پر بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابتدائی تعلیم شیراز میں حاصل کی۔ پھر بغداد جا کر مدرسہ نظامیہ میں داخل ہوئے۔ ان دنوں علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن جوزی اس درس گاہ کے پرنسپل تھے۔ یہ بزرگ حدیث اور تفسیر میں اپنے زمانے کے امام تھے۔ چنانچہ شیخ نے انھی کی نگرانی میں علوم متداولہ کی تکمیل کی۔ جس زمانے میں شیخ بغداد میں تعلیم پا رہے تھے۔ اگرچہ اس وقت عباسیہ خلافت دم توڑ رہی تھی۔ لیکن اس کا ظاہری ٹھاٹ باٹ ہارون الرشید کے عہد کی یاد تازہ کرتا تھا۔ اکنافِ عالم کے اکابر علماء اور مشائخ بغداد میں جمع تھے۔ اربابِ صنعت و حرفت کی بڑی قدر تھی۔ بلخ، بخارا اور سمرقند سے ماہرینِ فن اور صناع یہاں آکر کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خلیفہ کے رعب و داب اور

سطوت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے سلاطین اس کے نام سے لرز اُٹھتے تھے۔ شیخ نے عباسیہ شان وشوکت کے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اسی آنکھوں سے مدینۃ السلام بغداد کی تباہی و بربادی بھی دیکھی۔ خلیفہ مستعصم ہزار نکما سہی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کے دم قدم سے مسلمانوں کی ساکھ قائم تھی۔ وہ کیا مٹا عراق وعرب سے مسلمان مٹ گیا بقحوائے ؎

ہمارے بعد بہت روئے ہم کو اہلِ وفا
کہ اپنے مٹنے سے مہر و وفا کا نام مٹا

شیخ نے بغداد کی بربادی پر اس وقت آنسو بہائے، جبکہ کوئی شخص اس پر رونے والا اور سوائے اسلام کے دُنیا میں کوئی اس کا سوگوار نہیں رہا تھا۔ مرثیہ کا ایک ایک شعر فارسی ادب کی جان ہے اور جب تک یہ زبان زندہ ہے، بغداد کی بربادی کا منظر بھی آنکھوں کے سامنے رہے گا۔ طوالت کے خوف سے اس مرثیے کے ہم صرف دو اشعار یہاں درج کرتے ہیں جن سے حضرت شیخ کی قادالکلامی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوال ملک مستعصم امیر المؤمنین
اے محمدؐ! گر قیامت مے برآری سر زخاک
سر برآور دیں قیامت درمیان خلق بیں

سیر وسیاحت

جب کتاب کے مطالعہ سے شیخ کا جی سیر ہو گیا تو اُنھوں نے نسخۂ کائنات کا مطالعہ شروع کیا۔ مدرسہ نظامیہ سے نکل کر سالہا سال تک ایشیا اور افریقہ کے شہروں کی سیاحت کرتے رہے۔ ایک جغرافیہ دان کا بیان ہے کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطہ کے سوا شیخ سعدیؒ سے بڑھ کر اور کوئی سیاح ہم نے نہیں سُنا۔ شیخ نے ایشیائے کوچک، حبش، بربر، مصر، شام، فلسطین، آرمینیا، ایران، توران، رودبار ویلم، کاشغر اور بصرہ و بغداد سے ہندوستان تک سیر کی

تھی ۔ عرب اور افریقہ میں تو ان کا بار بار جانا اور وہاں قیام کرنا ثابت ہے ۔ اکثر تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ شیخ نے چودہ حج پیادہ پا کئے ہیں ۔ شیخ کے اپنے کلام سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے ۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بالعموم بے سروسامان اور متوکل علی اللہ درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے ۔ بعض مقامات پر اس بے سروسامانی کے سبب انہیں سخت تکلیفوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ۔

شیخ کے مجاہدے شیخ سعدیؒ حضرت شیخ الاسلامؒ کے پیر بھائی تھے ۔ اس لیے ہزاروں میل ایک دوسرے سے دُور رہنے کے باوجود دونوں کا آپس میں گہرا رابطہ تھا ۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کے ساتھ سفر حضر میں شیخ نے کئی سال بسر کیے ہیں ۔ ایک دفعہ دورانِ سفر میں شیخ الشیوخ نے حضرت سعدیؒ کو دلسوزی و ہمدردی کے لہجہ میں نصیحتیں بھی کیں ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

مرا شیخ دانائے مُرشد شہاب — دو اندرز فرمود بر رُوئے آب
یکے آنکہ برخویش خود بیں مباش — دوم آنکہ برغیر بد بیں مباش

شیخ نے اپنی زندگی میں جو مجاہدے کئے ہیں اگر انہیں لکھنے بیٹھیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے ۔ سالہا سال تک مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں بہشتی بن کر لوگوں کو پانی پلایا ہے ۔ کئی کئی ماہ اہلِ اللہ کی قبور پر اعتکاف کیا ہے ۔ کئی کئی دنوں تک مسلسل روزے رکھے ہیں ۔ تحصیلِ عبرت اور حصولِ فیضان کے لیے ایشیا اور افریقہ کی بادہ پیمائی کی ۔ الغرض آپ کی زندگی گوناں گوں عجائبات کا مرقع ہے ۔ کہیں آپ فلاسفر کے بھیس میں تقریر کرتے دکھائی دیتے ہیں ، کہیں شاہی لباس پہنے امرائے سلطنت کو امورِ جہانبانی کی تعلیم دیتے دکھائی دیتے ہیں ۔ کہیں علم وفضل کا لبادہ اوڑھ کر طالبانِ علم وادب کی اشکال حل کرتے نظر آتے ہیں ۔ مفتاح التواریخ کے بیان کے بموجب آپ نے روم اور ہند کے جہاد میں بھی حصّہ لیا ہے ۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کے خاندان میں گلستان کا ایک نسخہ صدیوں سے محفوظ چلا آتا تھا جو چند سال گزرے شیخ نصیر الدین رئیس اعظم لاہور کے گھرانے میں منتقل ہو گیا ۔ اس کی بابت مشہور تھا کہ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نسخہ خاص طور پر حضرت صدر الدین عارف باللہ

کو شاہ رکن عالمؒ کے لیے لکھ کر دیا تھا۔

آپ کی تصانیف میں گلستاں اور بوستان کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اربابِ ادب نے آپ کو "پیغمبرِ سخن"، تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ مولانا جامی فرماتے ہیں ؎

در شعر سہ کس پیمبر انند! قولے است کہ جملگی بر آنند
فردوسی و انوری و سعدی ہر چند کہ لانبی بعدی

کلام کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں فرسودگی اور غرابت کا اساس تک نہیں ہوتا، جس وقت پڑھیئے، جس رنگ میں پڑھیئے، نیا لطف آتا ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

ولہ

بزرگے را پرسیدند از سیرت اخوان الصفا گفت کمینہ[1] آنکہ مرادِ خاطر یاران رابمصالح خود مقدم دارد کہ حکما گفتہ اند برادر کہ در بند خویش است نہ براد راست نہ خویش است۔

؎ ہمراہ گر شتاب کند ہمراہِ تو نیست
دل در کسے مبند کہ دل بستۂ تو نیست

قطعہ

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب گبر و ترسا وظیفہ خور داری!
دوستاں را کجا کنی محروم توکہ با دشمناں نظر داری

شعر

کرم بین و لطفِ خداوندگار
گناہ بندہ کرد است او شرمسار

قطعہ

اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جان شد و آواز نیامد
این مدعیاں در طلبش بیخبر انند کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

---

[1] یعنی ادنیٰ درجہ

دیگر

گلے خوشبوے در حمام روزے رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ! کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم ولیکن مدتے ، با گل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

قطعہ

اے سیر ترا نانِ جویں خوش ننماید معشوق منست آنکہ بنزدیک تو زشت است
حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف وز دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

حکایت

بزرگے دیدم اندر کوہسارے قناعت کردہ از دنیا بغارے
چرا گفتم بشہر اندر نیائی کہ بارے بند از دل بر کشائی
بگفت آنجا پریرویان نغز اند چو گل بسیار شد پیلاں بلغزند

سیّد جلال تبریزیؒ

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ناصر الدین قباچہ کے زمانے میں کئی دنوں تک سید جلال الدین تبریزیؒ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت شیخ الاسلامؒ کے مہمان رہے تھے۔ چنگیزیوں کے حملہ کے بعد حضرت بختیار کاکیؒ تو دہلی چلے گئے۔ لیکن سیّد جلال تبریزیؒ غزنی کو چل دیئے۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے دہلی کا رُخ کیا۔ سلطان شمس الدین ان کی عظمت اور بزرگی کی شہرت پہلے سے سُن چکا تھا۔ چنانچہ جب یہ دہلی کے قریب پہنچے، تو سلطان علماء اور مشائخ کی ایک جماعت کے ساتھ ان کے استقبال کو نکلا۔ گھوڑے سے اُتر کر زیارت کی اور اُنہیں آگے کر کے خود ادب سے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ شیخ نجم الدین صغریٰ جو

ان دنوں شیخ الاسلام تھے، حضرت کی یہ توقیر دیکھ کر سخت آزردہ ہوئے۔ ان کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ مگر اس کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس عرصہ میں سلطان نے شیخ الاسلام سے دریافت کیا کہ حضرت کو کہاں اُتارنا چاہیئے؟ یہ دریافت کرنے سے سلطان کا تو مقصد یہ تھا کہ کوئی ایسا محل بتائیں گے، جہاں مہمانِ عزیز کو زیادہ سُکھ پہنچ سکے گا۔ لیکن شیخ نے عداوت سے ایسا مکان تجویز کیا جو بیت الجن کے نام سے مشہور تھا۔ عرصہ سے بند پڑا تھا اور کوئی اس میں رہنے کا حوصلہ نہ کرتا تھا۔

سلطان نے مہمانِ عزیز کو اس مکان میں ٹھہرانا پسند نہ کیا۔ لیکن نجم الدین صغریٰ نے کہا کہ اگر سید جلال کامل درویش ہوں گے تو مکان جنوں سے پاک ہو جائے گا اور اگر ناقص ہوں گے تو دھوکہ دہی کی سزا پائیں گے۔

یہ گفتگو بالکل علیحدگی میں ہوئی، لیکن سید جلال نے کشف کے ذریعے معلوم کر کے از خود اس مکان کی کنجی منگوا بھیجی۔

جب کنجی آئی، اپنے خادم کو جس کا نام تراب تھا، فرمایا کہ اس مکان میں بلند آواز سے پکار کر کہہ دے:

"اے جن قوم! سید جلال اس مکان میں آ رہا ہے جلدی اس گھر سے نکل جاؤ۔"

تراب نے شیخ کی ہدایت کے بموجب یہی پیغام جا کر پہنچایا۔ سب جن نکل گئے اور مکان تمام بلیات سے پاک ہو گیا۔ سید جلال تبریزیؒ اطمینان سے اس مکان میں جا کر فروکش ہوئے۔

دوسرے دن خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کو ملنے کے لیے گھر سے روانہ ہوئے۔ خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کو نور باطن سے معلوم ہو گیا کہ سید جلال ملنے کے لیے چلے آتے ہیں۔ فوراً اُٹھ کر استقبال کو بڑھے۔ راستے میں دونوں بزرگوں کا ملاپ ہوا اور حضرت بختیار کاکی قدس سرہٗ اپنے محترم دوست کو پہلو میں لیے خانقاہ واپس آئے۔ یہاں مجلسِ سماع گرم تھی۔ سب درویش جمع تھے۔ اس شعر پر خواجہ صاحب کو

بھی وجد آگیا ؎

درمے کدۂ وحدت ہشیار نمے گنجد
در عالم نیرنگی جز یار نمے گنجد

جمعہ کا دن تھا، نماز تک دونوں بزرگ ہم صحبت رہے۔ اس کے بعد سیّد جلال اپنے مکان کو لوٹ آئے۔ سلطان نے سیّد جلال سے مرشد کا جو یہ رابطہ دیکھا، وہ اُن کا اور معتقد ہوگیا۔

شیخ نجم الدّین صغریٰ کا دُوسرا حملہ

اس سے شیخ الاسلام کو زیادہ آزردگی پیدا ہوئی اور وہ آپ کو سلطان کی نظروں سے گرانے کی تجویز سوچنے لگا۔ سیّد جلال تبریزی بڑے عبادت گزار انسان تھے اور فجر کی نماز عشاء کے وضو سے ادا کرتے تھے۔ ساری رات مصلّٰی پر کٹتی تھی۔ نماز کے بعد چاشت کی نماز تک پلنگ پر آرام فرماتے تھے۔

ان ایّام میں حضرت نے ڈیڑھ ہزار روپے میں ایک ترکی غلام خرید کر اپنی خدمت میں رکھا ہُوا تھا۔ اُس کے حُسن وجمال کا یہ عالم تھا کہ حسینانِ جہاں اُس پر جان دیتے تھے۔ ایک دن سیّد جلال صُبح کی نماز ادا کر کے اپنے مکان کے صحن میں چادر اوڑھے آرام فرمارہے تھے اور وہی غلام پاس بیٹھا پاؤں دبا رہا تھا۔ اتفاق سے اس روز شیخ نجم الدین صغریٰ بہت سویرے سُلطان کے ہاں محل سرائے میں چلے آئے تھے۔ شاہی محل کی چھت پر صبح کی نماز ہوئی۔ چونکہ شیخ بادشاہ سے ذرا آگے کھڑے تھے، ان کی نظر سیّد جلال کے صحن میں جا پڑی۔ اُسے خیال ہُوا کہ حضرت جلال نماز سے غافل ہو کر محوِ خواب ہیں۔ بادشاہ کو مرغول کے پاس لے جاکر کہا:

"دیکھیئے! آپ ایسے آدمی کے معتقد ہوئے ہیں۔ یہ سونے کا کونسا وقت ہے؟ اور ایک خوب صُورت غلام بھی پاس بٹھا رکھا ہے"

شیخ کو نورِ باطن سے نجم الدین صغریٰ کی سازش کا پتہ چل گیا۔ چادر چہرہ سے ہٹادی اور بلند آواز سے پکار کر کہا:

"اے نجم الدین! اگر تو پہلے دیکھتا، تو اس لڑکے کو میرے پاس نہ پاتا۔"
سلطان شرمندہ ہوا اور شیخ سے بولا:
"آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

بجائے نادم ہونے کے شیخ اور جل بھن گیا۔ اس وقت تو یہ بات رفت گذشت ہو گئی لیکن اندر ہی اندر شیخ، سید جلال کو بدنام کرنے کی تجویزیں سوچنے لگا۔

شیخ نجم الدین کا تیسرا حملہ

دہلی میں گوہر نامی ایک خوبصورت رقاصہ رہتی تھی، جو عشوہ گری اور رقص و سرود میں یکتائے زمانہ تھی اُسے پانچ سو اشرفیاں دینے کا وعدہ کر کے آمادہ کیا کہ وہ سید جلال تبریزی کو تہمت زنا سے مطعون کرے۔ اڑھائی سو اشرفیاں اُسے پیشگی دے دی گئیں اور اڑھائی سو احمد مشرف نامی ایک بنیئے کے پاس امانت رکھوا دی گئیں کہ جب یہ معاملہ رقاصۂ مذکور پایۂ ثبوت کو پہنچا دے اس وقت اسے دی جائیں۔

رقاصہ نے سلطان کی خدمت میں جا کر سید جلال تبریزی پر تہمت لگائی۔ بادشاہ یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ حضرت سید جلال اس الزام سے بالکل بری ہیں فاحشہ عورت کی شہادت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ کیونکہ زنا ثابت کرنے کے لیے اعین اربع کی شہادت ضروری تھی۔ لیکن چونکہ مقدمہ سامنے آ چکا تھا، اس لیے سلطان نے شرعی تحقیقات کی غرض سے محضر طلب کرنے کا حکم جاری کیا۔ محضر میں شرکت کے لیے اکابر علماء اور مشائخ کو خصوصی دعوت دی گئی۔

حضرت شیخ الاسلامؒ کی آمد

جمعہ کا دن تھا، نماز کے بعد جامع مسجد علماء اور مشائخ سے بھری پڑی تھی۔ مولانا جمالی کے بیان کے بموجب اس محضر میں صرف اڑھائی سو تو اولیائے کرام شریک تھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ بھی اپنے رفیقوں کے ہمراہ تشریف لا چکے تھے اور سلطان کے پہلو میں تشریف رکھتے تھے۔ سلطان شمس الدین التمش نے شیخ نجم الدین صغریٰ سے فرمایا کہ ان علماء و مشائخ میں سے جس کو آپ کی طبیعت چاہے ثالث مقرر کر لیجیے۔ تا کہ عادلانہ فیصلہ ہو سکے۔ شیخ نجم الدین نے

حضرت شیخ الاسلامؒ کا نام پیش کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب حضرت شیخ الاسلامؒ اور سید جلال شیخ الشیوخ سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے مرخص ہو کر ملتان کو روانہ ہوئے تھے تو نیشاپور میں ان کے درمیان لطیف سی شکر رنجی ہو گئی تھی۔ شیخ نجم الدین کو اس واقعہ کا علم تھا اور وہ ان دونوں بزرگوں کی کشیدگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ نیز انہیں شیخ الاسلامؒ کی خشک عابدانہ زندگی کا بھی پتہ تھا کہ وہ شکوک اور شبہات کی دنیا سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔
بہر حال وہ اس امر کو ضرور محسوس کریں گے کہ سید جلال نے اپنے طرزِ عمل سے ایسا موقع کیوں بہم پہنچایا۔ جس پر مخالفین کو اس قسم کے الزامات تراشنے کی جرأت ہوئی۔

الغرض حضرت شیخ الاسلامؒ ثالث تسلیم کر لیے گئے۔ اب شیخ نجم الدین نے رقاصہ کو پیش کیا۔ سید جلال الدین کو طلب کیا گیا۔ وہ جونہی مسجد میں داخل ہوئے، تمام مشائخ ان کی بزرگی اور عظمت سے متاثر ہو کر استقبال کو بڑھے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے لپک کر اُن کی جوتیاں سنبھال لیں اور آستین مبارک میں لپیٹ کر اپنی جگہ واپس آ بیٹھے۔ سلطان شمس الدین اس کارروائی کو چشمِ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا:

"صاحبو! جبکہ امام الاولیاء بہاء الدین زکریا جیسے جلیل القدر ثالث نے سید جلال الدین کی اس قدر توقیر کی ہے، اُن کی بزرگی میں کلام کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ پس وہ الزام جو رقاصہ نے سید جلال پر لگایا ہے، باطل ہے۔"

حضرت شیخ الاسلامؒ نے کھڑے ہو کر فرمایا:

"میرے لیے فخر کی بات ہے کہ شیخ جلال تبریزی کے پاؤں کی خاک کو اپنے آنکھوں کا سُرمہ بناؤں۔ کیونکہ وہ میرے مُرشد شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے ساتھ سات سال تک سفر حضر میں رہے ہے۔ لیکن شاید شیخ الاسلام نجم الدین کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ بہاء الدینؒ نے شیخ جلال تبریزی کی تعظیم کر کے اُن کے عیب پر پردہ ڈال دیا ہے، تو یہ اہل اللہ پر بخوبی روشن ہے کہ حضرت جلال الدین سے ایسے فعل شنیع کا واقع ہونا محال ہے۔ لیکن پھر بھی دلائل بیّنہ کا اظہار ضروری ہے۔ اس لیے مدعیہ رقاصہ کو

پیش کیا جائے "۔

چنانچہ رقاصہ شیخ الاسلام کے سامنے لائی گئی۔ حضرت نے گرج کر فرمایا:

"اے فاسقہ! ولی اللہ سے کوئی امر پوشیدہ نہیں۔ سچ سچ بیان کرو ورنہ اپنے کئے کی سزا پائے گی "۔

رقاصہ پر حضرت کی شخصیت کا رُعب کچھ اس طرح سے اثر انداز ہُوا کہ اس نے سارا حال من وعن بیان کر دیا اور بولی:

"خدا شاہد ہے کہ یہ سب دروغ اور افترا ہے اور حضرت جلال الدین آپ خیالات سے بھی پاکیزہ تر ہیں۔ شیخ نجم الدین صغریٰ نے مجھے پانچ سو اشرفیاں دینا کی تھیں۔ ان میں سے اڑھائی سو تو میں لے چکی ہوں اور باقی اڑھائی سو احمد مشرف سبزی فروش کے پاس امانت پڑی ہیں کہ بہتان ثابت ہونے پر مجھے ادا کی جائیں[1] "۔

سبزی فروش بُلایا گیا، اُس نے بھی رقاصہ کے بیان کی تائید کی اور اڑھائی سو اشرفیاں لا کر حضرت کے روبرو رکھ دیں۔ شیخ نجم الدینؒ صغریٰ کو یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ اس کے مکروفریب کا بھانڈا اس طرح چوراہے میں پھوٹے گا۔ وہ شدتِ غم سے چکرا کر گر پڑا۔[2]

سلطان شمس الدین نے برہم ہو کر حکم دیا کہ شیخ نجم الدین کی گردن اُڑا دی جائے اور خواجہ قطب الدین بختیار کو شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز کیا جائے۔

شیخ الاسلام نے فرمایا کہ نجم الدین اپنے کئے کی سزا خود پائے گا۔ آپ اس سے درگزر فرمائیں۔

---

[1] (ا) خلاصۃ العارفین بحظ مولانا ضیاء الدین ملتانی، ص ۳۲ (ب) سیر العارفین جلد ۲ ص ۱۳۱ تا ۱۳۴ (ج) فوائد السالکین، ص ۲۴

[2] اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شیخ نجم الدین نے بعارضہ دردِ شکم انتقال کیا۔ اللہ والوں کا اخلاق ملاحظہ ہو کہ اس وقت سید جلال الدین بدایوں میں تھے۔ جب اُنہیں اس امر کا کشف ہوا، تو انھوں نے مریدوں سمیت شیخ نجم الدین کا غائبانہ جنازہ پڑھا۔

خواجہ قطب الدین نے شیخ الاسلامی کے بارے میں ایک رات کی مُہلت مانگی اور فرمایا:

"اے یاران! میرا مشورہ یہ ہے کہ آج رات استخارہ کیجئے۔ حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلّم جس کے نام حکم دیں، اُسے شیخ الاسلام کا منصب دیا جائے"

رات کو تمام مشائخ نے استخارہ کیا۔ آدھی رات تھی کہ سب نے خواب میں دیکھا کہ وہ عرش کے نیچے حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلّم کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں حضرتؐ نے شیخ الاسلامؒ کو بُلا کر اپنے ہاتھوں سے خلعت پہنائی اور فرمایا:

"شیخ الاسلامی مُبارک!"

صُبح کو تمام مشائخ پھر اکٹھے ہوئے اور اُنھوں نے حضرت شیخ الاسلامؒ کو بارگاہِ نبوت سے شیخ الاسلامی کی خلعت پانے پر تہنیت پیش کی۔ سلطان خود بھی خواب میں یہ نظارہ دیکھ چکا تھا۔ اُس نے حضرت سے درخواست کی کہ وہ اس منصب کو قبول فرمالیں۔ حضرت نے مُسکرا کر رضامندی کا اظہار[1] کر دیا۔ یہاں سے فارغ ہوکر حضرت شیخ الاسلام اور شیخ جلال الدین تبریزی نے ایک روز جمنا کے کنارے قیام فرمایا۔

---

[1] مولانا جمالی سیر العارفین میں لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلامی کا منصب شیخ الاسلامؒ کے زمانے سے اب تک آپ کے خاندان میں چلا آتا ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:

"واز آنگاہ تا الی یومنا شیخ الاسلامی در خاندان کرام و دودمان عظام ایشان است"

مولانا جمالی شہنشاہ ہمایوں کے مصاحب تھے اور اُن کے زمانے میں شیخ صدر الدین شہر اللہ صاحب سجادہ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس خاندان کے آخری بزرگ تھے، جنھیں ہندوستان کی شیخ الاسلامی کا منصب حاصل تھا۔

مولانا جمالی یہ بھی لکھتے ہیں کہ دہلی شہر میں شیخ صدر الدین شہر اللہ سے بڑا ارتباط اور میل جول رہا تھا۔ ممکن ہے شیخ کا یہ قیام شیخ الاسلامی سے متعلق ہو۔ لکھتے ہیں:

"میانِ ایں حقیر و حضرت ایشان در شہر دہلی اتحادے و محبّتے کامل بود"

(سیر العارفین، جلد ۲، ص ۳۷)

دُوسرے دن شیخ الاسلامؒ ملتان کو روانہ ہُوئے اور سید جلال تبریزی دہلی سے بدایون تشریف لے گئے۔ اس کے بعد سید جلال تبریزی اور شیخ الاسلام قدس سرہم کی ملاقات نہیں ہوئی سید جلال تبریزی کا مزار نور بار دیو بندر (بنگالہ) میں ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ)

شیخ الاسلامؒ کے چند اور احبابؒ

سیّد نُورالدّین مُبارک غزنویؒ

حضرت شیخ الاسلامؒ کے زمانے میں اُن کے جو پیر بھائی بغداد سے ہندوستان آئے، ان میں ایک سید نورالدین مُبارک غزنوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کا دہلی میں بڑا اثر تھا۔ جس وقت امساک باراں کی شکایت ہوتی۔ لوگ اُن سے دُعا منگواتے۔ اُسی وقت بارش برسنے لگتی تھی۔ سلطان شمس الدین اُن کے بڑے معتقد تھے۔ ۶۳۲ھ میں وفات پائی مزار نور بار دہلی میں ہے۔

قاضی حمید الدین ناگوری

یہ بھی شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مُرید تھے۔ جب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بغداد میں آئے، تو ان سے گہرے روابط و مراسم قائم ہو گئے۔ جو زندگی کے آخری دَور تک استوار رہے۔ بغداد سے مدینہ منورہ آئے۔ ایک برس دو ماہ سات دن یہاں مقیم رہے۔ پھر بزمانہ سلطان التمش دہلی پہنچے اور خواجہ بختیار کاکیؒ کے ہاں قیام کیا۔ رمضان ۶۴۳ھ میں تراویح کے بعد وتر پڑھ رہے تھے جب سجدہ میں گئے، روح عالم بالا کو پرواز کر گئی[1]

مولانا جمالی نے قاضی صاحب کو علم و وقار کا کوہ قاف، بحر اسرار کا لجہ، سالکین کا پیشوا اور ثانی ابو سفیان ثوری کہا ہے۔

مولانا عبدالحق صاحب محدث اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں۔

---

[1] سیر العارفینؒ جلد ۲ صفحہ ۲۱

"اوجامع بود میان علوم شریعت وطریقت وحقیقت"

سفینۃ الاولیاء کے صفحہ ۱۶۰ پر آپ کو یہ ریمارکس دیئے گئے ہیں۔

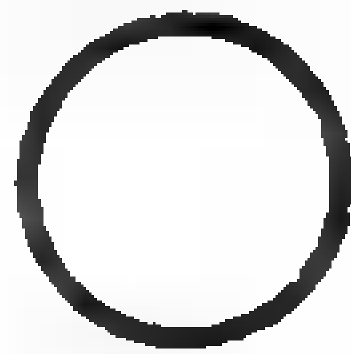
"در تجرید وتفرید یگانہ عصر واز متقدمانِ مشائخ ہند وجامع میان علوم ظاہری و باطنی وصاحب کرامات ومقامات عالیہ بود"

طالع شموس، لوائح اور راحت الارواح آپ کی ممتاز تصانیف ہیں۔

شیخ ضیاءُ الدین رومی قدّس سرّہٗ

یہ بزرگ بھی حضرت شیخ الشیوخ کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی اُن کا مُرید تھا اور بڑا اعتقاد رکھتا تھا۔ اُس کی وفات پر اُس کا بیٹا سلطان قطب الدین مبارک شاہ اُن کا مُرید ہُوا۔ صاحب "تذکرہ چشتیہ" نے آپ کا سال وفات ۷۲۱ھ لکھا ہے۔ حضرت کی عمر ۱۳۵ سال بیان کی جاتی ہے۔ گویا شیخ الشیوخ کے بعد ۹۱ سال زندہ رہے۔

محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء سے سلطان قطب الدین مبارک شاہ کو سخت پرخاش تھی۔ حضرت نے شیخ ضیاء الدین رومی کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے مُرید کو سمجھائیں کہ درویشوں کو آزار پہنچانا کسی مذہب میں جائز نہیں۔ مگر اس پیغام کے پہنچنے سے پہلے شیخ کا انتقال ہوگیا اور اُن کی خانقاہ میں بادشاہ اور اس کے تمام اکابر امراء فاتحہ خوانی کے لیے جمع ہوئے۔ محبوب الٰہی نے بھی اس مجلس میں شرکت فرمائی۔ مقبرہ حضرت کا دہلی میں ہے۔ مُدتوں حضرت کا عُرس ہوتا رہا۔ آج کی کیفیت معلوم نہیں۔ رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔



سیر و سیاحت

صُوفیائے کرام کی سیر و سیاحت بے مقصد نہیں ہوتی ۔ ابتداء میں وہ حقائق و معارف کی تلاش اور فیوض و برکات حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلتے تھے ۔ لیکن جب وہ علم و عرفان کی نعمت سے مالامال ہو جاتے تھے تو پھر ان کی سیاحت کا مقصد خلقِ خُدا کو اسی دولت سے بہرہ مند کرنا ہوتا تھا ۔ حضرت سیّد اشرف جہانگیر سمنانی[1] علیہ الرحمۃ اور مولانا محدّث دہلوی[2] بھی اسی نظریئے کی تائید کرتے ہیں ۔

حضرت شیخ الاسلامؒ تنہا سفر پر بہت کم روانہ ہوئے ہیں ۔ شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے ساتھ زیادہ وقت کٹا ہے ۔ یا پھر چار یاروں نے مل کر کشمیر سے ساحل سمندر تک دَورے کئے ہیں ۔ ہم مخدوم لعل شہبازؒ کے حالات میں "تحفۃ الکرام" کے حوالے سے ثابت کر چکے ہیں کہ چار یار سے حضرت شیخ الاسلامؒ اور ان کے رفقاء بابا فریدؒ ، لال شہباز اور سیّد جلال بخاری مراد ہیں (رحمہم اللہ علیہم اجمعین)

"پنج پیر" کی اصطلاح زیادہ تر پنجابی داستان گوؤں نے اپنے قصّوں میں اپنائی ہے ۔ ممکن ہے سندھی شاعری میں بھی ان کا ذکر موجود ہو ۔ معلوم ہوتا ہے سلطان حمیدالدین حاکمؒ کے آملنے سے یہی چاروں دوست پنج پیر کہلانے لگے ہوں گے ۔ ان کا گرمائی سفر کشمیر اور صوبہ سرحد کی طرف ہوتا تھا کبھی کبھی بلخ اور بخارا کی طرف بھی چلے جاتے تھے ۔ موسمِ بہار کوہ سلیمان کے دامن میں اور ساون بھادوں سندھ کی غاروں میں بسر کرتے تھے ۔

---

[1] لطائف اشرفی جلد ۱ ص ۸۵ ۔

[2] مولانا عبدالحق محدّث دہلویؒ صاحبِ اخبار الاخیار، مطبع مجتبائی پریس ۱۳۳۲ھ ص ۲۶ تا ۲۸ ۔

سہوان کے قریب چشمہ واہی کراچی کے پاس سمندر کے کنارے منگھا پیر اور سکھر کے مضافات میں وہ نشست گاہیں اب تک منہ کھولے حضرت شیخ الاسلامؒ اور اُن کے یارانِ بے ریا کی راہ تک رہی ہیں۔

"سفر" اب بھی سقر خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن آج سے سات سو برس پیشتر جبکہ آمدورفت کے ذرائع عصرِ حاضر کی طرح سہل نہ تھے۔ دریاؤں اور ندی نالوں پر پلوں کا انتظام نہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔ چنگیز خاں اور ہلاکو نے ایران اور عراق و عرب کے مسلمانوں کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔ بغداد کے لاکھوں باشندے اس طرح تلوار کے گھاٹ اُتارے گئے کہ کوئی اُن پر آنسو بہانے والا نہیں تھا۔ خلیفہ المستعصم کو ہاتھی سے کچل دیا گیا۔ اس کی نازک اندام بہو بیٹیوں کو بر سرِ عام بے عزت کیا گیا۔ تاج البلاد بغداد جس کے گلی کوچوں سے آٹھوں پہر مشک اور عنبر کی لپٹیں اُٹھا کرتی تھیں، انسانی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ کئی دنوں تک چیل، گدھ اور کتے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ان لاشوں کو کھاتے رہے اور آخر کو تعفن اس قدر بڑھا کہ کتے بھی شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یہ اسلامی عظمت و جلال کے مرکز کی حالت تھی۔ مضافات کی صورتِ حال تو اس سے بھی بدتر تھی۔ آلِ چنگیز کو جہاں کہیں سے مسلمانوں کی بو پہنچی، خونخوار بھیڑیوں کی طرح چڑھ دوڑی۔ اس تاخت سے نہ خوارزم بچا، نہ ایران، نہ عراق بچا نہ ہندوستان۔ ہر طرف اُنہوں نے کئی حملے کئے اور ہر حملے میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہا کر لوٹے۔

سلطان جلال الدین خوارزم شاہ فوج کے ایک دستہ کو جلو میں لیے ملک ملک کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ سندھ کا سرکش تاجدار ناصر الدین قباچہ، سلطان شمس الدین التمش سے ٹکرانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ہر جگہ پکڑ دھکڑ کا بازار گرم تھا۔ ہر شخص پر جاسوسی کا شبہ ہو سکتا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ روڑے کنکر کو امان تک نہ تھی۔ سیر و سیاحت کا خیال کس کو آ سکتا تھا۔ لیکن شیخ الاسلامؒ اور ان کے یارانِ طریقت نے ایسے دور میں کشمیر سے سراندیپ اور دہلی سے بلخ و بخارا تک کے سفر کیے اور ہزاروں گم گشتگانِ بادیۂ ضلالت کو صراطِ مستقیم پر چلایا۔ اس سے ہم یہ یقین کرنے

پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اولیاء اللہ خدا کے حکم کے تابع تھے۔ ان کا چلنا پھرنا اور اُٹھنا بیٹھنا سب رضائے الٰہی کے لیے تھا۔ اب ہم ناظرین کرام کے سامنے حضرت کی سیاحت کے چند مناظر پیش کرتے ہیں۔

شیخ الاسلامؒ بغداد میں

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ یہ دُعاگو اور شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا مشائخ بغداد کے حلقہ میں بیٹھے تھے۔ اولیاء اللہ کی کرامات کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک صاحب بول اُٹھے کہ اولیاء اللہ میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ جب چاہیں کسی مکان کو مرصّع اور مذہب بنا دیں۔ اگر اس مجلس میں کوئی صاحب کمال موجود ہے تو اس مسجد پر توجّہ کرے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ نے مراقبہ میں سر جھکایا۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر فرمایا:

"یاران! ذرا مسجد پر نظر کیجئے"۔

لوگوں نے بیک وقت نظر اُٹھا کر مسجد کو دیکھا۔ اُس کی تمام اینٹیں اور لکڑیاں سونے کی نظر آرہی تھیں اور تمام مسجد مرصّع و مذہّب بن چکی تھی۔

تمام جماعت کھڑی ہوگئی اور انہوں نے اقرار کیا کہ بے شک مردانِ خدا میں ایسی ہی کمالیت ہوتی ہے۔

ایک باکمال قلندر

شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلامؒ نے اثنائے سفر میں ایک مسجد میں قیام کیا۔ پاس ہی دلق پوش قلندروں کی ایک جماعت اُتری ہوئی تھی۔ انہوں نے سید جمال مجرد ساوُجی[1] کا بانا پہن رکھا تھا۔ رات کو جب حضرت مراقبہ سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلے اور قلندروں پر نظر کی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک قلندر کی پیشانی سے نُور چمک رہا ہے۔ حضرت کو تعجب ہُوا کہ اس لباس اور صُورت کو تجلیاتِ نُور سے کیا مناسبت ہو سکتی ہے؟ اس قلندر کے پاس تشریف لے جا کر آہستگی سے پُوچھا:

---

[1] شیخ نصیر الدین 'خیر المجالس' میں لکھتے ہیں کہ سید جمال الدین ساوُجیؒ مصر کے مفتی تھے اور اتنے بڑے علامہ (باقی صفحہ ۱۹۲ پر)

"اے مردِ خدا! تواس گروہ میں کیا کرتا ہے"؟

اس نے جواب دیا "اے زکریا! تاکہ تجھے معلوم ہو کہ ہر قوم میں خدا کا ایک خاص بندہ ہوتا ہے جس کے طفیل اس قوم کے عوام بخش دیئے جاتے ہیں"

حضرت شیخ الاسلامؒ نے جوہر لطیف پا کر اس کی اصلاح کا ارادہ فرمالیا۔ یہ قلندر موصل کے بہت بڑے عالم اور مجذوب تھے۔ سید عبدالقدوس نام تھا اور سید جمال مجرد کی قبر پر انہوں نے قلندری بانا پہن لیا تھا۔ حضرت شیخ نے قوتِ باطنی سے اُسے لباسِ قلندری سے نکال کر عالم جذبہ سے عالم سلوک کی طرف پہنچا دیا۔ جب عبدالقدوس نے دل کی کائنات میں یہ تبدیلی محسوس کی تو انہوں نے فوراً قلندرانہ لباس اُتار پھینکا اور حضرت کے قدموں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱ سے) تھے کہ جس مسئلہ میں کوئی مشکل پیش آتی، آپ بغیر کتاب دیکھے حل کر دیتے تھے۔ اس لیے اہلِ مصر انہیں کتب خانہ رواں کہتے تھے۔ آپ کے حسن و جمال کا یہ عالم تھا کہ یوسف ثانی کہلاتے تھے سوءِ اتفاق سے مصر کی ایک امیر زادی اُن پر عاشق ہو گئی۔ آپ نے اس سے ہر چند پیچھا چھوڑانے کی کوشش کی مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخر تنگ آ کر ایک دن آدھی رات کو مصر سے بھاگ نکلے۔ یہاں سے سات آٹھ منزلوں کے فاصلے پر دمیاط کا مقام پڑتا تھا۔ جو یوسف علیہ السلام کے زمانے سے ویران چلا آتا تھا۔ وہاں پہنچ کر ایک گورستان میں قیام کیا۔ مصری خاتون کو اُن کے فرار کا پتہ چلا تو وہ بھی بیتاب ہو کر تعاقب میں روانہ ہوئی۔ سید جمال یہ خبر سُن کر بڑے گھبرائے۔ بارگاہِ الٰہی میں اپنے زوالِ حسن کی استدعا کی۔ دعا قبول ہوئی۔ فوراً ریش و بروت اور ابرو کا صفایا ہو گیا۔ مصری خاتون نے جب یہ کیفیت دیکھی تو روگرداں ہو کر واپس لوٹ گئی۔ سید جمال پر اس تبدیلی کے وقت پہلے تو کئی دن بے ہوشی طاری رہی لیکن پھر کچھ ہوش میں حیرت زدوں کی طرح بیٹھ گئے اور نماز روزہ وغیرہ سب کچھ چھوٹ گیا۔ اڑتی اڑتی یہ خبر مصر جا پہنچی۔ ملک العلماء سخت برہم ہوئے اور علماء کی ایک جماعت ساتھ کر کے دمیاط پہنچے ان پر الحاد اور رفض کا الزام لگا کر قلعی گرم کر کے ان کے حلق میں ڈلوائی۔ لیکن جب انہیں کچھ ضرر نہ پہنچا تو سب معتقد ہو گئے۔ سید جمالؒ کی باقی زندگی اسی مقام میں بسر ہوئی۔ ان کے انتقال پر جو بھی حضرت کا جانشین مقرر ہوا اس نے ریش و بروت کا صفایا کر کے قلندرانہ لباس پہن لیا۔ آہستہ آہستہ اُن کے دوسرے معتقدوں نے بھی یہ ہیئت کذائی اختیار کر لی۔ چنانچہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ (فریدی)

میں گرویدہ ہو گئے۔ آپ نے اُنہیں خرقہ خاص سے مشرف کیا اور کئی دن اپنی صحبت میں رکھ کر درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ ہزاروں فاسق و بدکار آپ کے فیضان سے سبیل الرشاد پر فائز المرام ہوئے۔ مقبرہ آپ کا قصبہ نائین میں ہے جو یزد اور موصل کے درمیان واقع ہے۔ (رحمۃ اللہ علیہ)

عذابِ قبر سے نجات

شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں کہ شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے بڑی سیاحت فرمائی تھی۔ اس فقیر نے تیرہ سو اسی مشائخ کبار کی زیارت کی ہے۔ لیکن شیخ الاسلام ملتانیؒ نے مجھ سے بھی زیادہ مشائخ دیکھے تھے۔ ایک مرتبہ اُن کا گزر ایسے شہر سے ہُوا جہاں ایک بڑی غار تھی۔ جب کوئی شخص فوت ہوتا، تو اُس کی لاش کو اس غار میں چھوڑ آتے تھے اور ساتھ ہی ایک زندہ آدمی وہاں بٹھا آتے تاکہ دیکھ سکے کہ مُردے پر کیا گزرتی ہے؟ ایک دن ایک شخص فوت ہو گیا۔ جب اُس کی لاش کو غار کے دہانے پر لے گئے تو شیخ الاسلام بہاء الدین ملتانیؒ نے درخواست کی کہ آج مجھے یہاں چھوڑ جاؤ۔ چنانچہ وہ حضرت کو مُردے کے ہمراہ غار میں بند کر کے چلے آئے۔

جب کچھ رات گزری تو عذاب کے فرشتے مُردے کو عذاب دینے کے لیے آ پہنچے۔ لاش حرکت میں آئی اور مُردہ اُٹھ کر حضرت کے قدموں میں آپڑا۔ اسی وقت ایک غیبی آواز سُنی گئی:

"اُسے چھوڑ دو! ہم نہیں چاہتے کہ اس شخص کو عذاب کریں جو شیخ الاسلام بہاء الحق والدین ابو محمد زکریا کی حمایت میں آچکا ہو۔"

فرشتے اُسی وقت واپس لوٹ گئے۔ فرماتے ہیں کہ یہ ندا غار کے آس پاس رہنے والوں نے بھی سُنی۔ شہر بھر میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ حضرت کی زیارت کو دوڑے مگر شیخ الاسلام غار سے نکل کر کسی نامعلوم سمت کو چل دیئے۔

شیخ الاسلامؒ بخارا میں

ایک روز شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ علماءِ بخارا سے گفتگو میں معروف تھے۔ ولایت کے بارے میں بحث ہو رہی تھی۔ معاملہ

[illegible]

جنات کے لیے دعا

حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ جب شیخ الاسلام سمرقند پہنچے تو وہاں جناتوں کا ایک گروہ غار میں آباد تھا۔ اتفاق سے ایک روز آپ وہاں جا نکلے۔ انہوں نے جب ایک نورانی چہرہ کو اپنے سامنے پایا تو وہ سب کے سب حضور کے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا:

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

۱؎ مسالک السالکین، جلد ۱ ص ۳۸۱ مطبوعہ نولکشور پریس لاہور

۲؎ ״ ״ ״ ص ۳۸۲

عرض کی۔ حضرت کی دُعا چاہتے ہیں تاکہ اللہ جل شانہٗ و تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے یہ مرض دُور کر دے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ ندا آئی۔

"اے بہاء الدین! یہ گروہ زیرِ عتاب ہے۔ ان کا معاملہ پیش نہ کر"

حضرت کی ذات میں کرم اور رحم کا مادہ زیادہ تھا۔ مولا کی جناب میں دوبارہ گڑگڑا کر عرض کی:

"اے ارحم الراحمین! اگر تیری ذات ان پر رحم نہیں کرے گی تو یہ اور کس دروازے پر جائیں گے"

رحمتِ الٰہی جوش میں آئی اور حضرت کی درخواست منظور ہو گئی۔ وہاں ایک حوض پانی سے بھرا ہُوا موجود تھا۔ آپ نے جذامیوں کو اس میں غسل کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ طرفۃ العین میں سب کے سب شفایاب ہو گئے۔

سراندیپ کا سفر

شیخ نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ الاسلام حضرت بہاء الدین زکریا سراندیپ کی طرف تشریف لے گئے۔ سال بھر ایک پہاڑ پر قیام رہا۔ ایک دن ایک بوڑھا آدمی لکڑیوں کا پشتارہ اُٹھائے پاس سے گزرا۔ یہ ایک غریب الحال اور عیالدار شخص تھا۔ گھر میں جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ اس قدر رقم پاس نہ تھی کہ رُخصتی کے فرائض سے سُبکدوش ہو سکتا۔ اس پر شیخ کی نظر جا پڑی۔ پاس بُلا کر لکڑیوں کے پشتارے پر ہاتھ پھیرا، وہ لکڑیاں سونا بن گئیں۔ فرمایا:

"مجھے تمہاری خاطر یہاں بٹھایا گیا تھا، تاکہ تمہارا کام انجام دوں"

یہ کہہ کر حضور وہاں سے چل پڑے[1]۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند

حضرت شیخ اپنے زمانہ کے شیخ الاسلام تھے۔ اس منصب کے سلسلے میں حضرت نے کئی بار دہلی کا سفر کیا ہو گا، مگر کسی تذکرہ میں دہلی کی مصروفیات کا مفصّل حال درج نہیں۔ چند ایک واقعات جو مل سکے

---

[1] خلاصۃ العارفین، ص ۳۴، ۳۵، مطبوعہ نولکشور پریس لاہور۔

ہیں، ہدیۂ ناظرینِ کرام ہیں۔

شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر فرماتے ہیں کہ سلطان شمس الدین التمش کے دربار میں ایک مرتبہ چند علماء اور مشائخ جمع تھے۔ انہوں نے متفقہ طور پر شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ سے سوال کیا کہ آدمی کی نظر کیمیا کیسے ہو سکتی ہے؟

شیخ الاسلام نے اپنے تھیلے سے سونے کا ٹکڑا نکال کر میرے حوالے کیا اور فرمایا بازار سے ایک مجہول مطلق کافر غلام خرید لایئے۔ چنانچہ میں بازار گیا اور مجھے جو شکل و صورت میں مکروہ اور عقل کا غبی نظر آیا، خرید کر آپ کی خدمت میں لے آیا۔

حضرت شیخ الاسلام نے اُسے اپنے سامنے بٹھا کر کلمۂ توحید پیش کیا۔ غلام نے کلمہ پڑھا اور مُسلمان ہو گیا۔

شیخ نے اس کی پشت پر تھپکی لگائی اور فرمایا:

"حضرات علماء تجھ سے جس علم کی بابت سوال کریں، جواب دے اور تُو بھی اُن پر سوال کر کہ تجھے میں نے اپنی طرف سے مناظر مقرر کیا ہے۔"

وہ غلام سیدھا ہو بیٹھا۔ علماء نے اس پر سوالات کرنے شروع کئے۔ وہ ہر سوال کا شافی جواب دینے لگا۔ یہاں تک کہ علماء اور مشائخ از خود چُپ ہو گئے۔ اس کے بعد اس غلام نے علماء پر ایک سوال کیا۔ وہ جواب نہ دے سکے۔ انجام کار اُنہوں نے اس کو کہا کہ آپ ہی اس سوال کا جواب ارشاد کریں۔ وہ نے بحیثیت اُستاد کے ان سب کو اس کا جواب ذہن نشین کرایا۔

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ نے فرمایا کہ آدمی کی نظر اس طرح کیمیا کا اثر دکھاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ غلام اس طرح کئی سالوں تک دہلی میں درس دیتا رہا۔ بڑے بڑے علماء اس کے آگے آکر گھٹنے ٹیکتے تھے۔ کسی کو اس کے سوالوں کے جوابات دینے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔

شیخ الاسلامؒ اور قطب الدین بختیار کاکیؒ محفل سماع میں

محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلامؒ نے حضرت

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی وقت مجلسِ سماع ترتیب دی گئی۔ دونوں بزرگوار وجد میں آئے۔ کہتے ہیں کہ آٹھ پہر تک رقص میں معروف رہے۔ کسی کو اپنے تن بدن کا ہوش تک نہ تھا۔ یہی ایک مصرعہ وردِ زبان تھا ع

حاجی بسوئے کعبہ رود من بسوئے دوست

حضرت محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ یہ ان اولیاء اللہ کی آخری ملاقات تھی۔ پھر ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

تیری نماز بے حضور محبوب الٰہی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلامؒ نے سفر کے دوران میں ایک امام کے پیچھے نماز ادا کی اور سلام کے بعد امام کو ایک گوشہ میں لے جاکر فرمایا ا

"امام صاحب یہ کیسی نماز ہے کہ کچھ عرصہ آپ ہرن کے پیچھے بھاگتے رہے، کچھ دیر آپ نے کھیتوں کی دیکھ بھال کی۔ کچھ عرصہ آپ مہمان کے پاس رہے۔ کچھ وقت گھر میں گذارا۔ یہ موحدوںؒ کی نماز نہیں، بلکہ بچوں کا کھیل ہے۔ اس کے بعد حضرت نے یہ اشعار پڑھے ؎

تن درونِ نماز و دل بیروں　　کشتہا مے کنی زنا دانی

ایں چنیں حالت پریشاں را　　شرم ناید نماز مے خوانی

شیخ الاسلامؒ کے تموّل پر شیخ حمید الدین کا طنز یہ بھی دہلی ہی کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ جبکہ شیخ الاسلامؒ فقرا کے جگھٹے میں بیٹھے تھے۔ شیخ حمید الدین نے سوال کیا: حضرت کیا وجہ ہے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، وہاں

لہ اہلِ طریقت کے نزدیک جب تک توجہ کامل نہ ہو، نماز نہیں ہوتی۔ "لاصلوٰۃ ثم الا بحضور القلب" شاید علامہ محمد اقبالؒ نے اسی خیال کے پیشِ نظر فرمایا ہے ؎

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور　　ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

لہ سیر العارفین قلمی، ج ۱ ص ۲۶

سانپ بھی ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے "گنج با مار باشد و گل با خار" حالانکہ سانپ اور دولت میں نہ صوری نسبت ہے نہ معنوی۔

فرمایا:

"بے شک سانپ اور مال میں صوری نسبت نہیں ہے، لیکن معنوی نسبت ضرور ہے۔ کیونکہ سانپ زہر کے باعث مہلک ہے اور مال بھی آدمیوں کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔"

شیخ حمیدالدین نے اُچھل کر فرمایا:

"یعنی مال بھی سانپ کا حکم رکھتا ہے اور جس شخص نے مال و دولت جمع کر رکھی ہے، گویا اس نے سانپ پال رکھا ہے۔"

شیخ حمیدالدین کا یہ طنز حضرت شیخ الاسلامؒ پر تھا۔ کیونکہ آپ اسلامی دُنیا کے بہت بڑے امیر بھی تھے۔ وہ درویش جو خشک زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ حضرت کے تموّل کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آپ سمجھ رہے تھے کہ اس گفتگو سے متکلم کا منشاء کیا ہے۔ اس لیے فرمایا:

"مال اگرچہ مار است، امّا کسے کہ افسونِ مار دانستہ باشد، مار او را زیاں نمے کند۔"

یعنی جس شخص کو سانپ کا افسوں آتا ہو، اُسے اس سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

شیخ حمیدالدین نے برجستہ جواب دیا:

"آخر ایسے پلید اور زہردار کیڑے کے پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ آدمی جھاڑ پھونک کا محتاج ہوتا پھرے۔"

چونکہ حضرت شیخ کے مرشدِ طریقت بھی اپنے عہد کے امیرِ کبیر تھے، اس لیے یہ جملہ اُن کی ذات پر بھی اثرانداز ہوتا تھا۔ بنا بریں حضرت نے فوراً مراقبہ کیا۔ حضرت شیخ الشیوخ کی رُوحِ پُرفتوح نے فرمایا:

"اے بہاء الدین! حمیدالدین سے کہہ دیجیے کہ آپ کی درویشی اس قدر حُسن و جمال نہیں رکھتی کہ اُسے نظرِ بد کا احتمال ہو، لیکن ہماری درویشی کو وہ جمال و کمال حاصل ہے کہ اگر اس کے چہرے پر سیاہی کا تِلک نہ لگائیں تو نظر لگ جانا لازمی ہے۔"

کسے جمال خویش بدیگرے نمے دہد

حضرت شیخ الاسلامؒ اجودھن (پاک پٹن) کتنی بار آئے گئے ہوں گے اور خدا معلوم شیخ العالم گنج شکرؒ اور حضرت شیخؒ کے درمیان کتنی پُر لطف صحبتیں ہوئی ہوں گی۔ لیکن چونکہ قران السعدین کی حالت میں دوسروں کو شریکِ محفل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے سیرت کی کتابیں ان صحبتوں کی تفصیلات پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء نے مولانا جمال الدین ہانسویؒ کے ابتلاء کا دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ ہم اسے علی حالہٖ یہاں درج کرتے ہیں۔

مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ شیخ جمال الدین ہانسوی، گنج شکر کے خلیفۂ اعظم تھے اور حضرت انہیں تمام خلفاء سے زیادہ عزیز جانتے تھے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریاؒ جب اجودھن تشریف لے جاتے تو شیخ جمال ہانسوی ہی آپ کے آرام و آسائش کا انتظام کرتے۔ شیخ الاسلامؒ کو مولانا جمال کی ارادتمندانہ خدمت گزاری اور شرافت نفسی بڑی پسند تھی۔ ایک دفعہ گنج شکرؒ سے فرمایا :

”فرید بھائی ! جمال ہانسوی مجھے دے دیجئے، اسے میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں“

حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا :

”جمال الدین جمال ماست وکسے جمال خویش بدیگرے نمی دہد“

جب شیخ الاسلامؒ، حضرت گنج شکرؒ کی طرف سے ناامید ہوئے تو آپ نے جمال الدین پر جذب باطن کی کمند ڈالی۔ جس پر وہ بے اختیار آپ کی طرف کھنچے چلے آئے۔ اور حضرت گنج شکرؒ سے شیخ الاسلام ذکریاؒ کے ساتھ ملتان جانے کی اجازت چاہی۔ ایک دو مرتبہ تو حضرت نے ٹال دیا۔ لیکن جب اس نے مکرر سہ مکرر اصرار کیا تو جبینِ اقدس پر شکن آگئی۔ برہم ہو کر فرمایا :

”جامنہ کالا کر“

فی الفور تمام نعمت سلب ہوگئی اور اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ حضرت گنج شکر علیہ الرحمۃ نے انہیں خانقاہ سے نکال دیا اور فرمایا کہ اگر کسی نے اس کی سفارش کی، تو اُس کا بھی یہی حشر ہو گا۔

شیخ الاسلامؒ تو کبھی کے ملتان جا چکے تھے۔ بچارا جمال ڈوبیا ہی اور تباہ دِلی کے ساتھ خانقاہ سے نکلا۔ اس حالت میں کہ تن بدن کا اُسے ہوش تک نہ تھا۔ مجنوں وار ننگے سر اور ننگے پاؤں بیابان میں پھرتا تھا۔ ایک سال اسی لیل و نہار میں گزر گیا۔ جب شیخ الاسلامؒ کو کشف کے ذریعے اس صورتِ حال کا علم ہوا تو آپ کو جمال پر بڑا ترس آیا کہ ناحق میری وجہ سے اُسے یہ دن دیکھنا پڑا۔ عالم نامی ایک سوداگر اجودھن کو جا رہا تھا۔ آپ نے اُسے بلا کر فرمایا کہ صحرا میں تجھے ایک خراب حال درویش ملے گا۔ جب اجودھن میں برادرم فریدالدین کے ہاں پہنچو، تو اس کا ذکر ضرور کرنا۔ چنانچہ عالم اجودھن کو روانہ ہوا۔ راستے میں ایک بے آب و گیاہ صحرا کے اندر ایک تباہ حال انسان نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھا تو حیرت سے اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہ شیخ جمال الدین تھا۔ حضرت فریدالدین مسعودؒ کا محبوب مرید، عالم نے کئی بار اُس کے عروج و اقبال کے دن دیکھے تھے۔ بچارے کا حسن و جمال خاک میں مل چکا تھا۔ آنکھوں سے خون کے دھارے بہہ رہے تھے۔ سوداگر کو اس کی حالتِ زار پر بڑا رحم آیا اور وعدہ کیا کہ اجودھن پہنچ کر حضرت گنج شکر علیہ الرحمۃ کی خدمت میں تیری سفارش کروں گا۔

جب عالم اجودھن پہنچا، حضرت اس وقت وضو کر رہے تھے۔ اُسے بڑی توجہ سے ملے اور سفر کا حال دریافت کیا کہ کہاں کہاں گیا؟ کہاں کہاں رہا؟ اور اب کس شہر سے آ رہا ہے؟

وہ سب حال عرض کرتا رہا اور بولا:

"حضور! جب ملتان کے صحرا میں داخل ہوا، وہاں میں نے ایک شخص کو ننگے سر اور ننگے پاؤں دیکھا، چہرہ اُس کا سیاہ ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ جب میں اُس کے قریب گیا اور پہچانا تو وہ حضرت جمال الدین ہانسویؒ تھے۔ میں حیران رہ گیا کہ حضرت کے منظورِ نظر اور جلیل القدر خلیفہ کی یہ حالت؟"

حضرت نے سوداگر کی زبان سے یہ واقعہ سن کر حاضرین سے فرمایا کہ شیخ جمالؒ نے بڑی

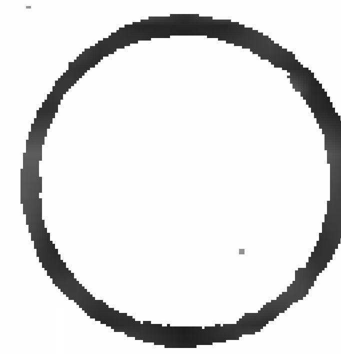
مصیبت برداشت کی ہے۔ برادرم بہاء الدین کی رعایت مطلوب ہے۔ اس لیے اُسے بُلا لو۔ سوداگر کی طرف دیکھ کر مُسکرائے اور فرمایا۔ عالم! تو نے ملتان کا واقعہ بیان نہیں کیا، تو خود گیا تھا یا برادرم بہاء الدین نے تجھے طلب کیا تھا؟

سوداگر کی آنکھوں سے بے اختیار عقیدت کے آنسو ٹپک پڑے۔ گلوگیر ہو کر بولا: سبحان اللہ! سب کچھ جانتے ہوئے کیسے بھولے بن رہے ہیں آپ۔ حضور یہ آپ کے راز و نیاز کی باتیں ہیں۔ ہم کیا جانیں؟ شیخ الاسلام زکریا کی خاطر ہی سہی، جمال پر ضرور رحم فرمائیے۔ حضرتؒ نے خادم کو حکم دیا یہ رباعی لکھ کر جمال کو بھجوا دو ؎

رو گرد جہاں بگرد و پا آبلہ کُن   گر ہیچ مئی یا بی، مارا ایلہ کُن
یک صبح باخلاص بیا بر در ما   گر کار تو بر نیاید آنگہ گلہ کُن

شیخ جمال کا ایک دوست حضرت کا یہ پروانہ لے کر فوراً روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن صُبح سویرے جمال حضرت کے قدموں میں پڑا اِسسک رہا تھا۔

حضرت نے بڑی مہربانی سے جمال کو گلے سے لگایا اور ایک نظر میں جمال سے قطب الاقطاب شیخ جمال الدین ہانسوی بنا دیا۔



وارداتِ عشق

عشق تصوف کی جان ہے۔ کوئی سالک اس وادی کو طے کئے بغیر منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔ یہ مضمون نہایت ادق اور لطیف ہے اور اسے وہی اچھی طرح بیان کر سکتا ہے جو "راہ و رسم منزلہا" سے پوری طرح واقف ہو۔ میر سلیمان مصری قدس سرہٗ ایک شیخ کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ مکان کی چھت سے گر پڑے۔ احباب اُن کی عیادت کو حاضر ہوئے، خادم نے اطلاع کی۔ فرمایا:

"انہیں کہو کہ تم میں سے جو شخص چھت سے گر چکا ہو، وہ آئے۔ ورنہ چھت سے گرے ہوئے کو تم کیا جانو اور کیا ہمدردی کرو گے؟"

~ باتو غمِ خود چساں بگویم   افتادۂ نہ ز بام ہرگز[1]

یعنی میں تم سے اپنے دُکھ درد کی حالت کیا بیان کروں کہ تم چھت سے گرے ہوئے نہیں ہو۔ یہی صورتِ حال اب اس نیازمند کے درپیش ہے کہ بحرِ عشق تو بڑی چیز ہے۔ اس کے ساحل تک کا شناسا نہیں اور نہ ہی کوئی اہلِ درد نظر آتا ہے کہ جس کے آگے یہ قصہ لے بیٹھوں ~

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب ڈھونڈ اُنہیں چراغِ رُخِ زیبا لے کر

"حاؤ"! "ھو" کی وہ مجلسیں جن کے دم قدم سے عشق کی دُنیا آباد تھی۔ کبھی کی مٹ چکیں۔ وہ قدسی نفوس جن کے پہلو میں دل سیماب وار بے قرار رہتا تھا، دُنیا سے اُٹھ گئے۔ ان کے ملفوظ، روزنامچے اور تذکرے جن میں عشقِ الٰہی کے اسرار و رموز بھرے پڑے تھے، وہ

---

[1] حسنات العارفین از شہزادہ محمد دارا شکوہ، ص ۲۳

بھی فرسودہ قرار دے کر ختم کر دیئے گئے ؎

تا سحر تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

حسن پرستی کی جگہ نفس پرستی نے لے لی اور عشق بدنام ہو کر رہ گیا۔ غالب مرحوم ایک صدی پیشتر کہا تھا ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

ممکن ہے اُن کے زمانے میں "اہلِ نظر" موجود ہوں، مگر اب تو کوئی "صاحبِ نظر" ملتا ہی نہیں، ہر طرف بوالہوسی کا ہی دَور دَورہ ہے صرف پروانہ وارفتگانِ عشق کی یادگار باقی رہ گیا ہے، جو برسات کے دنوں میں بجلی کے قمقموں کے گرد منڈلا منڈلا کر اور اپنی جان کی قربانی دے کر بنی نوع انسان کو ایک بھولا بسرا سبق یاد دلاتا ہے۔ بقول حکیم شیرازی

؎ اے مرغِ سحر عشق ز پروانہ بیاموز کاں سوختہ را جاں شُد و آواز نیامد

کیا کہوں اور کس سے کہوں، نہ مَیں اس راز سے آگاہ اور نہ تجھے اُس کا مذاق ؎

نہ سلیقہ مجھ میں کلیمؑ کا نہ قرینہ تجھ میں خلیلؑ کا
مَیں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آزری

لیکن چونکہ ایک بہت بڑے عارف کے "وارداتِ عشق" کو سپردِ قلم کرنا ہے، اس لیے سالکینِ طریقت نے عشق کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

صوفیائے کرام نے عشق کو آگ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ ایک عارف کا قول ہے :

اَلْعِشْقُ نَارٌ یُحْرِقُ مَاسِوَی اللّٰہ

("عشق آگ ہے جو خدا کے ماسوا سب کو جلا دیتی ہے")

حضرت قطب العالم خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ایک واصلِ حق مناجات میں کہا کرتا تھا :

"اے پروردگار! اگر تو قیامت کے دن مجھے جلائے گا یا دوزخ میں بھیجے گا تو

مجھے تیرے جلال اور عزت کی قسم! کہ دوزخ کے دروازے پر سینے سے ایک ایسی آہ نکالوں گا۔ جس سے دوزخ کی ساری آگ نیست و نابود ہو جائے گی"۔

اس شخص سے پُوچھا گیا کہ میاں تو کیا کہہ رہا ہے؟ کیا کہیں دوزخ کی آگ بھی تباہ ہو سکتی ہے؟ فرمایا!

"ہاں! کیوں نہیں۔ اگر آتش محبت کے مقابلے میں دوزخ کی سی لاکھوں آگیں جلائی جائیں تو اُنہیں نابود کرنے کے لیے عاشق کے سینے کی ایک آہ کافی ہے اس لیے کہ محبت کی آگ سے اور کوئی آگ تیز نہیں ہے"۔

حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا:

"اے درویش! عاشق کے سینے میں اس قسم کی آگ رکھی گئی ہے کہ اگر اس کا ایک شُعلہ باہر نکل پڑے تو عرش سے تحت الثریٰ تک سب کو جلا کر رکھ دے"۔

شیخ سعدیؒ نے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ وہ ایک رات کو اپنی مناجات میں ورد کر عرض کر رہے تھے ؎

چہ بودے کہ دوزخ زمن پُر شُدے　　مگر دیگراں را رہائی شُدے

"اے پروردگار! کیا ہی اچھا ہوتا کہ تُو دوزخ کو مجھُ سے بھر دیتا، مگر دُوسروں کو چھوڑ دیتا"۔

اگرچہ شیخ الشیوخ نے بنی نوع کی خیر خواہی کے لیے یہ آرزو ظاہر کی تھی، لیکن اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مشائخ آتشِ دوزخ کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ حریق المحبت، برہان العاشقین، حضرت خواجہ غلام فرید رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے منظوم کلام میں ہر جگہ عشق کو آگ سے نسبت دی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں ؎

عشق نہیں ہے نار غضب دی　　تن من کیتس کولے!

"یعنی عشق کیا ہے، غضب کی آگ ہے جس نے تن من جلا کر کوئلہ بنا دیا ہے"۔

حضرت محبوب الٰہی دہلویؒ بالعموم یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ　　سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

داستانِ عشق

عشقِ الٰہی فنی بھی ہے اور وہبی بھی۔ بعض پیدائشی عاشق ہوتے ہیں اور بعض تزکیۂ نفس تصفیہ قلب اور جلائے رُوح کی منزلوں کو طے کرنے کے بعد اس وادی میں قدم رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم یہاں ابتدائی مراحل کا مختصراً ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔

تزکیۂ نفس اور اُس کی معرفت

سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں: اَعْدیٰ عَدُوِّ لَکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ "تو اُس نفس کو اپنا دُشمن جان جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان میں ہے"

اربابِ طریقت کی اصطلاح میں نفس سے مراد وہ لطیف جاری ہے جو دِل سے پیدا ہوتی ہے اور جسے حکماء رُوح حیوانی کہتے ہیں۔ اس سے بُری صفات پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے اللہ کریم نے فرمایا ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ (یوسف:۵۳) بیشک نفس بُری باتوں کا حُکم دیتا ہے"۔

یہ انسان کے ہر ایک عضو کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جیسا کہ اخروٹ اور تِل کے ہر ایک جزو میں روغنِ زرد موجود ہوتا ہے۔

"بقا" کی دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جو ہمیشہ باقی تھے اور باقی رہے گی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بقاء ہے۔ دوسری وہ جو پہلے نہ تھی پھر ظاہر ہوئی اور ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ ارواح ملائکہ اور عالمِ آخرت کی بقاء ہے۔ نفس انسانی کو دونوں اقسام کی بقاء کی چاشنی حاصل ہے۔ بقائے الٰہی کی چاشنی کا اثر اسے آدم کی مٹی کو خمیر کرتے وقت حاصل ہوا۔ کیونکہ بِیَدِیَّ کے اختصاص سے مشرف ہوتے وقت خمیر کی مٹی اور پانی کو قبولیت بقاء کی وہ استعداد نصیب ہوئی تھی جو کسی دوسری مٹی، پانی اور نفوس کو میسّر نہیں ہوئی۔ بقائے ارواح کی چاشنی کا اثر اُسے قالب اور روح کے ملنے کے وقت حاصل ہوا۔ ان کے اتصال سے نفس اور دل پیدا ہوئے۔ دل روحانی اور علوی تمام صفات کا حامل

ہے اور نفس میں خاکی اور سفلی تمام صفاتِ رذیلہ موجود ہیں۔ لیکن چونکہ رُوح اور قالب کا جڑا ہُوا ہے۔ اس لیے اس میں بعض نیک صفات جو روحانیت سے متعلق ہیں اور بقاء جو کہ رُوح کی صفت ہے، موجود ہے۔ اس لحاظ سے نفسِ انسانی کو نفسِ حیوانی پر تفوق حاصل ہے۔

تصفیہ قلب

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

اِنَّ فِیْ جَسَدِ ابْنِ آدَمَ لَمُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ بِھَا سَائِرُ الْجَسَدِ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ بِھَا سَائِرُ الْجَسَدِ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ۔

"ابنِ آدم کے وجود میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب اُس کی حالت بہتر ہوتی ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور وہ دل ہے۔"

اب یہ سمجھنا چاہیئے کہ دل کیا ہے اور تصفیہ دل کس بات میں ہے۔ اس کی ترتیب کیونکر ہو سکتی ہے اور دل کس طرح اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔

دل صنوبری شکل کا گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو سینے کے نیچے بائیں پہلو پر واقع ہے۔ اور اس ٹکڑے میں روحانی جان ہے، جس کا نتیجہ عقل ہے اور یہ دل عام حیوانات میں نہیں ہوتا، بلکہ خاص انسان ہی کا حصّہ ہے۔ دل کو سنورنے اور بگڑنے کی صلاحیت حاصل ہے۔ اس کا سنورنا اس کی صفائی میں ہے اور اس کا بگڑنا اس کی کدورت میں ہے۔ دل کی صفائی حواس کی سلامتی پر منحصر ہے کہ تمام عالم شہود اُنہیں پانچ حواس کے ذریعے ادراک کرتا ہے۔ اس طرح دل میں پانچ حسّیں ہیں کہ جب وہ سلامت ہوتی ہیں تو اُن سے عالمِ غیب یعنے ملکوتیات اور روحانیات کا ادراک کر سکتا ہے۔ چنانچہ دل کی آنکھیں ہیں، جن سے مشاہداتِ غیبی کو دیکھتا ہے۔ کان ہیں جن سے اہلِ غیب اور حق کلام کو سُنتا ہے۔ سُونگھنے کی طاقت ہے جن سے غیبی خوشبوؤں کو سُونگھتا ہے۔ تالُو ہے جس سے ایمان کی حلاوت، محبّت کے ذوق اور عرفان کے طعام کو چکھتا ہے۔ دل میں عقل ہے جس سے کل معقولات سے نفع اُٹھاتا ہے۔ جس شخص میں یہ دلی حواس سلامت ہوں اس کو دلی اصلاح کی وجہ سے بدنی نجات حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں آتا ہے:

اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعرآء: ۸۹) اور جن کے دلی حواس میں خلل واقع ہُوا وہ گویا دوزخ کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ (الاعراف: ۱۷۹)

"ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے ایسے بنائے ہیں جن کے دل تو ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ آنکھیں تو ہیں لیکن دیکھتے نہیں اور کان تو ہیں، لیکن سُنتے نہیں۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (البقرۃ: ۱۷۱) گونگے، بہرے اور اندھے ہیں ۔۔۔ وہ نہیں سوچتے سمجھتے۔"

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ۔ (الحج: ۴۶)

"وہ ظاہری آنکھوں سے اندھے نہیں بلکہ سینوں کے اندر اُن کے دل اندھے ہیں۔"

دل کے معالجے کے بارے میں تمام حاذق حکیم مختلف الرائے ہیں۔ ہر ایک نے ایک خاص طرز سے علاج شروع کیا ہے۔ لیکن قانونِ الٰہی کے باہر کسی نے قدم نہیں رکھا۔ بعضوں نے اخلاق کو تبدیل کرنے اور سنوارنے کی کوشش کی ہے۔ ہر بڑی صفت کا علاج اس کی ضد سے کیا ہے۔ بفحوائے اَلْعِلَاجُ بِاَضْدَادِهَا علاج ان کے اضداد سے کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ طبیب گرمی کو سرد شربتوں سے دُور کرتے ہیں اور سردی کا علاج گرم معجونوں سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے مشائخ کرام پہلے تصفیہ قلب کی کوشش کرتے ہیں نہ کہ تبدیلی اخلاق کی۔ کیونکہ جب دل کا تصفیہ حاصل ہو جائے تو وہ فیض حق کے قابل ہو جاتا ہے اور پھر فیض حق کے اثر سے تھوڑی مُدت میں نفسیاتی صفات خود بخود اصلاح پذیر ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ عمر بھر کی ریاضتوں اور مجاہدوں سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔

خضرِ راہ

راہِ دین کو طے کرنے اور عالمِ یقین میں پہنچنے کے لیے صاحب ولایت اور صاحب تصرف مُرشد کی اشد ضرورت ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

اَلشَّیْخُ فِیْ قَوْمِهٖ كَالنَّبِیِّ فِیْ اُمَّتِهٖ۔ تبلیغ و ہدایت کی رُو سے شیخ کا مرتبہ اپنی قوم میں وہی ہے

جو نبی کا اپنی اُمت میں ہوتا ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے :

اَولیاَئِی تَحتَ قبَائِی لَا یَعرِفُہُم غَیرِی۔

"میرے ولی میری قباء کے نیچے ہیں، جنہیں میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مرتبہ نبوت، درجہ رسالت اور العزمی کی تکمیل کے لیے پہلے دس سال حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت کرنا پڑی۔ پھر کہیں مکالمۂ حق کا درجہ حاصل ہُوا۔ کلیم اللہ ہونے کی دولت اور وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (الاعراف: ۱۴۵) (ہم نے اس کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور ہر شئے کی تفصیل الواح میں لکھ دی) کی سعادت کے باوجود علم لدنی کی ابجد سیکھنے کے لیے اُنہیں معلّم خضر علیہ السلام سے درخواست کرنا پڑی۔ اس راستے کا نادان مسافر وہ شخص ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ وصال ذوالجلال کے بے کنارہ جنگل کو بغیر کسی راہنما کے طے کرلے گا۔ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ۔ اس راستے کے خطرات کو وہی خوب جانتے ہیں جنہوں نے شیخ کامل کی راہنمائی میں اس راہ کو طے کیا ہے اور اگر کوئی صاحب ہمت سالک اپنے قدم کی قوت سے اس راہ کو طے کرنا چاہے تو سالہا سال کے عرصے میں وہ ایک مقام کو بھی طے نہ کرسکے گا۔ کیونکہ مبتدی کی سیر کمزور چیونٹی کی رفتار سے بھی کم ہوتی ہے۔ نیز اس راہ میں ایسے مقام بھی آتے ہیں، جنہیں اُڑ کر عبور کیا جاتا ہے اور سالک کی ابتدائی صورت تو انڈے کی طرح ہوتی ہے۔ جب تک اُس کے پَر نہ نکلیں، وہ کیسے اُڑ سکتا ہے ؟

شیخ ابوبکر جامی رحمۃ اللہ علیہ خوارزم کے ایک مجذوب تھے۔ اُن کا کوئی شیخ نہیں تھا۔ لیکن جذباتِ حق کے تصرفات سے عالی مقامات اسے حاصل تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے شیخ نجم الدین کبریٰؒ کو بتایا کہ مَیں پینتالیس سال سلوک طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچا ہوں۔ اور اس مقام پر مَیں نے دو سال ظاہری اور باطنی سخت محنت کی اور خونِ جگر کھایا۔ تب کہیں اللہ تعالےٰ نے مجھے اس مقام کو عبور کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

جب حضرت مجدد الدین بغدادیؒ کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو فرمایا :

"کوئی شخص مُرشد کی قدر نہیں جان سکتا اور نہ اُس کا حق ادا کر سکتا ہے۔ ہمارے

مریدوں میں سے بعض ایسے ہیں، جنھوں نے دو سال کے اندر اس راہ کے سلوک کا سفر طریقت کے آغاز سے حقیقت کی انتہا تک طے کیا ہے اور جب اس مقام پر پہنچے ہیں تو ایک یا دو روز میں ہم نے انہیں اس مقام سے عبور کرا دیا، جس مقام پر شیخ ابوبکر پینتالیس سال کے مجاہدہ کے بعد پہنچا اور دو سال کی سخت ریاضت کر کے آگے بڑھا۔"

الغرض جب مرید صادق شیخ کا جمال آئینۂ دل میں مشاہدہ کرتا ہے تو فوراً اس کے جمال پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس کا آرام و قرار جاتا رہتا ہے۔ شیخ نجم الدین کبریٰ لکھتے ہیں کہ تمام سعادتوں کی جائے پیدائش یہی بے قراری اور عاشقی ہے اور جب تک مرید، شیخ کی ولایت کے جمال پر عاشق نہ ہو جائے، وہ اپنے اختیار اور ارادت کے تصرف سے باہر نہیں نکل سکتا اور ارادت شیخ کے تصرف کو قبول نہیں کر سکتا۔

جب مرید تصرفِ شیخ کی قبولیت کی شائستگی حاصل کر لیتا ہے تو شیخ اسے انڈے کی طرح اپنی ولایت کے پر و بال کے تصرف میں لے لیتا ہے۔ اس وقت مرید واقعی انڈے کی طرح ہوتا ہے جو اپنی بشریت اور انسانیت کی بھنگی میں بند ہوتا ہے۔ شیخ اس پر اپنی اعلیٰ ہمت صرف کرتا ہے اور اس کے حال پر توجہ رکھتا ہے۔ انجام کار اس کی ہمت کیمیا اثر کا تصرف مرید کے بیضہ صفت وجود کو بدل کر "عبدیت خاص" کے وجود میں لے آتا ہے۔ جیسے چوزہ انڈے کو توڑ کر دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ اسی طرح سالک کو ہمتِ شیخ کا تصرف "ملکوت" کے دریچہ سے ہوائے ہویت کے میدان میں لے آتا ہے۔

اب تک اگر وہ دنیاوی انسانیت کا بیضہ تھا تو اب حق تعالےٰ کی "عبدیتِ خاص" کا مرغ بن گیا۔ لیکن ابھی اس کے کئی ایک مقامات ہوتے ہیں۔ توحید ایمانی۔ توحید ایقانی۔ توحید احسانی۔ توحید عیانی اور توحید غیبی۔ جب تک ان سب مراحل کو طے نہ کر لے تب تک وحدت کی حقیقت کو نہیں پہنچ سکتا۔ جو بحرِ احدیت کا ساحل ہے۔ ان مقامات کی شرح بہت طویل ہے۔ لیکن یہ سب اخلاق کی تبدیلی سے طے نہیں ہوتے مگر تصفیہ قلب اور توجہ بحق سے، جب مرید ظاہری تجرید اور باطنی تفرید سے عہدہ برآ ہوتا ہے اسی قدر

تصفیۂ قلب میں خلوت کی مداومت اور ذکر کی کثرت اس کا معمول بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلسل تخلیہ سے اس کے ظاہری حواس بے کار ہو جاتے ہیں۔ جس سے محسوسات کی آفتوں کا خطرہ نہیں رہتا۔ کیونکہ دلی حجاب اور کدورتیں زیادہ تر محسوسات میں حواس کے تصرف سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اب صرف شیطانی وسوسے اور خواہشات باقی رہ جاتی ہیں، جن سے دل مکدر اور مشوش ہوتا ہے۔ ان کی راہ خطرات کی نفی اور ذکر کے ہمیشہ کرنے سے رُک سکتی ہے۔

ذکر کے آداب صوفیائے کرام نے ذکر کے لیے چند شرائط اور آداب[1] مقرر کئے ہیں، جن کا بجالانا بے حد ضروری ہے۔ تاکہ ذکر مفید پڑے۔

اوّل: مرید اپنی ارادت میں صادق ہو۔

دوم: اُسے طلب کی درد اور راہِ سلوک طے کرنے کی خواہش ہو۔

سوم: خلقت سے دُور رہے اور ذکر سے اُلفت کرے تاکہ سب سے منہ پھیر کر ذکر کی پناہ میں آ سکے۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ۔ (تو اللہ کہو! اور اُنہیں اپنی دھن میں لگا رہنے دے۔) (الانعام: ۹۲)

چہارم: چونکہ ذکر کرنا چاہتا ہے اس لیے اس کی بنا تمام گناہوں سے توبہ نصوح پر قائم کرے۔

آداب حسبِ ذیل ہیں

۱۔ ذکر کرنے سے پہلے وضو کرے۔ اَلْوُضُوْءُ سَلَاحُ الْمُؤْمِنِ (وضو مومن کا ایک اوزار ہے)

۲۔ لباس سُنّت کے مطابق ہو۔

---

[1] حضرت شیخ الاسلامؒ نے شروط اربعین فی جلوس المعتکفین کے نام سے مریدوں کے نام وصایا تحریر فرمائے ہیں جس میں یہ تمام آداب و شرائط وضاحت سے درج ہیں۔ ہم اسے "تعلیمات" کے ضمن میں درج کر رہے ہیں۔ جو حضرات تفصیل میں جانا چاہیں اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

۳۔ مقامِ ذکر خالی، صاف، پاک، چھوٹا اور تاریک ہو۔ کیونکہ ایسے مکان میں دلجمعی اور یکسوئی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اگر خوشبودار چیزیں پاس رکھے یا جلائے تو اور بھی اچھا ہے۔

۴۔ قبلے کی طرف رُخ کرکے مربع بیٹھے۔ باقی حالتوں میں مربع بیٹھنا منع ہے۔ صرف ذکر کے وقت بیٹھنا چاہیئے۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد آفتاب نکلنے تک اپنے مقام میں مربع بیٹھا کرتے تھے۔

کیفیتِ ذکر ذکر کرتے وقت ہاتھ رانوں پر رکھے۔ دل کو حاضر کرکے آنکھیں بند کرے اور بڑے ادب سے اس طرح شروع کرے لاالٰہ الا اللہ۔ لاالٰہ ناف کے نیچے سے لائے اور الا اللہ کی ضرب دل پر لگائے۔ اس طرح کہ ذکر کا اثر اور اس کی قوت تمام اعضاء تک پہنچے۔ لیکن آواز بلند نہ کرے اور جہاں تک ہو سکے آواز کو روکنے اور پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ۔ (الاعراف: ۲۰۵)

"اپنے رب کو دل میں عاجزی سے پوشیدہ طور پر یاد کر اور آہستہ بات کر"، اس طریق سے سخت اور دم بدم ذکر کرے۔ دل میں ذکر کے معنوں کا خیال رکھے اور خطرات کو قریب نہ آنے دے۔ چنانچہ لاالٰہ کہتے وقت جو خطرہ دل میں آئے اس کی نفی کرے۔ خواہ وہ خطرہ نیک ہو یا بد اور یہ خیال کرے کہ میں نے کوئی چیز اور مقصود طلب نہیں کرنا اور نہ میرا کوئی محبوب ہے۔ "اِلَّا اللّٰہ" صرف خدا ہی میرا مطلوب محبوب اور مقصود ہے۔ "لاالٰہ" سے نفی کرے اور "الا اللہ" سے اللہ تعالےٰ کو اپنا مقصود، محبوب اور مطلوب سمجھے۔ مناسب ہے کہ ہر ایک ذکر کے شروع اور آخر میں نفی اثبات سے حاضر رہے اور ہر وقت دل کے اندر نگاہ رکھے۔ جس چیز کا خیال دل میں آئے اُسے دُور کرکے خالص اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ ولایت شیخ سے دُعا مانگے اور "لاالٰہ" کی نفی سے اس پیوند کو بھی کاٹ دے اور "اِلاَّ اللہ" کے تصرف سے حق تعالےٰ کی محبت کو شیخ کی محبت کا قائم مقام بنائے۔ اسی ترتیب کے موافق ہمیشہ کرے۔ یہاں تک کہ اس کا دل تمام دلبستگیوں سے فارغ اور خالی ہو جائے۔

کیونکہ ذکر کے وقت دل کا ہلنا ذکر کی مداومت پر منحصر ہے۔ دل اس وقت ہلتا ہے، جب ذکر کے غلبہ سے ذاکر کی ہستی ذکر کے نور میں گھل مل جاتی ہے اور ذکر ذاکر کو مفرد بنا دیتا ہے۔ وجودی تعلقات کا بوجھ اس کے کندھے سے اُتار کر جسمانی دُنیا سے روحانی آخرت میں ہلکا پھلکا بنا کر لاتا ہے۔

تجلیاتِ حق

جس وقت دل کا آئینہ طبیعت کے زنگار سے صاف ہو جاتا ہے تو جمالِ دوست کے آفتاب کی چمکنے کی جگہ اور ذاتِ حق کا جامِ جہاں نما بن جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کو قلبی صفائی حاصل ہو جائے، اُسے تجلّی کی سعادت بھی نصیب ہو۔ یہ فضلِ الٰہی ہے جسے چاہتا ہے عنایت کرتا ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ جو دِل صاف ہے وہ اس سعادت کے قابل ضرور ہو جاتا ہے۔ شیخ عبداللہ انصاری فرماتے ہیں کہ تجلّی حق اچانک آتی ہے۔ لیکن واقف دل پر آتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا میں جب دل کا آئینہ اوصافِ بشریت و زنگارِ طبیعت سے صاف ہو جاتا ہے تو بعض روحانی صفات دل پر تجلّی کرتی ہیں اور یہ تجلّیات انوار و روحانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ذکر کا نُور اور اطاعت کا نُور انوار روح پر غلبہ کرتا ہے جس سے روحانیت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے اور لہریں دل کے ساحل پر حملہ آور ہوتی ہیں جس سے آئینۂ دل کی صفائی میں تجلّی حق نمودار ہوتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رُوح تمام صفات سے تجلّی میں آتی ہے اور یہ حالت تمام بشری صفات کے مٹ جانے سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن تجلّی حق کی دو قسمیں ہیں۔

ایک تجلّی ربوبیّت ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر ہوئی: فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا۔ "پس جس وقت اُس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلّی کی تو اُسے پاش پاش کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔" (الاعراف: ۱۴۳)

تجلّی الوہیت حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلّم پر ہوئی، جس سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی ساری ہستی لٹ گئی اور وجودِ محمدی کے عوض ذاتِ الوہیت کے وجود کا ثبوت فرمایا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ، یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (الفتح: ۱۰) "بیشک جو لوگ

تیری بیعت کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی بیعت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر ہے"۔
اس سعادت کی کمالیّت کسی اور پیغمبر کو نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ اس کھلیان کے خوشہ چینوں کو اس خرمن سے یہ خوشہ عنایت فرمایا:

لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ لَهٗ سَمْعًا وَّبَصَرًا وَّ یَدًا وَّ لِسَانًا فَبِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَبْطِشُ وَبِیْ یَنْطِقُ - بندہ بذریعہ نوافل میرا قرب حاصل کرنے کی خواہش کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مَیں اس سے محبّت کرنے لگتا ہوں اور اس کے لیے کان آنکھ ہاتھ اور زبان ہو جاتا ہوں۔ پھر وہ مجھی سے سُنتا ہے۔ مجھی سے دیکھتا ہے۔ مجھی سے ٹٹولتا ہے اور مجھی سے بولتا ہے"۔
یہ سعادت ذاتِ الوہیت کی تجلّی کی خاصیّت سے ہے۔

الغرض جب سالک سری اور جہری اذکار سے اپنی طبیعت کو لفظ اللہ کے مفہوم کی طرف منتقل کرتا ہے، تو وہ رحمتِ کاملہ سے اس کے ذہن پر اس طرح مستولی ہو جاتا ہے کہ اس کی بصر بصیرت ہر وقت اس مفہوم کی طرف مرکوز رہتی ہے۔ اس کی تمام قوائے دراکہ آنکھ کی طرح اس مفہوم پر ٹکٹکی لگائے رہتی ہیں۔ سوائے اس کے اور کسی طرف متوجّہ نہیں ہوتیں۔ اس وقت تجلّی حق سبحانہٗ و تعالےٰ سالک کے سب سے لطیف جُز روح سے مل جاتی ہے اور اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور "روح" جو عالم قدس سے ہے اور قفسِ عنصری میں مقید ہو جانے کے سبب اپنی اصل کو بھول چکی ہوتی ہے۔ اس کے ادراک کے آئینہ پر زنگ کی تہیں جمی ہوتی ہیں۔ تجلّی کے نوا سے جب اس کے زنگ خوردہ ادراک کو جلا نصیب ہوتی ہے تو اُسے کمالاتِ حق کا عکس اپنے اندر دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس وقت اُسے اپنا بھُولا ہوا وطن یاد آ جاتا ہے اور وہ اپنے اصل کی طرف متوجّہ ہوتی ہے اور حظیرۃ القدس کی طرف صعود کرنے کا ارادہ کرتی ہے۔ لیکن غبار بشریت مانع ہوتا ہے۔
اس وقت نفس اور رُوح کے درمیان مزاحمت واقع ہوتی ہے جس سے اُس کی رُوح میں شورش اور گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور طالب پر وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ عقل و فکر برباد ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں سالک اکثر اوقات قانونِ شریعت اور ادب سے بھی باہر ہو جاتا ہے۔ مکانوں اور مجلسوں سے اس کو وحشت ہونے لگتی ہے۔ آنکھوں پھر

آہ و فغاں اور اشکباری سے واسطہ رہتا ہے۔ چہرے کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔ کسی سے ملنے کو جی نہیں چاہتا۔ اسی کیفیت کا نام عشق ہے۔ میرے حضرت[1] جو بحرِ عشق کے زبردست شناور تھے۔ اس الم انگیز کیفیت میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

ایک اور مقام پر سوزِ دروں کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے ؎

پیا عشق آساڈی آن سنگت گئی شدمد زیر زبر دی بھت
کل دسرے علم علوم اساں گل بھل گئے رسم رسوم اساں
ہے باقی درد دی رسوم اساں
بئی برہوندی یاد رہیوسے گت

حضرت ابوسعید ابوالخیر قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں ؎

رباعی

تا روئے ترا دیدم اے شمع طراز! نے کار کنم نہ روزہ دارم نہ نماز
چوں با تو بوم مجاز من جملہ نماز چوں بے تو بوم نماز من جملہ مجاز

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

رباعی

جسمم ہمہ اشک گشت و چشمم بگریست در عشق تو بے جسم ہمے باید زیست
از من اثرے نماند ایں عشق از کیست چوں من ہمہ معشوق شدم عاشق کیست

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اربابِ عشق اور مواجید قانونِ شرع کے پابند نہیں رہتے۔ مقصد یہ ہے کہ اس منزل میں طالبِ صادق مشاہدۂ جمال ذوالجلال میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ اوامر و نواہی کا احساس تک نہیں رہتا۔ بقول عارف ؎

---

[1] امام الاولیاء زبدۃ الاصفیا فنا فی التوحید حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ۔

مذہب عاشق ز مذہب ہا جدا است　　عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

حضرت شہیدِ ملت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا ارشاد ہے:

"عارف وہ شخص ہے کہ ہر لحظہ اس میں عالم اسرار سے ہزار ہا اسرار پیدا ہوں اور وہ "عالم سکر" میں رہے اور اگر اس حالت میں اٹھارہ ہزار عالم اس کے سینہ میں ڈالے جائیں تو بھی اُسے خبر نہ ہو۔"

چراغ دہلوی مفتاح العاشقین میں لکھتے ہیں:

"جب عارف عالم تحیّر میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت مدہوش اور قدرتِ حق کی آفرینش میں متحیّر رہتا ہے۔ اگر کھڑا ہے تو بھی دوست کی یاد میں۔ اگر بیٹھا ہے تو بھی اسی کی یاد میں۔ اگر لیٹا ہوا ہے تو بھی دوست کی قدرت و عظمت کا تماشا کر رہا ہے۔ اگر بیدار ہے تو بھی دوست کے حجاب و عظمت کے گرد ہے۔"

اس وقت آپ نے یہ رُباعی ادا فرمائی ؎

عاشق بہ ہوائے دوست مدہوش بود　　وز یادِ محبت خویش بے ہوش بود
فردا کہ ہمہ بحشر حیراں باشند　　نام تو درونِ سینہ در جوش بود

ایک اور عارف نے کہا ہے ؎

یکے بین و یکے دان و یکے گو　　یکے خواہ و یکے خوان و یکے جو

اگر سالک کو اپنے مطلب کے حصول کا گمان استماع مزامیر، عشق مجازی شغل برزخ اور ترک اذکار و عبادت میں ہو تو اس کی طبیعت کا میلان اسی طرف ہو جاتا ہے لال شہبازہ اور بوعلی قلندر اسی قبیل کے درویش تھے اور اگر بوجہ دینداری وہ اپنے تئیں زبردستی ان امور ممنوعہ سے روکے رکھے۔ تو یہ سالک کا کمال ہے۔ اس مرحلہ میں مُرشد کے ساتھ قلب کا تعلق شدّت پکڑ جاتا ہے۔ کیونکہ عشق کی پُر پیچ وادیوں میں صرف یہی ایک ذات خضرِ راہ کا کام دیتی ہے۔ چنانچہ کسی عاشق نے کہا ہے:

"اگر اللہ تعالےٰ میرے مُرشد کے سوا کسی دوسرے لباس اور شکل میں تجلّی فرمائے تو میں کبھی اُس کی طرف متوجّہ نہیں ہوں گا۔"

اور یہ بھی اسی عالم کی کیفیات کا خاصہ ہے کہ سالک کو علم اور طاعات ظاہری کی قطعی پرواہ نہیں رہتی۔ جیسے امام عاشقین حضرت فرید ثانیؒ نے کہا ہے ؎

جڈاں عشق فرید اُستاد تھیا ۔۔۔ سب علم عمل برباد تھیا

پر حضرت دل آباد تھیا ۔۔۔ سو وجد کنوں لکھ حال کنوں

یعنی جب سے ہم نے عشق کی شاگردی اختیار کی ہے، علم و عمل رخصت ہو چکا ہے۔ ہاں مگر حضرتِ دل وجد اور حال کی کیفیات سے خوب آباد ہے۔

ثمراتِ عشق جب لوہے کے ٹکڑے کو آہنگر بھٹی میں ڈالتا ہے، تو آگ لپک کر اُسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے اور اس کے اجزائے لطیفہ لوہے کے نفس و جوہر میں اثر کر کے اُسے ہم رنگ، ہم شکل و ہم صفات بنا لیتے ہیں۔ اس وقت لوہا آگ اور آگ لوہا بن جاتی ہے۔ کوئی اس ٹکڑے اور انگاروں میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جلانا اور بھوننا جو آگ کی خاصیت ہے اس لوہے کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اس وقت لوہے کی زبان ہوتی تو وہ ضرور پکار اٹھتا کہ میں وہی آگ ہوں کہ جس سے لوہاروں، زرگروں اور دیگر کاریگروں کے کاروبار انجام پاتے ہیں۔ یہی کیفیت سالک کی اُس وقت ہوتی ہے جب وہ دریائے وحدت میں غوطہ زن ہوتا ہے۔ بہ سبب حدّت اور شدت کیفیت عشقیہ اور کمال جذب روح الٰہی غبار شہادت سالک پر منکشف ہو جاتا ہے اور نور و ظلمت کے حجابات پھٹ جاتے ہیں۔ اس وقت حسبِ وعدہ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[2] (یعنی جو کوئی میری راہوں کو تلاش کرتا ہے۔ میں اس کو اپنی راہیں دکھا دیتا ہوں) مشاہدہ جمال بے مثال میسر آتا ہے اور بمضمون حدیث اَنَا عِندَ ظَنِّ عَبْدِی بِی وَاَنَا مَعَهُ اِذَا ذَکَرَنِی۔ میں اپنے بندہ کے گمان کے نزدیک ہوں اور میں اُسی کے ساتھ ہوتا ہوں، جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ اس قلق اور اضطراب کے عوض جو سالک نے فراق میں اٹھایا تھا، خلعتِ مکالمہ مرحمت ہوتی ہے۔ وحشت انس سے بدل جاتی ہے اور فنا، و بقا

---

[1] سوانح احمدی از مولانا محمد جعفر تھانیسری مرحوم۔ مطبوعہ بلالی سٹیم پریس ساڈھورہ۔ ص ۲۸

[2] العنکبوت : ۶۹

کے مقامات بے حجاب نظروں میں پھر جاتے ہیں ۔ اس وقت یہ مشتِ خاک بحرِ وحدت میں غوطہ زن ہو کر لوہے کے ٹکڑے کی طرح اپنی اصلیت کو بھول کر انا الحق (میں خدا ہوں) اور لَیْسَ فِی جُبَّتِیْ سِوَی اللّٰہ ۔ (اس جُبّہ میں سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں ہے) پکار اٹھتا ہے۔ شیخ الاسلام احمد جام قدس سرہٗ نے بھی اسی عالم میں کہا تھا ؎

ماتاج سرافرازِ ہمہ خلق خدائیم ۔۔۔ ما بادشاہِ مملکت ہر دو سرائیم
ہستیم و نہ ہستیم نہ در قرب و نہ در بعد ۔۔۔ مائیم نہ مائیم نہ مائیم نہ مائیم
باشیم نہ باشیم کہ باشد کہ نہ باشیم ۔۔۔ ما خانہ و ما خانگی و خانہ خدائیم
ما غرقِ محیطیم و گر آب بجوئیم ۔۔۔ اے بر لب ساحل تو چہ دانی کہ کجائیم

احمد چو برون رفت ز جائے کہ مکاں است
آیا تو کجائی کہ ندانیم کجائیم

شیخ عبداللہ بلیانی کی ایک رباعی اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتی ہے ؎

با جملہ خدائے پاک پاکیم ۔۔۔ نے ز آتش و باد و آب و خاکیم
از ہستی و نیستی ہمیشہ ۔۔۔ عُریاں شدہ ایم و جامہ چاکیم

قرآن مجید میں آتا ہے خضر علیہ السّلام نے کہا وَمَا فَعَلْتُہٗ عَنْ اَمْرِیْ ۔ یعنی کشتی کا توڑنا وغیرہ میں نے خود نہیں کیا۔ اسی طرح حدیثِ قدسی میں آیا ہے :

"میں ہی اُس کے کان ہو جاتا ہوں، جس سے وہ سُنتا ہے اور میں ہی اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں ہی اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے اور میں ہی اُس کے پیر ہو جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ پس وہ میرے ذریعے سے سُنتا، میرے ہی ذریعے سے دیکھتا۔ میرے ہی ذریعے سے پکڑتا اور میرے ہی ذریعہ سے چلتا ہے"

مولانا محمد جعفر صاحب تھانیسری مرحوم کتاب سوانح احمدی میں لکھتے ہیں :

"یہ مبحث باریک اور نازک مسئلہ ہے اس کے پیچھے پڑنا نہیں چاہیئے۔ لیکن جب کسی سالک پر یہ باتیں ظاہر ہوں تو اس سے انکار بھی نہ کرے۔ کیونکہ جب وادی مقدس میں

آگ نے کہا تھا اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (میں جہانوں کا رب ہوں) اگر نفس کا ملہ اس اشرفِ موجودات کا کہ نمونہ ذات الٰہی کا ہے، کلمۂ "انا الحق" کہے تو جائے تعجب نہیں ہے۔"

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"اس مقام پر پہنچ کر ایسے بزرگوں سے خرقِ عادات، قبول دعوات اور دفع بلیات کثرت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اگر بندہ (ایسے حال میں) مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اس کو فوراً دے دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگتا ہے تو میں پناہ دیتا ہوں اور ایسے بزرگوں کے دشمنوں پر غضبِ الٰہی اور وبال نازل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں فرمایا ہے کہ جو کوئی میرے دوست سے مخالفت کرتا ہے، اُسے میری طرف سے جنگ کا چیلنج ہے۔"

اس حدیث شریف کے مخاطب اگرچہ بنی نوع انسان ہیں۔ مگر قانونِ الٰہی تمام حیوانات کے لیے ہے۔ اگر کسی جانور نے اللہ والوں کے حق میں گستاخی کی ہے تو وہ بھی قہر الٰہی کی لپیٹ سے نہیں بچ سکا۔ مولانا خدا بخش صاحب خیر پوری کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ آپ ملتان کے ایک کوچہ سے گزر رہے تھے۔ ایک کتیا آپ کو بھونکی۔ آپ نے مڑ کر اُسے ایک نظر سے دیکھا اور چلے گئے۔ جب واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کتیا مری پڑی ہے آپ ایک لمحہ کے لیے رُک گئے اور فرمایا:

"اے کتیا! اس فقیر نے تجھے کچھ نہیں کہا۔ خدائے غیور سے اس کے بندے کے حق میں تیری گستاخی گوارہ نہیں ہو سکی۔"

حضرت شیخ الاسلامؒ عشق کی وادی میں

حضرت شیخ الاسلام بہاء الدینؒ زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عارف تھے۔ ان کا سینہ بے کینہ بھی عشقِ الٰہی کی بھٹی بنا ہوا تھا۔ اگرچہ یادِ الٰہی سے آپ ایک لحظہ بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ زندگی بھر میں ایک لمحہ اگر اس قسم کا پیش آیا، تو آسمانوں میں آپ کی موت مشہور

ہو گئی۔ؔ حیاتِ طیبہ کا بیشتر حصہ عالمِ صحو میں گزرا۔ لیکن کبھی کبھی آپ عالمِ تحیر میں اس قدر کھو جاتے تھے کہ کئی کئی دنوں تک آپ کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ

ؔ ایران کی سرزمین سے چند درویش حضرت شیخ الاسلامؒ کی زیارت کے لیے ملتان کو چلے آتے تھے، جب کوہِ سلیمان کی تلہٹی میں پہنچے، چند چڑیوں نے جو یہاں کسی درخت پر بیٹھی چہچہا رہی تھیں۔ درویشوں کو گھور گھور کر دیکھنا شروع کیا۔
ایک نے کہا: "یہ درویش شیخ زکریاؒ کو ملنے ملتان جا رہے ہیں۔
دوسری بولی: مگر ان کا تو آج انتقال ہو چکا ہے۔
تیسری چڑیا نے افسوس کرتے ہوئے کہا: آہ! بے چاروں کا یہ سفر رائیگاں گیا۔"
درویش ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے اور ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک درویش بولا: صاجو! جب شیخ ہی نہیں رہے، ملتان جانے کی کیا ضرورت ہے؟ چلو واپس چلیں۔
ایک درویش نے کہا: دوستو! اگر شیخ کی زیارت ہماری قسمت میں نہیں رہی تو کیا ہم ان کی قبر پر فاتحہ بھی نہ پڑھیں! نہیں نہیں! ہمیں ملتان ضرور جانا چاہیئے۔ دوسرے تمام درویشوں نے بیک زبان جواب دیا۔
یہ گروہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ملتان آگیا۔ درویش قلعہ کے بڑے دروازے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے خانقاہِ معلیٰ پر پہنچے۔ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ منبر پر بیٹھے وعظ فرما رہے ہیں۔
درویش حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کہ کیا معصوم پرندے بھی جھوٹ بول سکتے ہیں؟
حضرت شیخ الاسلامؒ نے کشف کے ذریعے اُن کے دل کا تردد معلوم کر لیا۔ جب وعظ ختم ہوا اور درویش قریب پہنچ کر قدم بوس ہوئے تو فرمایا "یاران! تعجب نہ کرو۔ تم نے جو کچھ راستے میں سُنا وہ بھی صحیح تھا اور جو کچھ اب دیکھ رہے ہیں، یہ بھی درست ہے۔"
درویشوں کے ماتھے پر فکر کے آثار ظاہر ہوئے، وہ سوچ میں پڑ گئے کہ یہ دونوں باتیں درست کیسے ہو سکتی ہیں؟
حضرت شیخ الاسلامؒ نے انہیں پھر مخاطب کیا اور فرمایا:
"ایک لمحہ اس فقیر پر ایسا آیا تھا کہ اس کا دل خدا کی یاد سے غافل ہو گیا تھا۔ جس پر فرشتوں نے مشہور کر دیا کہ بہاءالدین مر گیا۔ چڑیوں نے یقیناً کسی فرشتے سے یہ بات سُنی ہو گی۔ (حاشیہ اردو ترجمہ کشف المحجوب از مترجم)
اللہ اللہ! یہ وہ باعظمت لوگ تھے جو خدا کی یاد میں غافل ہونے کو موت سے تعبیر کرتے تھے۔ اسی واقعہ سے ان کی عبادت و ریاضت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ع۔ قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

نے یہ واردات کئی بار مشاہدہ کی ہیں۔ فرماتے ہیں :

ایک دن آپ حالتِ شوق و ذوق میں مستغرق تھے اور ہر بار نئی نئی کیفیت اور حالت پیدا ہوتی تھی۔ ہائے ہائے کر کے زار زار روتے تھے اور بے خودی کے اسی عالم میں یہ اشعار پڑھتے تھے ؎

بادرد بساز چوں دوائے تو منم — درکس منگر چوں آشنائے تو منم
گر بر سر عشق من کشتہ شوی — شکرانہ بدہ کہ خون بہائے تو منم

سات دن انہی دو شعروں میں مستغرق رہے کہ دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ تھی[1]۔ یہ بھی حضرت گنج شکرؒ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلامؒ اپنے محل کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ایک ہاتھ ایک کواڑ پر اور دوسرا دوسرے کواڑ پر رکھے، یہ شعر بار بار پڑھتے تھے ؎

کردی ظاہر سرما یار دگر — ماہیچ نہ کردیم خدا مے داند

حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں کہ خدا معلوم وہ کون سی بات تھی جو بار بار آپ سے یہ شعر کہلواتی تھی ؎

ایک دفعہ حضرت گنج شکرؒ اور حضرت شیخ الاسلام بغداد کہنہ کی مسجد کھف میں بیٹھے تھے۔ چند بزرگ عشق کے بارہ میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے کہا :

"عشق ایک سلطنت ہے جس کا دارالخلافہ شوق ہے۔ اس میں تخت کے اوپر "رضا" کے ہاتھ میں نرگسِ وصال کی ایک شاخ ہے جس پر تیغ ہجر اور خنجر فراق کا پہرہ ہے اور اگر کوئی ادھر کا رخ کرتا ہے تو اس پر خنجر اور تلوار کے وار شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک دقیقہ وصال کا میسّر آ جائے تو ان تلواروں اور خنجروں سے سینکڑوں اسرار منکشف ہوتے ہیں[2]۔ پس اے دوستو ! جسے عشق کی دولت حاصل ہے، اگر اُسے

---

[1] اردو ترجمہ اسرار الاولیاء، ص ۵۶۔

[2] از سیاست خنجر فراق و تیغ ہجران کشیدہ و یک شاخ نرگسِ وصال بدست رضا دادہ و در وصال ہر نفسے ہزار ہزار اسرار از آں تیغ برسے دارند (خلاصۃ العارفین بتصحیح ڈاکٹر شمیم محمود زیدی بعنوان احوال و آثار، ص ۱۲۵) ؛

ہزار خنجر لگیں اور سینکڑوں تلواریں پڑیں۔ خواہ ہزار دفعہ اس کی گردن کاٹیں۔ آہ تک نہیں نکالے گا۔"

اس کے بعد شیخ الاسلامؒ نے رقّت بھری آواز اور انتہائی سوز و گداز سے یہ رباعی پڑھی اس کے سُننے سے ہر دل میں وہ ذوق پیدا ہوا کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہوسکتی۔

رباعی

دریادِ تو اے دوست چُناں مدہوشم صد تیغ اگر زنی سر نخروشم
آہے کہ زنم بیادِ تو وقت سحر گر ہر دو جہاں دہند واللہ نفروشم

اسی طرح ایک مرتبہ جامع اُمیہ دمشق میں اللہ والوں کی مجلس گرم تھی۔ پانچ سو کے قریب اہلِ علم موجود تھے۔ دفعتہً شیخ الاسلام تشریف لائے۔ حضرت گنج شکرؒ اتفاق سے اس اجتماع میں شریک تھے۔ آپ کو دیکھ کر تعظیم کے لیے اُٹھے اور مل کر وہیں ان کے پہلو میں بیٹھ رہے۔ عشق و حیرت کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔ باری باری ہر بزرگ نے عشق کے اسرار و رموز بیان کئے۔ جب شیخ الاسلامؒ کی باری آئی۔ آپ نے فرمایا:

عشق کی تعریف یہ ہے کہ عارف سوائے خدا تعالےٰ کے کسی کو نہ دیکھے۔ بہشت و دوزخ، عذاب و ثواب اور مال و منال واصلینِ حق کے نزدیک......

اتنا کچھ فرمایا تھا کہ آپ پر تحیّر کا عالم طاری ہوگیا۔ یہ رباعی پڑھتے تھے اور بے تابانہ رقص کرتے تھے۔

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عیال و خانماں را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بدہی دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

آپ کے ساتھ اولیائے کرام کے عشق کی دبی ہوئی چنگاری بھی بھڑک اُٹھی۔ وہ بھی محبت کے ناپیدا کنار سمندر میں کھو گئے۔ "دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند" پڑھتے تھے اور بے اختیار جھوم جھوم جاتے تھے۔

حضرت محبوب الٰہی دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ملتان سے ایک بزرگ ہمارے پاس آئے انہوں نے بیان کیا کہ ایک روز شیخ الاسلامؒ زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ

غلبات شوق میں سربسجود ہو کر یہ فرماتے تھے کہ "عشق اندر آیا اور اس نے اپنے سوا باقی سب کو نکال دیا اور ہمارا بھی نشان مٹا دیا" میں نے شمار کیا تو حضرت نے ٹھیک ۱۰۰ مرتبہ سجدہ کیا اور یہی فرمایا۔

حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا پر عشق و محبت اور جذبات وسکر کی کیفیت طاری تھی۔ آپ نے فرمایا :

■ دوستو! جب عاشق حقیقی کے دل سے آہ نکلتی ہے تو آتش عشق سے تمام دنیا جل کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کوئی آگ آتش محبت سے زیادہ جلانے والی نہیں۔ اس وقت آپ نے یہ رباعی کہی اور ایک مہینہ تک حیرت کے سمندر میں کھوئے رہے ؎

عاشقاں ہر دو جہاں بے تو بیک جو نخرند　　ہر زماں خستہ دلاں تیر بلارا سپرند

شرف آں روز کہ غوغا بقیامت باشد　　عاشقاں بر در درگاہ تماشا نگرند

حضرت گنج شکرؒ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ شیخ الاسلامؒ بہاء الدین زکریا پر عشق و اشتیاق کا عالم طاری تھا۔ اسی حالت میں فرمایا :

قیامت کے دن بعض عاشقوں کی گردن میں نور کی زنجیر ڈال کر فرشتے بہشت کی طرف کھینچیں گے۔ مگر وہ لوگ زنجیر کو ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے عرش کے نیچے کھسک جائیں گے کہ دیدار الٰہی سے دل کو ٹھنڈا کریں۔ پھر حکم ہو گا کہ نور کی اور زنجیریں ڈالی جائیں۔ چنانچہ ان کی گردن میں اسّی ہزار زنجیریں اور ڈالی جائیں گی۔ مگر پھر بھی یہ کھینچیں گے اور شور مچائیں گے۔ اس وقت ندا آئے گی کہ دیدار کا وعدہ تو بہشت میں تھا۔ اس وقت یہ لوگ بہشت میں داخل ہو کر دلی مقصد سے شاد کام ہوں گے۔"

یہ بھی حضرت گنج شکرؒ کی روایت ہے کہ ایک دفعہ میں اور قطب الطالبین سید جلال بخاری برادرم مولانا بہاء الدین زکریاؒ کے پاس بیٹھے تھے۔ اس وقت حضور عالم مشاہدہ و مکاشفہ میں تھے۔ جب محبت کے سمندر میں غوطہ زن ہوئے تو عین اس حالت میں اپنے محبوب حقیقی سے درخواست کی :

---

۵۷ منقول از حضرت گنج شکرؒ بحوالہ خلاصۃ العارفین، مطبوعہ نولکشور پریس لاہور، ص ۲۲

يَا رَبِّ اَعْطِنِيْ خَيْرًا مِنَ الدَّارَيْنِ وَمَا فِيْهِمَا

آواز آئی : اَنْتَ قُطْبُ الْعٰلَمِيْنَ (آپ جہانوں کے قطب ہیں)

عرض کی : زِدْنِيْ يَا رَبِّ (اے رب! مجھے اس سے بھی زیادہ عنایت کیجئے)

جواب ملا : اَنْتَ غَوْثُ الْعٰلَمِيْنَ (آپ جہانوں کے غوث ہیں)

پھر عرض کی : زِدْنِيْ يَا رَبِّ (اے رب! مجھے اس سے بھی زیادہ عنایت کیجئے)

جواب ملا : بَعْدَ هٰذَا دَرَجَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَلَيْسَتِ الرِّسَالَةُ بَعْدَ خَتْمِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ مُحَمَّدِ الْمُصْطَفٰى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ اَعْطَيْتُكَ اَسْمَاءً مِنْ اَسْمَائِيْ اَنْتَ الشَّيْخُ الْكَبِيْرُ الْمُنِيْرُ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۔

خشیتِ الٰہی ایک دفعہ حضرت شیخ الاسلامؒ عالمِ مکاشفہ میں تھے ۔ احوالِ عالم کے علم و اطلاع کے بعد آپ پر اس قدر خوف و ہراس چھایا کہ اُٹھ کر حجرے کا دروازہ بند کر دیا اور توبہ استغفار کے لیے سجدے میں گر گئے ۔ اتنی گریہ وزاری کی کہ مصلیٰ آنسوؤں سے تر ہو گیا کئی دن اسی حالت میں گزر گئے ۔ ہائے! ہائے کی مسلسل دردناک آواز آ رہی تھی جس سے لوگوں کے دل پھٹے جاتے تھے ۔ صاحبزادگان اور جاں سپار ارادت مندوں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہر چند الحاج کی مگر کسی کا عرض قبول نہ ہُوا ۔ انجام کار حضرت کے پیارے پوتے شیخ رکن الدینؒ کو لے آئے ۔ انہوں نے دو تین مرتبہ زور سے پکارا :

"دادا جان! دروازہ کھولیئے ۔ ۔ ۔ ۔"

شیخ الاسلامؒ فرطِ محبت سے اُٹھے اور حجرہ کا دروازہ کھول دیا ۔

شیخ رکن الدینؒ نے دیکھا کہ خداشناس آنکھیں کثرتِ مجاہدہ سے سُوج آئی ہیں اور اُن سے آنسوؤں کی بجائے خُون کے قطرات ٹپ ٹپ گر رہے ہیں ۔ عرض کی : حضور! اس گریہ وزاری کا سبب کیا ہے

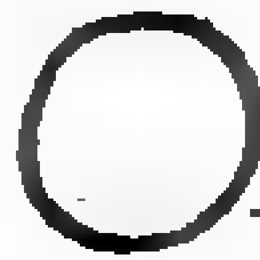
فرمایا : بیٹا! مَیں نے عالمِ مکاشفہ میں دیکھا کہ ایک شخص بہاء الدین جو زہد و ورع میں صاحبِ کمال اور علم و عمل میں یگانہ روزگار تھا ۔ فوت ہو گیا ۔ اس کی عبادت و طاعت کسی کام نہ آئی اس کے تمام اعمال اس کے منہ پر مارے گئے اور ایمان سلب کر لیا گیا ۔ یہ حال دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہُوا کہ خدا جانے اس فقیر بہاء الدین سے کیا سلوک ہو گا؟ دوسرا یہ کہ روزِ میثاق جب

تمام ارواح خداوند کریم کے حضور پیش ہوئیں۔ ارشاد ہوا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ؟ جواب عرض ہوا۔ "بلیٰ"، حکم ہوا "میں تمہارا معبود ہوں، مجھے سجدہ کرو"!

پہلے حکم پر کئی سجدے میں چلے گئے اور کئی کھڑے رہے۔ دوسرے پر پہلے لوگوں کے ساتھ کئی اور بھی شریک ہو گئے، یہ سب مخلصین کہلائے۔ اوّل مسعود آخر محمود۔ لیکن جنہوں نے سجدہ نہیں کیا تھا وہ "خسر الدنیا والاخرۃ" کے مصداق بنا دیئے گئے۔ خدا معلوم یہ ناچیز کس گروہ میں تھا؟ حضرت رکن عالمؒ اس وقت اگرچہ کمسن تھے لیکن مادر زاد ولی تھے اور قطبیتِ عظمیٰ کے درجہ پر فائز تھے۔ آپ نے عرض کی:

"دادا جان! آپ ہر دو امور کی بابت تسلّی فرمائیں۔ کیونکہ حضور کی روح مخلصین کے اس گروہ میں سے ہے جس نے ہر دو مرتبہ خلوصِ دل سے سجدہ کیا اور اپنے مالکِ حقیقی کو وحدانیت اور یگانگت میں پہچانا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ آپ کی روح اغواث کی صف میں تھی اور میں اقطاب کی صف میں تھا۔ میں نے چاہا کہ انبیاء علیہم السّلام کی صف میں جا کر کھڑا ہوں۔ حضرت جبرائیلؑ کو حکم ہُوا کہ "رکن الدین" کو اس صف سے ہٹا دو۔ حضرت جبرائیلؑ نے ایک پر لگایا، جس سے میرا پاؤں زخمی ہو گیا۔ میں اقطاب کی صف میں لوٹ آیا اور آپ کی رُوحِ پُر فتوح کو دیکھا کہ اغواث کی صف میں کھڑی ربّ العزت کی حمد و ثنا کر رہی تھی۔"

قطب الاقطاب کے بیان سے شیخ الاسلامؒ کی تسلّی ہوئی۔ اسی وقت "جبینِ نیاز" ادائے شکر کے لیے خاکِ عبودیت پر رکھ دی اور پھر باہر تشریف لا کر مشتاقانِ جمال کو شربتِ دیدار سے شاد کام فرمایا۔




کشف
و
کرامات

بعض مشائخ کرام نے سلوک کے سوؔ مراتب مقرر کئے ہیں اور کشف و کرامات کو سترھواں درجہ دیا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک کامل مرد وہ ہے جو اپنے تئیں سترھویں درجے پر کشف نہ کرے۔ اگر کرے گا تو آگے ترقی نہیں کرسکے گا۔ اگر سوئیں درجے پر پہنچ کر کشف کرے، تو جائز ہے۔ حضرت بایزیدؒ اور شاہ شجاع کرمانیؒ نے سلوک کے پچاسؔ مراتب مقرر کئے ہیں، جن میں دسواں درجہ کشف و کرامات کا ہے۔ جو درویش دسویں مرتبے پر پہنچ جائے، وہ اُن کے نزدیک صاحب کشف و کرامات ہے۔ خواجگانِ چشت اہلِ بہشت نے سلوک کے پندرہ مراتب مقرر کئے ہیں، جن میں پانچواں درجہ کشف و کرامات کو دیا ہے۔

شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ اپنی کتاب "اعلام اللہ" میں لکھتے ہیں:

"ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم کی اُمت میں اولیاء اللہ ہیں۔ جن سے کرامات صادر ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر ایک رسول کے زمانے میں اُن کے تابعین ہوتے تھے۔ جن سے کرامات و خرق عادات ظاہر ہوا کرتے تھے۔ اولیاءؑ کی کرامات انبیاء علیہم السّلام کے معجزات کا تتمّہ ہے۔ لیکن جو شخص کہ احکامات شرعیہ کا ملتزم نہیں اور اُس کے ہاتھ پر خرق عادات کا ظہور ہو تو ہمارے اعتقاد میں وہ شخص زندیق اور بے دین ہے اور جو کچھ اس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ مکر و استدراج[1] ہے۔

[1] ونعتقد ان للاولیاء من امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کرامات واجابات وھکذا کان فی زمن کل رسول کان لھم کرامات ومخرقات للعادات وکرامات الاولیاء من تتمۃ معجزات الانبیاء ومن ظھر لہ وعلی یدہ من الخرقات وھو علی غیر الالتزام باحکام الشریعۃ نعتقد انہ زندیق وان الذی ظھر لہ مکر واستدراج (عقیدت ارباب التقیٰ بحوالہ اعلام اللہ مصنفہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ)

مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے نفحات الانس میں کرامات و خرق عادات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

خرق عادات کے اقسام تو بہت ہیں، جیسے معدوم کا موجود اور موجود کا معدوم کر دینا پوشیدہ امر کو ظاہر اور ظاہر کو پوشیدہ کرنا، دُعا کا مقبول ہونا، مسافت بعید کو تھوڑے عرصہ میں طے کر لینا۔ امور غائب سے باخبر کرنا۔ ایک ہی وقت میں متعدد مکانوں میں حاضر ہونا، مُردوں کو زندہ کرنا، زندوں کو مارنا، حیوانات، نباتات اور جمادات کا کلام اور تسبیح وغیرہ سُننا بوقت ضرورت بغیر کسی ظاہری سبب کے طعام کا مہیا کر لینا۔ پانی اور ہوا پر چلنا اور ہوا میں سیر کرنا۔ وحشی حیوانات کا مسخر کر لینا۔ ان کے اجسام میں قوت کا آجانا۔ مثلاً ایک شخص "سکر" اور "وجدان" کے عالم میں اپنے پاؤں سے درخت کو جڑ سے اکھیڑ دے یا دیوار پر ہاتھ مارے تو وہ پھٹ جائے اور بعض اپنی انگلی سے کسی کی طرف اشارہ کیا کرتے ہیں کہ وہ گر جائے۔ پھر وہ اسی وقت گر جاتا ہے۔ یا کسی کی گردن اُڑانے کا اشارہ کریں تو فوراً اُس کا سر اُڑ جائے۔
خلاصہ یہ کہ جب حق سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے دوستوں میں سے بعض کو اپنی قدرت کاملہ کا مظہر بناتے ہیں، تو جس طرح وہ چاہتے ہیں، تصرف کر سکتے ہیں۔ درحقیقت وہ اثر و تصرف خدا تعالیٰ کا ہی ہوتا ہے، جو ظاہر ہوتا ہے اس وقت وہ درویش درمیان میں نہیں ہوتا"۔

گو خرق عادات تمام مذاہب کا ایک ضروری عنصر ہے، لیکن بعض معتزلی المشرب اولیاء اللہ کی کرامات کا انکار کرتے ہیں اور یہ سلسلہ صدہا سال سے پہلے چلا آتا ہے۔

لہ وغیر ذلک من فنون الاعمال الناقضۃ للعادۃ کالمشی علی الماء، والسیاحۃ فی الھواء وکالاکل من الکون وکتسخیر الحیوانات الوحشیۃ وکالقوۃ الظاھرۃ علی ابدانھم کالذی اقتلع شجرۃ برجلہ من اصلھا وھو ید ودفی السماع وضرب الید علی الحائط فیشق وبعضھم لیشیر باصبعہ الی شخص لیقع فیقع او یضرب عنق احد بالاشارۃ فیطیر راس المشار الیہ (نفحات الانس، مطبوعہ نولکشور پرنٹنگ پریس لاہور) ص ۱۹

نارِ نمرود کی غلط تاویل

فتوحات میں درج ہے کہ ۵۳۶ھ میں ایک فلسفی شیخ ابن العربیؒ کی خدمت میں آیا۔ یہ شخص خوارق عادات اور انبیاء علیہم السّلام کے معجزات کا منکر تھا۔ اتفاق سے جاڑے کا موسم تھا اور مجلس میں انگیٹھی جل رہی تھی۔ اس فلسفی نے کہا:

"عام لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تھا، لیکن وہ نہیں جلے تھے یہ امر محال ہے، کیونکہ آگ کا کام بالطبع یہ ہے کہ جو چیزیں جلنے کے لائق ہوں اُنہیں جلا دے۔"

پھر فلسفی تاویل کرنے لگا:

"قرآن میں جو آگ مذکور ہے، اس سے مراد نمرود کے غضب کی آگ ہے اور ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے سے یہ مُراد ہے کہ نمرود سخت جھنجھلایا اور غصّہ سے لال پیلا ہو گیا۔ حضرت کے نہ جلنے سے مقصود یہ ہے کہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ دلیل و حجت سے اس پر غالب آگئے تھے، اس لیے نمرود کا غصّہ فرد ہو گیا۔"

جب فلسفی نے اپنی تقریر ختم کی تو حاضرین شیخ کی طرف متوجہ ہوئے کہ وہ اس کا کیا جواب دیتے ہیں؟

شیخ نے بڑی متانت سے فلسفی پر نظر ڈالی اور فرمایا:

"کیا تُم قرآن کے اس قصّہ کا انکار کرتے ہو؟ مَیں یہ بات تمہیں اسی جگہ دکھا دیتا ہوں۔ اس سے مقصود معجزہ کی صحت کا یقین دلانا ہے۔ اپنی کرامت کا اظہار منظور نہیں۔"

فلسفی نے کہا: یہ قطعاً ناممکن ہے۔"

شیخ نے دونوں ہاتھوں سے انگیٹھی کو پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور فرمایا کہ کیا یہ آگ وہی ہے، جس کے متعلق تم کہہ رہے ہو کہ جلانے کی خاصیت رکھتی ہے۔

کہا "ہاں! یہ وہی آگ ہے۔"

شیخ نے انگیٹھی اُٹھا کر فلسفی کے دامن میں انڈیل دی۔ پہلے تو وہ گھبرایا۔ لیکن جب اس

نے دیکھا کہ اس سے نہ کپڑے جلتے ہیں اور نہ بدن کو حرارت محسوس ہوتی ہے، تو وہ حیرت سے ان لال لال انگاروں کو تکنے لگا۔

شیخ بے تکلفی سے انگاروں کو الٹ پلٹ رہے تھے۔ بظاہر دہکتے ہوئے انگاروں کو اُٹھا کر فلسفی کے سر اور بدن سے نچھاور کیا۔ وہ اِدھر اُدھر گرے پڑتے تھے مگر کوئی چیز ان کی حرارت سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ اب فلسفی نے بھی انگاروں کو ہاتھ میں اُٹھانے کی جرأت کی۔ واقعی حرارت کی خاصیت اُن سے زائل ہو چکی تھی۔

شیخ نے اس آگ کو پھر انگیٹھی میں ڈال دیا اور اس فلسفی سے فرمایا:

"اپنا ہاتھ اس میں ڈال۔"

جب فلسفی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ جلنے لگا۔

آپ نے فرمایا!

"اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آگ کا جلانا یا نہ جلانا خدا تعالیٰ کے حکم میں ہے نہ یہ کہ اُس کی طبیعت کا خاصا ہے۔"

فلسفی نے اقرار کیا اور ایمان لے آیا۔

رُوح سے مُلاقات فتوحات میں شیخ نے ایک اور پُر لطف واقعہ درج کیا ہے لکھتے ہیں:

"مَیں جمعہ کی نماز کے بعد کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ مَیں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ طواف کرتا ہے لیکن کسی سے مزاحم نہیں ہوتا اور نہ کوئی اس کی مزاحمت کرتا ہے بلا تکلف دو آدمیوں کے درمیان آ جاتا ہے اور اُنہیں جُدا نہیں کرتا۔ مَیں نے سمجھ لیا کہ یہ رُوح ہے اور انسانی قالب میں طواف کرتی پھرتی ہے۔ مَیں نے اس کا خیال رکھا۔ جب وہ شخص قریب آیا تو اُسے سلام کیا۔ اُس نے مجھے جواب دیا۔ اور مَیں اس کے ہمراہ ہو لیا۔ ہم نے آپس میں چند باتیں کیں۔ وہ شیخ احمد سبتی کی رُوح تھی۔

جب مَیں اس سے رخصت ہو کر اپنے دوستوں کے پاس آیا، تو ایک صاحب نے کہا:

A. Razzaq Shah

"دیار! وہ کون آدمی تھا؟ جو مطاف میں آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

میں نے سارا قصّہ کہہ سُنایا تو حاضرین نے تعجّب کیا۔

شہزادی کو بچالیا

مولانا جامیؒ فتوحات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ایک درویش نے شیخ اکبر سے کہا کہ بادشاہ کی لڑکی سخت بیمار ہے۔ چونکہ فقراء اور مساکین کی پرورش کرتی ہے اور بڑی نیک بخت ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ آپ وہاں تشریف لے جاکر شہزادی کو دُعا کریں۔ یہ سُن کر شیخ شاہی محل کو روانہ ہوئے۔ شہزادی کے شوہر نے استقبال کیا اور شیخ کو مریضہ کے سرہانے بٹھا لیا۔ شیخ نے دیکھا کہ وہ حالتِ نزع میں ہے۔ فرمایا:

"جلدی پکڑو، یہ تو چلی!"

اُس کے خاوند نے گھبرا کر عرض کی۔

"حضور! میں اسے کیسے پکڑوں؟"

حضرت مریضہ کے تنفّس کی طرف متوجّہ تھے۔ فرمایا:

"اسے خرید لیا ہے، اس کا پورا خون بہا لے آؤ۔"

نزع اور جان کندنی کی حالت میں توقف پڑ گیا۔ لڑکی نے آنکھ کھولی اور شیخ کی طرف دیکھ کر لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا:

"السلام علیکم!"

شیخ نے کہا:

"بیٹی! قطعی خوف نہ کر۔ ہم نے تجھے ملک الموت سے چھڑا لیا ہے۔ تو بڑی قدر اور مرتبہ والی ہے۔ اگر تو زندہ رہے گی، تو لوگوں کو تجھ سے فائدہ پہنچے گا۔ میری ایک بچی ہے جو مجھے بہت پیاری ہے، میں اُسے تجھ پر سے تصدق کرتا ہوں۔"

پھر ملک الموت کی طرف متوجّہ ہوئے۔ فرمایا:

"تم بغیر کوئی جان لیے واپس جانے والے نہیں ہو۔ اچھا میری بیٹی کی رُوح اس کے بدلے

میں لے لو۔ شہزادی کو تو میں خدا تعالیٰ سے خرید چکا ہوں ۔"

اس کے بعد شیخ اپنی لڑکی کے پاس گئے۔ اُسے کوئی بیماری نہ تھی۔ گھر کے صحن میں بیٹھی کام کر رہی تھی۔ باپ کو آتا دیکھ کر ادب سے کھڑی ہو گئی۔ شیخ نے کہا :

"اے لختِ جگر! مجھے اپنی جان بخش دے، کیونکہ نفع رسانی میں تو شہزادی کے قائم مقام نہیں ہو سکتی ۔"

اس معصومہ نے بلا تامل عرض کیا :

"اے پدرِ بزرگوار! میری جان آپ کے حکم میں ہے، جو مناسب سمجھتے ہیں، عمل میں لائیے ۔"

شیخ نے ملک الموت سے فرمایا :

"آگے بڑھ اور اس کی رُوح قبض کر!"

اسی وقت شیخ کی لڑکی فرش پر گر پڑی اور مر گئی[1]

پتھر سے درخت پھوٹ نکلا

شیخ عدی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک مُرید آیا۔ اور بولا :

"اے شیخ! میں چاہتا ہوں کہ اس جنگل میں رہوں اور لوگوں سے قطع تعلق کر لوں، کیا اچھا ہوتا کہ یہاں پانی ہوتا کہ میں پیا کرتا اور کچھ کھانے کو مِل جاتا کہ میں اپنی قوت بناتا ۔"

شیخ اُٹھا وہاں پر دو پتھر پڑے تھے۔ ایک پر پاؤں مارا تو اس سے میٹھے پانی کا چشمہ جاری ہو گیا۔ دوسرے پر پاؤں مارا تو انار کا ایک درخت پھوٹ نکلا۔ انار سے کہا :

"اے درخت! ہر روز خُدا کے حکم سے ایک انار شیریں اور دُوسرے دن کھٹا دیا کر ۔"

امام یافعی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ہم نے اس انار کا مشاہدہ کیا تھا۔ واقعی وہ دُنیا

---

[1] نفحات الانس اردو مطبوعہ نولکشور پریس لاہور، ص ۵۸

کے بہترین اناروں میں سے تھا۔[1]

وقت میں فراخی پیدا ہو گئی

شیخ الشیوخ ابن سکینہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید قرآن مجید پڑھ رہا تھا جب فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ[2] پر پہنچا۔ تو اس کے دل میں تردّد سا پیدا ہوا کہ ایک دن ہزار سال کا کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ شخص فن زرگری میں ماہر تھا۔ جمعہ کے دن شیخ کی خانقاہ سے درویشوں کے مصلّے مسجد جامع میں لے جاکر بچھاتا اور نماز کے بعد انہیں لپیٹ کر واپس خانقاہ میں لے آتا۔

جمعہ کا دن تھا۔ اُس کے ہاں چند مہمان آئے ہوئے تھے۔ اُس نے بازار سے مچھلی خرید کر گھر میں دی کہ اُسے مہمانوں کے لیے تل کر رکھیں۔ نماز کا وقت قریب تھا۔ اُس نے مصلّے مسجد میں پہنچانے تھے۔ لیکن اُس نے سوچا کہ پہلے دریا پر جاکر غسل کر لوں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دجلہ پر پہنچا۔ کپڑے اُتار کر کنارہ پر رکھے اور خود پانی میں اُتر گیا۔ ڈبکی لگا کر جب سر باہر نکالا تو کیا دیکھتا ہے کہ نہ وہ دریا ہے اور نہ وہ شہر۔

لوگوں سے پُوچھا "یہ کون سا دریا ہے؟"

اُنہوں نے جواب دیا "دریائے نیل!"

سنار تعجب میں پڑ گیا۔ پانی سے باہر نکل آیا۔ شہر قریب ہی نظر آ رہا تھا۔ وہی تہمد پہنے شہر میں گیا اور ایک سنار کی دوکان پر جاکر چپ چاپ ٹھہر گیا۔ دوکاندار نے فراست سے معلوم کر لیا کہ یہ کوئی سنار ہے۔

بلا کر قریب بٹھایا اور آزمائش کے لیے تھوڑا سا کام دیا۔ جسے اس نے عمدگی سے کر لیا۔ دوکاندار نے اس کی بڑی عزت کی۔ گھر لے گیا اور اپنی لڑکی کا اس سے نکاح کر دیا۔ سات سال اس شخص کو اسی طرح مصر میں گزر گئے۔ اس بیوی سے اس کے تین لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک دن معمول کے مطابق نیل پر آیا۔ نہانے کے لیے ڈبکی لگائی۔ جب سر باہر

---

[1] تاریخ مرآۃ الجنان عبرۃ الیقظان فی معرفت حوادث الزمان۔ از امام عبداللہ الیافعی الیمنی رحمۃ اللہ علیہ

[2] ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔

نکلا تو دیکھا کہ بغداد کے دجلہ میں کھڑا ہے اور کپڑے جو سات سال پہلے پہن کر آیا تھا، جُوں کے توں ایک پتھر پر رکھے ہیں۔

سنار نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور افتاں وخیزاں خانقاہ میں آیا۔ دیکھا کہ مصلّے اسی طرح بندھے پڑے ہیں۔ چند درویش جو خانقاہ میں بیٹھے تھے۔ بولے:

"جلدی مصلّے مسجد میں لے جا۔ کیونکہ جماعت کے کئی درویش شیخ سے مسجد گئے ہوئے ہیں۔"

سنار دم بخود مصلّے اُٹھا مسجد پہنچا اور نماز کے بعد اُنہیں لپیٹ کر خانقاہ میں لے آیا۔ گھر گیا تو بیوی نے تلی ہُوئی مچھلی سینی میں رکھ کر پیش کی کہ مہمانوں کو کھلاؤ۔ سنار نے مہمانوں کو کھانا کھلایا اور اس کے بعد شیخ ابنِ سکینہؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ تمام ماجرا عرض کیا۔ آپ نے فرمایا:

"مصر جاکر اپنے بچّوں کو لے آ، پھر اس امر پر غور کریں گے۔"

سنار چند دنوں میں ہی اپنی بیوی بچّوں کو مصر سے لے آیا۔ بغداد کے ہر گھر میں اس کا چرچا ہونے لگا۔

شیخ نے سنار سے پُوچھا کہ اب یہ بتا کہ اس دن تم کس فکر میں تھے اور تمہارے دل میں کیا بات آئی تھی؟

اس نے دل کا تردّد بیان کیا۔ فرمایا:

"خدا نے تیرے ایمان اور اعتقاد کی درستی کے لیے زمانے کی درازی اور فراخی کا نمونہ پیش کیا۔ وہ اس امر پر قادر ہے کہ بعض بندوں کی نسبت زمانے کو فراخ اور دراز کر دے۔ باوجودیکہ دوسروں کے لیے وہ زمانہ تھوڑا ہو اور یہی زمانہ کے قبض کا حال ہے کہ اگر چاہے تو لمبے زمانہ کو تھوڑا کر دے[1]۔ واللہ قادرٌ علی من یشاء۔

---

[1] خرقِ عادت کے مُنکرین کا تمام تر استدلال یہ ہے کہ خرقِ عادت، قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور جو چیز قانونِ فطرت کے خلاف ہو، وہ ممتنع ہے۔ اس دلیل کے دُوسرے حصّے سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن پہلے حصّے کے ثابت ہونے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا فطرت کے تمام قوانین منضبط ہو چکے ہیں؟ کیا اس پر اطمینان ہو چکا ہے کہ
(باقی صفحہ نمبر ۲۳۵ پر)

قطب الاقطاب نے مردہ زندہ کر دیا

ایک مرتبہ قطب الاقطاب چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں سلوک کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"سلوک کی دُنیا میں کامل مردوہ ہے کہ جب ولایت کے مرتبہ کو پہنچے۔ اگر اُس وقت مُردے کی حق میں دُعا کرے تو وہ زندہ ہو جائے"۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۴ سے) ہم جن امور کو قانونِ فطرت سمجھ رہے ہیں، وہ درحقیقت قانونِ فطرت ہیں۔ علوم جدیدہ کی تحقیقات اور تجربہ نے سینکڑوں ایسے قوانینِ فطرت دریافت کئے جو پہلے مطلق معلوم نہ تھے اور یہ سلسلہ برابر قائم ہے۔ صدہا سال سے فقراء کے متعلق یہ واقعات منقول چلے آتے ہیں کہ وہ محض توجہ قلب سے دوسرے شخص کو مدہوش و متاثر کر سکتے تھے۔ موجودہ زمانے کا مادّہ پرست طبقہ اس بناء پر انکار کر رہا ہے کہ یہ خلافِ قانونِ فطرت ہے کہ ایک مادّہ بغیر اس کے کہ دوسرا مادّہ اس سے ملاقی ہو، کسی قسم کا اثر قبول نہیں کرتا۔ لیکن جب مسمریزم کے تجربوں نے قوت نفسانی کا اثر ثابت کیا تو پچھلے تمام واقعات تسلیم کرنے پڑے۔ آج مسمریزم کا ایک مشاق علی رؤس الاشہاد دوسرے اشخاص کو محض قوتِ نظر سے یا قوتِ نفس سے بے ہوش کر سکتا ہے۔ اس سے جو بات چاہے کہلوا سکتا ہے، جو کام چاہے کرا سکتا ہے۔

قدیم عربی کتابوں میں مذکور ہے کہ مصر میں ایک مچھلی ہوتی ہے جس کے چھونے سے جسم پر رعشہ طاری ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آدمی اس کو ہاتھ سے پھینک نہ دے۔ تو رعشہ کی شدت سے بے ہوش ہو کر گر جائے۔ یہ واقعہ ایک عرصہ تک خلافِ عقل قرار دیا جاتا رہا۔ لیکن موجودہ تحقیقات نے اس مچھلی کا وجود ثابت کر دیا اور معلوم ہوا کہ اس میں بجلی ہوتی ہے۔

خود یورپ کے محققین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جس قدر تحقیقات بڑھتی جاتی ہے۔ ناممکن چیزیں ممکن ثابت ہوتی جاتی ہیں۔ فرانس کا مشہور فاضل کیمل فلامریان (فزیکل سائنس کا ماہر) لکھتا ہے کہ انسان کی فطری عادت یہ ہے کہ جو چیز بظاہر مشکوک ہوتی ہے یا جس کو وہ نہیں جانتا اور سمجھ نہیں سکتا۔ اس کے وجود سے انکار کرتا ہے۔ ہیروڈوٹس یا پلین کی تحریروں میں اگر ہم یہ پڑھتے کہ ایک عورت کی ران میں چھاتی تھی اور وہ اس سے اپنے بچہ کو دودھ پلاتی تھی، تو

(باقی صفحہ ۲۳۶ پر)

---

[1] ذکر العاشقین اردو مطبوعہ، جادید پریس لاہور۔ صلا۔

خواجہ صاحب ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ ایک بڑھیا روتی ہوئی آئی اور عرض کی :

"حضور! میری فریاد سُنیئے، بادشاہ نے میرے لڑکے کو بے گناہ پھانسی پر چڑھا دیا ہے"۔

یہ سُنتے ہی آپ کھڑے ہو گئے، عصاء ہاتھ میں لیا اور احباب کو ہمراہ لیے بُڑھیا کے پیچھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۵) ہمیں بے اختیار ہنسی آتی اور ہم استہزا کرتے۔ لیکن پیرس کی علمی کانفرنس منعقدہ ۲۵ رجون ۱۸۶۲ء میں یہ واقعہ براء العین مشاہدہ کیا گیا۔ اسی طرح اگر کوئی ہم سے یہ کہتا کہ ایک شخص مرگیا اور جب اُس کی تشریح کی گئی تو اس کے پیٹ میں ایک بچہ پایا گیا جو اس شخص کا توام تھا اور اس کے جسم میں پرورش پاتا رہا تھا تو ہم اس واقعہ کو محض خرافات سمجھتے۔ لیکن چند روز ہوئے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک بچہ چھپن برس تک بدن ہی میں پرورش پاتا رہا اور پھر ظاہر ہُوا۔

ہیرڈوٹس کے ایک مترجم نے لکھا ہے کہ لوگوں کا یہ بیان کہ سکندر کی بیوی رو کسانہ نے ایک بچہ دیا تھا، جس کا سر نہ تھا، خلافِ عقل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج تمام طبی ڈکشنریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ بہت سے بچے بغیر سر کے پیدا ہوتے ہیں۔" اس قسم کے واقعات ہم سے کہتے ہیں کہ ہم کو احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ جو لوگ بغیر بصیرت کے انکار کر دیا کرتے ہیں، وہ جاہل اور کودن ہیں۔

دُنیا میں خرقِ عادات سے ہمیشہ اس فرقے کو انکار رہا ہے جو طبعی اور مادّہ پرست ہوتا ہے۔ یورپ کا ایک مُدّت تک یہی حال رہا۔ پھر ایک فرقہ پیدا ہوا۔ جس نے روح اور روح کے اثرات کی تحقیقات پر توجّہ دی۔ ان لوگوں نے کافی تجربات کے بعد یہ دعویٰ کیا کہ رُوح جسم سے ایک جُداگانہ چیز ہے اور اس کے قویٰ اور ادراکات بالکل الگ ہیں۔ رُوح سینکڑوں کوس سے بغیر حواس کی وساطت کے ہر چیز کو دیکھ سکتی ہے اور سُن سکتی ہے۔ رُوح آئندہ واقعات کا ادراک کر سکتی ہے۔ روح کوسوں تک اپنا اثر پہنچا سکتی ہے۔ غرض رُوح کے ذریعہ سے بہت سے ایسے افعال ہو سکتے ہیں جن کو خرقِ عادت کہا جاتا ہے۔ اس فرقہ نے اپنے دعویٰ کو اس بلند آہنگی سے ظاہر کیا کہ لوگوں کو اس کی تحقیقات کی طرف متوجّہ ہونا پڑا۔ ۱۸۶۹ئہ میں بمقام لنڈن ان امور کی تحقیقات کے لیے ایک بڑی مجلس منعقد ہوئی۔ اٹھارہ ماہ تک یہ مجلس برابر تحقیقات کرتی رہی۔ انجام کار اس نے جو رپورٹ مرتب کی اُس کے بعض فقرات یہ ہیں :

"مجلس نے اپنی رائے کا مدار صرف ان تجربات پر رکھا جو مجلس نے براء العین مشاہدہ کئے اور جن (باقی صفحہ ۲۳۷ پر)

روانہ ہوئے۔ وہ حضرت کو لاش کے پاس لے گئی۔ لڑکا پھانسی پر لٹکا ہوا تھا۔ شیخ نے مصلوب کی گردن پکڑ کر آسمان کی طرف نگاہ کی اور کہا :
"اے پروردگار! اگر یہ لڑکا بے گناہ سُولی پر چڑھایا گیا ہے تو اسے زندہ کر دے"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۶ سے) میں کسی قسم کا شک و شُبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مجلس میں چار پانچ ممبر ایسے تھے جو شروع میں ایسے واقعات کے سخت مُنکر تھے اور سمجھتے تھے کہ ان واقعات میں یا تو فریب اور شعبدہ بازی سے کام لیا جاتا ہے یا خود انسان کے عصبی نظام کا اثر ہے۔ لیکن نہایت دقیق اور مکرر تجربوں کے بعد ان کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ یہ خرق عادات حقیقی اور واقعی ہیں"۔

اس کے بعد انگلستان اور امریکہ میں اس کی تحقیقات کے لیے ایک اور مجلس بیٹھی۔ جس کے صدر ہنرلیوب اور ہوڈسن تھے۔ یہ مجلس تقریباً بارہ برس تک تحقیقات میں مصروف رہی۔ بالآخر ۱۸۹۹ء میں اس نے اپنی تحقیقات ختم کی اور ان واقعات کی صحت کا اعتراف کیا۔ چنانچہ رپورٹ کے خاتمہ پر لکھا ہے :

"مجھے امید ہے کہ میں برس دن کے بعد تمام دُنیا کو بدلائل قطعیہ یہ ثابت کروں گا کہ اس عالم فانی کے بعد ایک اور عالم ہے۔ مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ خرق عادات دیکھے جن کی نسبت کسی طرح شعبدہ اور فریب کا احتمال نہیں ہو سکتا"۔

ہوڈسن کی رپورٹ کے چند جملے ملاحظہ ہوں :

"دُنیا کو بہت جلد عظیم الشان اطلاعات موصول ہونے والی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ایک دو برس میں دُنیا کے لیے انسانی زندگی کے قوانینِ فطرت کی نئی تفسیر پیش کر دوں گا۔ اگر پروفیسر ہنرلیوب نے یہ دعوٰے کیا ہے کہ اس نے مردوں کی روحوں کے ساتھ باتیں کیں، تو اس نے بالکل صحیح دعوٰے کیا ہے"۔

ایک اخبار کے نامہ نگار نے ہوڈسن سے اسی مسئلہ کے متعلق بات چیت کی تو اس نے یہ کہا :

"مَیں نے اور پروفیسر ہنرلیوب نے ایک ساتھ تحقیقات شروع کی۔ ہم دونوں دہریہ تھے اور کسی شئے

(باقی صفحہ ۲۳۸ پر)

[1] ذکر العارفین اردو مطبوعہ تجارتی پریس لاہور ص ۸۳

ابھی یہ جملہ حضرت کے مُنہ میں تھا کہ لڑکا زندہ ہو گیا۔

حضرت محبوب الہیٰ دہلوی یہ روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ مرد کا کمال اسی قدر ہوتا ہے، جب انسان اس درجے پر پہنچ جائے تو پھر اس سے آگے کا مقام سوائے اللہ تعالیٰ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۷ سے) پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ تحقیقات سے ہماری یہ غرض تھی کہ مدعیانِ روحانیت جو شعبدہ بازیاں کرتے ہیں، ان کی پردہ دری کی جائے۔ لیکن آج میں اس بات کا قائل ہوں کہ مُردوں سے بات چیت ہو سکتی ہے اور اس کے متعلق ایسے دلائل ظاہر ہو چکے ہیں کہ اب شُبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہی۔"

رسل ویلز اپنی کتاب "عجائباتِ رُوح" میں لکھتا ہے:

"میں محض دہریہ تھا، مجھ کو ذرا بھر بھی خیال نہ تھا کہ میں رُوح کا معترف ہو سکوں گا۔ لیکن حیرت خیز مشاہدات نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ان حقیقی چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کروں۔"

۱۸۹۳ء میں بمقام میلان ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد ہوئی۔ نامور حکماء نے اجلاس میں ان امور کی تحقیقات کی اور بالآخر اپنی رپورٹ میں لکھا کہ جو خرق عادات ہم نے مشاہدہ کئے، ان میں کسی قسم کی شعبدہ بازی اور چالاکی نہیں تھی اور یہ مشاہدات یہ درجہ رکھتے ہیں کہ مسائل علمیہ میں داخل کئے جائیں۔

اس قسم کی صدہا شہادتیں ہیں، جنہیں نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس لیے ہم بوعلی سینا کی رائے پر اکتفا کرتے ہیں کہ انہیں بھی ایک مدّت تک خرق عادات سے انکار رہا۔ لیکن جو صوفیائے کرام اس زمانہ میں موجود تھے ان کی کرامات اس کثرت سے ان کے مشاہدے میں آئیں کہ بالآخر ان کو اعتراف کرنا ہی پڑا۔ اشارات میں خود اُن کے الفاظ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس پر یجولیزم والے تو صاف تسلیم کرتے ہیں کہ روح ایک مستقل جداگانہ چیز ہے اور یہ خوارق عادات اسی کے آثار ہیں۔ جو لوگ رُوح کے قائل نہیں، ان کو بھی مشاہدات اور تجربوں کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑا کہ انسان میں کوئی ایسی قوّت ہے جس سے وہ خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں جو جسم اور مادہ سے سرزد نہیں ہو سکتے۔

غرض خرق عادات و کرامات اہلِ اللہ کا ہر سلیم الفطرت انسان عام اس سے کہ وہ عالم ہو یا جاہل، رند ہو یا صُوفی، متمدن ہو یا وحشی، کم عقل ہو یا فلاسفر، اعتراف و اقرار کرتا ہُوا "کَرَامَاتُ الْاَوْلِیَاءِ حَقٌّ" کا نعرہ لگاتا ہے۔

(اقتباس از "ذکر العارفین" از مولانا غلام قادر صاحب اشرفی فرید کوٹی، مطبوعہ حجازی پریس لاہور)

کے اور کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"درویشی کے ستّر (۷۰) مرتبے ہیں۔ جن میں سے پہلا یہ ہے کہ جب درویش اسے طے کر لے تو اسے اتنی روحانی قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ اگر زمین کی طرف نگاہ کرے تو تحت الثریٰ تک کی چیزیں دکھائی دینے لگیں اور اگر آسمان کی جانب نظر اُٹھائے تو عرشِ عظیم بے حجاب نظر آئے لیکن جو درویش ستّر (۷۰) ہزار مراتب طے کر لیتا ہے۔ اس کی رُوح عظمتِ کبریا کے ساتھ مل جاتی ہے۔ یہ بات عقل و فکر میں نہیں آسکتی۔ یہ عقل کی حد سے باہر ہے۔"

بعدازاں فرمایا:

"جس طرح درویشی کا مقام ستّر (۷۰) ہزار عالم سے بالاتر ہے۔ اسی طرح جو درویش ستّر (۷۰) ہزار عالم سے باخبر نہیں، وہ درویش ہی نہیں۔ اس میں ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ جب مراقبہ کرے تو اٹھارہ ہزار عالم کے گرد پھر آئے اور جب واپس آئے تو اپنے تئیں سجادہ پر پائے۔"[۱]

یہ کسی عامی کے الفاظ نہیں، حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء دہلوی کا دعویٰ ہے، جن کی عظمت اور جلالت کے آگے علاؤالدین خلجی جیسے قہرمان سلاطین نے سر جُھکا دیئے تھے۔ دنیائے تصوف کا جلیل القدر شہر یار کہ سات سو برس سے اس کی مرقدِ پاک مرجع خلائق چلی آتی ہے اور آج جبکہ کفرستانِ ہند میں کوئی مسجد اور کوئی خانقاہ محفوظ نہیں ہے۔ بھارت کے بڑے بڑے سکھ اور ہندو لیڈر حضرت کی آرام گاہ پر حاضر ہو کر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ یہ شخصیتیں تصرفات اور کشف و کرامات کی دُنیا سے وراء الوراء ایسے مقام پر پہنچ چکی تھیں کہ طرفۃ العین میں اٹھارہ ہزار عالم کی سیر کر لیتی تھیں۔ ان کی رُوحیں عظمتِ کبریا کے ساتھ کچھ اس طرح سے مل چکی تھیں کہ انسانی عقل و فکر اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ مادّہ پرست حضرات اپنی جگہ سچے ہیں، وہ بچارے ان باتوں کو کیا جانیں؟ سلوک کی وادی میں جب کوئی شخص داخل نہیں ہوا اُسے اس کے عجائبات کا کیا علم؟ بقول حکیم شیراز ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

---

[۱] راحت المحبین (اردو) طابع فضل دین، چنن دین، تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور۔ ص ۱۴۹

کرامت معیارِ درویشی نہیں

محبوب الٰہی دہلوی فرماتے ہیں کہ جب اولیاء اللہ شوق کے غلبات میں ہوتے ہیں تو "سکر" کے عالم میں ان سے خوارق کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن جو کامل ہیں ان سے کسی قسم کا بھید ظاہر ہونے نہیں پاتا ع

مرداں ہزار دریا خوردند و تشنہ رفتند

آگے چل کر فرماتے ہیں کہ کرامت درویشی کے لیے حجاب کا مرتبہ رکھتی ہے۔ جن لوگوں نے درویشی کا معیار کشف و کرامات مقرر کر رکھا ہے، انہیں یہ سُن کر مایوسی ہو گی کہ مستقیم الاحوال درویشوں سے خوارق اور کرامات کا اظہار بہت کم ہوتا ہے۔ اس موقع پر حضرت محبوب الٰہی نے شیخ سعد الدین حمویہؒ کی ایک دلچسپ حکایت لکھی ہے کہ آپ کے مُلک کا بادشاہ ایک دفعہ آپ کو ملنے آیا۔ حضرت کے آگے سیبوں سے بھرا ہُوا تھال رکھا ہُوا تھا۔ آپ سیب چاقو سے کاٹ کاٹ کر خود بھی کھا رہے تھے اور بادشاہ کو بھی کھلا رہے تھے۔ تھال میں ایک سیب سب سے بڑا پڑا تھا۔ بادشاہ کی نظر اُس پر پڑی تو اُس نے خیال کیا کہ اگر شیخ میں کچھ کرامت اور صفائی ہے تو وہ سیب اُٹھا کر مجھے دے گا۔

جونہی بادشاہ کے دل میں یہ خیال آیا، شیخ نے ہاتھ بڑھا کر وہ سیب اُٹھا لیا اور بادشاہ کی طرف مخاطب ہو کر اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔ فرمایا:

"ایک دفعہ مَیں سیر کرتے کرتے ایک شہر میں جا نکلا۔ وہاں ایک قلندر کو تماشا کرتے دیکھا۔ بہت سے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے، مَیں بھی چلا گیا۔ دیکھا کہ اُس نے ایک گدھے کی آنکھیں کپڑے سے باندھ رکھی ہیں۔ اسی اثناء میں قلندر نے ایک انگوٹھی جیب سے نکال کر ایک شخص کے حوالے کی اور تماشائیوں سے کہا۔ اب یہ گدھا بتائے گا کہ انگوٹھی کس کے پاس ہے۔ پھر گدھے کو پکڑ کر اس مجمع میں پھرایا۔ وہ ہر ایک کو سُونگھتا تھا اور آگے بڑھ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ انگوٹھی والے آدمی کے پاس پہنچا تو اُسے سُونگھ کر ٹھہر گیا۔ قلندر نے اس آدمی سے انگوٹھی لے لی۔"

حکایت ختم کرنے کے بعد شیخ نے بادشاہ سے فرمایا:

"اگر لوگ کرامت یا کشف دکھائیں تو اس گدھے کی مانند ہیں اور اگر نہ دکھائیں، تو تم

لوگ سمجھتے ہو کہ یہ درویش صفائی اور کرامت سے خالی ہے۔"

یہ کہہ کر سیب اس کی طرف پھینک دیا۔ بادشاہ بڑا شرمندہ ہوا۔

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر کشف و کرامات سلوک میں محمود تصور نہیں ہوتی تو پھر اکابر اولیاء اللہ سے اس قسم کے خوارق ظہور میں کیوں آئے! سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ، داتا گنج بخشؒ، شیخ الہند اجمیریؒ، شاہ یوسف گردیزا اور شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ علیہم اجمعین اس پایہ کے درویش ہیں کہ ان کی روحانی عظمت کا آج تک ان کے کسی مخالف نے بھی انکار نہیں کیا۔ ان تمام سے کشف و کرامات کا صدور ثابت ہے۔ صاحب فوائح العرفان نے صفحہ ۹۸ پر اس امر کو صاف طور پر واضح کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اگرچہ اہلِ کمال کے نزدیک کشف و کرامات کی کچھ وقعت نہیں، لیکن جو عارف مخلوق کے افاضہ اور تلقین پر مامور ہو۔ اس سے خرق عادت باتیں سرزد ہوتی ہیں۔ جن سے لوگوں کا اعتقاد اُن کے حق میں راسخ ہو۔ اس سے اُن کے کمال میں کچھ نقصان پیدا نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے سالک کے لیے جو ابھی منازلِ راہ طے کر رہا ہو۔ ظہور خرق عادت خلل کا باعث ہوتا ہے۔" حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں:۔

جو شخص ابتداء میں غلباتِ شوق کی وجہ سے اسرار ظاہر کر دے۔ وہ اس کی خام کاری ہے۔ کیونکہ جہاں تک نگہداشت کی حد ہے۔ وہاں تک اسے محفوظ رکھنا ہی چاہیئے، لیکن جب درویش دوست کے اسرار سے مالا مال ہو جائے۔ اس وقت اگر اس کی زبان سے کوئی بات نکل جائے، تو کوئی ہرج نہیں۔ کیونکہ جب جگہ ہی نہ رہے، تو وہ پھر کیا کرےؔ[1]"

امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہٗ الیواقیت والجواہر میں لکھتے ہیں کہ انبیاء معجزات سے کے ذریعے مشرکین پر غلبہ پکڑتے ہیں اور اولیاء کرامات کے ذریعے تاکہ وہ اصلاح پذیر ہو جائیں اور اطمینان حاصل کر لیں[2]

---

[1] اردو ترجمہ اسرار الاولیاء؛ [2] فَاِنَّ الْاَنْبِیَاءَ یَحْتَجُّوْنَ بِالْمُعْجِزَاتِ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ وَالْاَوْلِیَآءَ یَحْتَجُّوْنَ بِالْکَرَامَاتِ عَلٰی نُفُوْسِهِمْ لِتَصْلَحَ وَلِنُفُوْسِهِمْ لِتَطْمَئِنَّ ص ۱۳۰

حضرت امام حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سوال کیا گیا کہ صحابہ کرام سے کرامات اس کثرت سے وقوع میں کیوں نہیں آئیں۔ جتنی کہ ان کے بعد کے اولیاء کرام سے صادر ہوئیں۔ فرمایا

"صحابہ کرام کا ایمان بدرجہ غایت قوی تھا۔ اس لیے اُنہیں کرامات ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن ان کے بعد جب لوگوں کا ایمان ضعیف ہو گیا، تو اُسے تقویت دینے کے لیے اولیاء کرام سے کرامتوں کا اظہار ہوا[1]۔"

حضرت محبوب الٰہی دہلویؒ نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک پُرلطف واقعہ بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ بغداد میں قیصر رُوم کے قاصد مناظرہ کے لیے آئے۔ ہارون رشید نے امام شافعیؒ سے درخواست کی کہ آپ اُن سے بحث کریں۔

امام نے منظور فرمالیا اور کہلا بھیجا کہ کل دجلہ کے کنارے بحث ہو گی۔ دوسرے دن خلیفہ نے دجلہ کے کنارے دربار لگایا۔ روم کے قاصد تخت کے پاس آبیٹھے اور بحث کے لیے تقاضا کرنے لگے۔ اتنے میں امام صاحب بھی آپہنچے اور مسلمانوں کو سلام کر کے دریا کی طرف بڑھے چلے گئے۔ منجدھار میں سطحِ آب پر مصلّیٰ بچھایا، دوگانہ ادا کیا اور وہیں سے پُکار کر کہا کہ جس کسی نے ہم سے بحث کرنا ہو، یہاں آکر نپٹ لے۔

عیسائیوں نے جب یہ کرامت دیکھی، تو اُٹھ کر اپنی پگڑیاں گلے میں ڈالیں اور عرض کی:

"حضور! ہم نے اسلام کی حقانیت دیکھ لی۔ آپ تشریف لے آئیں تاکہ ہم معافی مانگیں۔"

آپ مصلّیٰ سے اُٹھ کر دربارِ خلافت میں حاضر ہوئے۔ سب نے قدموں میں سر رکھ دیئے۔

جب یہ خبر قیصرِ رُوم نے سُنی تو کہا:

"شکر ہے کہ امام صاحب یہاں نہیں آئے، ورنہ روم کے سارے لوگ مسلمان ہو جاتے۔"

---

[1] وقد سُئل الامام رضی اللہ عنہ لم لم یشتھر عن الصحابۃ من کثرۃ الکرامات کما وقع لمن بعدھم من الاولیاء فقال انما لم یشتھر عن الصحابۃ کثرۃ کرامات لان ایمانھم کان فی غایۃ القوۃ بخلاف ایمان من بعدھم فکلما ضعف ایمان قوم کثرت کرامات اولیاء عصرھم تقویۃً لیقین ضعفاء منھم۔ (الیواقیت والجواہر، ج ۲ ص ۱۰۳)۔

امام صاحب کی اس کرامت کو "عالم سکر" اور شوقِ غلبات سے دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ آپ نے "عالم صحو" میں ہی اس کرامت کا اظہار کیا اور یہ حقیقت ہے کہ مناظروں سے متنازع فیہ امور کے فیصلے بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر بغداد کے علماء و مشائخ ان عیسائیوں سے بحث کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ تو ان کے کئی دن اس مناظرہ کی نذر ہو جاتے۔ مگر پھر بھی یہ نتیجہ مترتب نہ ہوتا۔ شیخ الاسلام بہاء الحق والدین ابو محمد زکریا قدس سرہٗ العزیز کی کشف و کرامات بھی اسی قبیل سے ہیں۔ "عالم سکر" میں جو مکاشفات ہوئے اور جو کرامات صادر ہوئیں۔ ان کا ذکر ہم حضرت کے حالات میں ضمناً کر چکے ہیں۔ اب ہم چند اُن خوارق کا ذکر کریں گے جو "عالم صحو" میں آپ سے صادر ہوئے۔

شیخ الاسلامؒ کا مرتبہ

آپ گذشتہ اوراق میں حضرت محبوب الٰہی دہلوی کی زبان مبارک سے درویشی کی تعریف سن چکے ہیں۔ اب انہی بزرگوار سے حضرت شیخ الاسلامؒ کا مرتبہ بھی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

"شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ہفتاد ہزار علوم درویشی مرتب کردہ بود و آں جملہ را بکردار رسانیدہ بودند۔ مرتبہ ایشاں بداں غایت رسیدہ بُود کہ اگر نظر در آسمان مے کردند عظمتِ عظیم بدیدے۔ اگر نظر در زمین کردے تا تحت الثریٰ معلوم گردیدے و بارہا فرمودے کہ رتبہ درویشی ازیں بیشتر است اگر گویم شنوندگان را زہرہ آب شود و ایں ادنیٰ مرتبہ درویشی است۔"

یعنی شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے درویشی کے ستّر(۷۰) ہزار علوم طے کر لیے تھے اور ان تمام پر اپنے عمل کو حدِ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ انہیں اتنی روحانی قوت حاصل ہو چکی تھی کہ اگر آسمان کی جانب نظر اٹھاتے۔ عظمتِ عظیم بے حجاب مشاہدہ کرتے اور اگر زمین پر نظر کرتے تو تحت الثریٰ تک کی چیزیں دکھائی دینے لگتیں۔ بایں ہمہ وہ بارہا فرماتے تھے کہ درویشی کا مرتبہ اس سے بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔ اگر کہہ ڈالوں تو سننے والوں کا زہرہ آب ہو جائے۔ یہ تو درویشی کا ادنیٰ درجہ ہے۔"

جن بزرگوں کا تصوف کی دنیا میں یہ مقام ہو۔ کشف و کرامات اور خوارق عادات سے

سہارا لینے کی انہیں ضرورت ہی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کرامت کے اظہار کو حضور پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے خلفاء اور مریدوں کو بھی خوارق کے چھپانے کی ہدایت کر رکھی تھی علی کیپری آپ کا نامور مرید تھا۔ جب اس سے پیہم کرامات صادر ہونے لگیں تو آپ سخت برہم ہوئے اور اسے اپنے حلقہ سے خارج کر دیا۔ خود بھی اس بارے میں بڑے محتاط تھے۔ ایک دفعہ شیخ المشائخ فریدالدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ شریک سفر تھے۔ اچانک شام کے وقت کسی ایسے دریا پر جا پہنچے، جہاں کشتی وغیرہ کا انتظام نہ تھا۔ حضرت گنج شکرؒ بلا تامل آگے بڑھے اور سطح آب پر چلنے لگے۔ لیکن حضرت شیخ الاسلامؒ دل سے فتویٰ لینے کے لیے رک گئے کہ کرامت کا اظہار کروں یا نہ کروں۔

حضرت گنج شکرؒ نے کشف کے ذریعے حضرت کے اس تردد کو معلوم کر لیا۔ فرمایا:

"بھائی صاحب! یہ مقام بے حد خطرناک ہے۔ چوروں کا مسکن ہے۔ یہاں کرامت کے اظہار میں کوئی حرج نہیں، بلا تکلف چلے آئیے۔" یہ سن کر حضرت نے بھی سطح آب پر قدم رکھا اور طرفۃ العین میں دریا عبور کر گئے۔

اسرارِ دوست فاش مکن

حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی بابت حضور کو اطلاع پہنچی کہ آپ سے مسلسل کرامات کا اظہار ہو رہا ہے[1] آپ نے فوراً ان کے نام خط لکھا:

"اے درویش! یہ کیا نادانی ہے کہ دوست کے راز ظاہر کر رہا ہے۔ یہ بات اہلِ اسرار کے لیے ٹھیک نہیں۔"

حضرت گنج شکرؒ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"بھائی جان! کام گفتگو سے گذر گیا۔ میرا سینہ اسرارِ محبوب سے اس قدر پُر ہو چکا ہے کہ ذرہ بھر جگہ خالی نہیں رہی۔ اب ہو تو گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے عالمِ انوار سے جو اسرار متجلّی ہوتے ہیں، وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اے بھائی! میں تو بڑی

---

[1] اردو ترجمہ اسرار الاولیاء مرتبہ خواجہ بدر اسحاقؒ، ص ۱۵

کوشش کرتا ہوں کہ محفوظ رکھوں اور ذرہ بھر ظاہر نہ کروں۔ لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ مَیں کیا کروں"؟

جب یہ خط شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچا، تو آپ نے سر جھکا لیا اور فرمایا:

"یارِ من! کارِ خویش بکمال رسانیدہ۔"

یعنی ہمارے یار نے اپنا کام انجام تک پہنچا لیا۔

عبداللہ رُومی

اسی طرح ایک دفعہ ملتان میں عبداللہ نامی رُوم سے کوئی درویش آیا۔ شہر بھر میں اس کی کرامتوں کا چرچا ہونے لگا۔ حضور کو علم ہوا تو حیران ہو کر فرمایا:

"یہ شعبدہ باز کہاں سے ٹپک پڑا"؟

خود بنفسِ نفیس اس کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمایا:

"کھڑے ہو کر دوگانہ ادا کرو، مَیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم نماز کس طرح پڑھتے ہو"؟

شیخ عبداللہ آپ کی شخصیت سے متاثر ہو کر کھڑے ہو گئے اور دوگانہ ادا کیا۔ مگر دو قدموں کے درمیان فاصلہ ذرا زیادہ رکھا۔

آپ نے فرمایا:

"دوبارہ پڑھو! قدموں کا فاصلہ زیادہ ہے۔"

وہ دوبارہ پڑھنے کے لیے کھڑا ہُوا۔ مگر اس نے جتنی کوشش کی، قدموں کے فاصلہ کو درست نہ کر سکا اور اس کی ساری شیخی کرکری ہو کر رہ گئی۔

آپ نے فرمایا:

"اُچ[1] تشریف لے جائیے اور وہاں قیام کیجئے۔"

چنانچہ عبداللہ رومی وہاں چلے گئے اور آپ کی توجہ سے بڑے مرتبہ پر پہنچے۔

---

[1] "اُچ" ریاست بہاولپور میں ستلج اور چناب کے سنگم پر قدیم تاریخی شہر ہے۔ جہاں شیخ الاسلامؒ کے محبوب خلیفہ سید جلال بخاری قدس سرہٗ کا خاندان آباد ہے۔

درویشی کی نعمت سلب کرلی

محبوب الٰہی دہلوی فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ شریعت کے معاملے میں بڑے متشدد تھے۔ ان کے زمانے میں علی کھیری نامی ایک شخص ہو گزرا ہے۔ جس درویش میں عشق اور ورد نہ ہوتا۔ یہ اُس کا معتقد نہ ہوتا۔ خواہ وہ کتنا زاہد اور عابد کیوں نہ ہوتا۔ علی برملا کہہ دیتا کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ اس میں عشق نہیں۔ اس کی زبان سے بات تک درست نہیں نکل سکتی تھی۔ اس لیے عشق کو "اشک" کہتا تھا۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کی شہرت سُن کر حاضر ہوا اور جو کچھ سُن کر آیا تھا، اس سے زیادہ پایا۔ دلی عقیدت سے مُرید ہو گیا۔ حضرت نے اُسے اوراد و وظائف تلقین کئے اور وہ شہر کے باہر جا کر ایک حجرے میں معتکف ہو گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک دفعہ حضرت شیخ الاسلامؒ سیر کرتے ہوئے اس کے پاس چلے گئے اور دورانِ گفتگو میں علی کھیریؒ نے مٹی کا ڈھیلہ زمین پر دے مارا، جس سے وہ زرِ خالص بن گیا۔ حضرت شیخ الاسلام نے فوراً آنکھیں بند کرلیں اور فرمایا:

"یا غفور! یا غفور!! یا غفور!!! علی! تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا"

یہ کہہ کر آپ لوٹ آئے۔

دوسری مرتبہ جب ملنے گئے، تو شام کا وقت تھا۔ علی کھیریؒ نے چراغ کو ذرا سا اشارہ کیا، وہ جگمگا اُٹھا۔ شیخ الاسلامؒ کو ملال پیدا ہوا کہ یہ عجیب آدمی ہے، جو مجھے بھان متی کے تماشے دکھا رہا ہے۔ فرمایا!

"علی! شاید تجھے نفس امارہ نے لے لیا ہے!"

یہ کہہ کر آپ چلے آئے۔ لیکن علی کھیری کا بُرا حال ہوا۔ واقعی اُسے نفسِ امارہ نے شکنجہ میں کس لیا۔ وہ طرح طرح کے مکروہات میں پھنس گیا۔ منجملہ ان کے ایک جوع البقر کا عارضہ تھا کہ کھاتے کھاتے پیٹ نہ بھرتا۔ نہ عبادت میں لُطف آتا اور نہ ہی وہ ذوق و شوق باقی رہا۔ ناچار تنگ آکر بنگال کا رُخ کیا۔ یہاں حضرت سید جلال الدین تبریزیؒ مقیم تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا حال عرض کیا۔

آپ نے فرمایا: بھائی! جب تک تمہارے واسطے شیخ الاسلام اجازت نہ دیں، بندہ

دُعا نہیں کر سکتا۔

علی کھیری کو اس جواب سے سخت مایوسی ہوئی کہ اتنے دُور دراز کے فاصلے پر جانے کو کون تیار ہو گا؟

شیخ نے ایک کاغذ پر لکھا

"رانندۂ آں برادر بآمدہ است۔ اگر رخصت آں برادر باشد در حقِ اُو دُعا کنیم"[1]

اس خط کو حضرت نے مصلّے کے نیچے رکھ دیا اور کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ادا کی، پھر مصلّیٰ اُٹھا کر دیکھا، تو اس کی پُشت پر یہ الفاظ مرقوم تھے۔

"چوں بطرفِ شما رفتہ است اگر ازاں فعل توبہ کند در حقِ او دُعا بکنید"[2]

شیخ جلال الدین نے پوچھا:

"اے علی! توبہ کرتے ہو؟"

عرض کی:

"ہاں! قبلہ توبہ کی"

اس پر شیخ نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور علی کھیری خواجہ علی ہو گیا۔[3]

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کشف و کرامات کے سلسلہ میں کس قدر محتاط تھے۔ آپ سے جو خوارق صادر ہوئے، وہ اس کتاب کے مختلف اوراق میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہم نے انہیں اپنے اپنے محل اور موقع پر درج کیا ہے۔ کئی یہاں پیش کر رہے ہیں۔ ان سب کی نوعیت جُداگانہ ہے۔ آپ غوثِ زماں تھے۔ کئی خوارق آپ کے منصب سے متعلق ہیں۔ بعض خلق کے افاضہ اور تلقین سے تعلق رکھتے ہیں۔ کئی ایسے اسرار ہیں جو بحرِ وحدت میں ٹھاٹھ آجانے کے سبب شوقِ غلبات میں بے اختیار ظاہر ہو گئے۔ بعض ایسے ہیں، جن سے حضرت خضر علیہ السلام کی طرح محض حکمِ الٰہی کی تعمیل مقصود تھی۔ چنانچہ خواجہ بدر اسحاق رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] بھائی کا راندہ ہُوا یہاں آیا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اس کے حق میں دُعا کی جائے۔

[2] چونکہ آپ کی طرف آیا ہے۔ اگر وہ اس فعل سے توبہ کرے تو اس کے لیے دُعا فرمایئے۔

[3] خلاصۃ العارفین، اردو مطبوعہ نولکشور پریس لاہور، ص ۴۵-۴۶۔

نے اسرار الاولیاء میں حضرت گنج شکر قدس سرہُ العزیز کی زبانی ایک واقعہ درج کیا ہے[1] جس سے اس امر کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے ۔ فرماتے ہیں :

آتشِ دوزخ حرام

ایک مرتبہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا نے غلباتِ شوق میں یہ منادی کرادی کہ "آج جو شخص میرا منہ دیکھ لے گا۔ میں ضامن ہوں کہ قیامت کے دن اسے دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا"

جب یہ آواز اہلِ اشتیاق نے سُنی تو گروہ در گروہ آپ کی زیارت کو جمع ہوئے۔ یہاں تک کہ خانقاہ کا صحن لوگوں سے بھر گیا۔ اس وقت عوام کی سہولت کے لیے آپ نے سواری کا گھوڑا طلب کیا اور سوار ہو کر شہر کو روانہ ہُوئے ۔ اعلانچی ہر طرف دوڑ پڑے اور جگہ جگہ اس امر کا ڈھنڈورا پٹ گیا۔ تمام شہر اپنا کاروبار چھوڑ کر حضرت کی زیارت کو دوڑا۔ آپ پر عجیب حالت طاری تھی۔ چہرہ مبارک چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا اور حق بین نگاہیں جمالِ یار کے عکس کو منعکس کر رہی تھیں۔ آپ ایک ایک سے بڑے تپاک کے ساتھ مصافحہ کرتے اور فرماتے :

"اے بھائی ! خدا کی قسم ! قیامت کے دن تم دوزخ میں نہیں جاؤ گے "

رہ رہ کر ارشاد ہوتا :

"ہاں بھائی ! جب خداوند کریم نے اپنی مخلوق پر اس قدر انعام کیا ہے ، تو مَیں بخل کیوں کروں "؟

ضعیفی اور عالمِ پیری کے باوجود شیخ الاسلامؒ نے شہر کے تمام بازاروں کے چکر کاٹے اور محتاجوں اور بوڑھے آدمیوں کے ہاں خود چل کر پہنچے اور انہیں اپنی زیارت کرائی ۔

اس وقت دوست نے ایک راز کے ظاہر کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسے کون چھپاتا ۔

شیخ سعد الدین حمویہ کا جنازہ

حضرت گنج شکرؒ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ مَیں اور برادرم مولانا بہاء الدین زکریا ایک ہی جگہ بیٹھے تھے اور سلوک کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ دفعتہً آپ کھڑے ہو گئے اور ہائے ہائے کر کے رونے لگے۔ بار بار" اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھتے اور زار زار روتے تھے ۔

"مَیں نے پُوچھا۔ بھائی ! یہ کیا حالت ہے"؟

[1] اردو ترجمہ اسرار الاولیاء ، طابع فضل دین۔ چنن دین تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور، ص ۱۵ ::

فرمایا :

"اُٹھ کر دیکھ !"

مَیں نے کھڑے ہو کر نگاہ کی، تو بغداد کو سامنے پایا اور دیکھا کہ لوگ دروازہ کے باہر شیخ سعد الدین حمویہؒ کا جنازہ پڑھ رہے ہیں ۔[1]

آپ کے مرید کو آسمان سے عیدی ملی

آپ کے مریدوں میں ایک صاحب بدر سجستانیؒ تھے۔ وہ لاہور میں رہتے تھے۔ ایک دن عید پڑھنے کے لیے عیدگاہ کو تشریف لے گئے۔ جب نماز ختم ہوئی، تو آپ نے آسمان کی طرف مُنہ کیا اور ہاتھ اُٹھا کر عرض کی :

"خداوند ! ہر غلام اپنے مالک سے عیدی مانگتا ہے اور مَیں تجھ سے عیدی مانگتا ہوں ۔"

بیک عمر در نعمت زیستم ! گدائے درت نیستم کیستم
اگر ہست نمائے از ویک سرم وگرنہ بحرماں مراں از درم
غیر از تو دگر درے ندارم
دریاب کہ دیگرے ندارم

جب دُعا کے الفاظ ختم ہوئے۔ ایک حریر کا ٹکڑا سبز خط سے لکھا ہوا آسمان سے نازل ہوا۔ کھول کر دیکھا تو اُس پر درج تھا۔

"ہم نے اس عید سعید کی خوشی میں تجھ پر دوزخ کی آگ حرام کی ۔"

عیدگاہ لاکھوں آدمیوں سے پٹی پڑی تھی ۔ یہ کرامت دیکھ کر لوگ آپ کی طرف لپکے اور آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دینے لگے ۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا :

"حضرت ! مجھے بھی عیدی ملنی چاہیئے ؟"

---

[1] اردو ترجمہ "اسرار الاولیاء" شیخ سعد الدین حمویہؒ بڑے پایہ کے بزرگ تھے ۔ ان کی ایک دلچسپ حکایت درج ہو چکی ہے ، صفحہ ۱۲ ۔ طابع فضل دین چنن دین ، تاجرانِ کتب کشمیری بازار لاہور ۔

شیخ نے حریر کا وہی ٹکڑا اُس کے حوالے کر دیا کہ یہ عیدی تجھے مبارک ہو۔ قیامت کے دن میں جانوں اور آتشِ دوزخ ؎

اگر بخشے تو زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

سبحان اللہ! جس کے ادنیٰ مریدوں کے فضل و کمال کی یہ کیفیت ہو، اس کے اپنے مراتب کا کیا کہنا۔

بناوٹی سیّد کو دُگنی نذر

حضرت شیخ الاسلامؒ کا معمول تھا کہ اگر کوئی غریب الحال سیّد ملنے کو آتا، تو ایک خلعت اور سات اشرفی مرحمت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قحط کے ایّام تھے۔ ملتان کے مضافات کا کوئی کمہار حاضر ہُوا اور عرض کی کہ "مَیں غریب سیّد ہوں، بھُوکا مر رہا ہوں۔ خدا کے لیے مدد فرمائیے۔"

جونہی اس شخص نے اپنی گفتگو ختم کی، حضرت سرو قد کھڑے ہو گئے، بڑے ادب سے اُسے اپنی مسند پر لاکر بٹھایا اور غلام کو حکم دیا کہ چودہ اشرفیاں اور دو فاخرہ خلعتیں آپ کو پیش کرو۔"

تمام خدام اور احباب تعجّب سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس وقت تو ادب سے کچھ عرض نہ کر سکے۔ جب کمہار اشرفیاں اور فاخرہ خلعتیں لے کر چلا گیا، تو ایک خادم نے بڑھ کر عرض کی:

"حضور! یہ تو فلاں گاؤں کا کمہار ہے۔ جھوٹ بول کر حضرت سے اس قدر مال لے گیا۔"

حضرت نے فرمایا:

"تم ٹھیک کہتے ہو، مجھے بھی یہ بات معلوم تھی۔ لیکن جب وہ میرے سامنے پیش ہُوا۔ اُس کے سر پر رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلّم کا بابرکت ہاتھ تھا۔ اس وقت مَیں نے آنحضرت کی ہی تعظیم کی تھی اور اسی وجہ سے عام سادات کے مقابلے میں اُسے دُگنی نذر پیش کی۔"

نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایک مرتبہ حضور ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کو دیکھنے گئے۔ چوک میں ایک سوداگر غلاموں کو فروخت کر رہا تھا۔ اُس نے چبوترے پر چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچنے کے لیے کھڑی کر رکھی تھیں۔ آپ نے منشی کو حکم دیا کہ گھر کے لیے ایک لڑکی خرید لو۔ چنانچہ ایک قبول صورت اور ہونہار لونڈیا خرید لی گئی۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے محل میں ایسی بیسیوں خادمائیں پہلے سے موجود تھیں۔ یہ بھی اُن کے ساتھ گھُل مِل گئی۔

دن گذرتے چلے گئے۔ لونڈیا جوان ہو کر بڑی حسین نکلی۔ اس زمانے میں غلاموں کی ہی حکومت تھی۔ خاندانی اونچ نیچ کی گنجائش تک نہ تھی اور پھر شیخ الاسلامؒ کے گھرانے میں جہاں محض اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ کا دَور دورہ تھا اور یہ بھی اسی محلسرا کی شان تھی کہ خادمائیں چکی پر سے قرآن ختم کر کے اُٹھتی تھیں اور کئی ان میں ایسی باکمال عارفہ تھیں جن کا سارا وقت ذکر اذکار میں گزرتا تھا۔ بڑی بیگم لونڈیا کے حسن وجمال اور سگھڑ پنے کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں یہ سوچ بیٹھتی تھیں کہ ممکن ہے حضرت شیخ الاسلام (رحمۃ اللہ علیہ) نے اُسے اپنے کسی لڑکے کے لیے خریدا ہو، چنانچہ ایک دن کسی موقع سے اس کا ذکر حضرت شیخ الاسلام سے کر بیٹھیں۔

"کیا جوان ہو چکی ہے وہ لونڈیا؟"

حضرت نے فکرمند ہو کر پُوچھا:

"اچھا آج کھانا اُسی کے ہاتھ بھجوانا۔"

چنانچہ دوپہر کو جب حضرت شیخ الاسلام محل سرائے میں تشریف لائے، تو بڑی بیگم نے لونڈیا کو بُلا کر حکم دیا کہ حضرت کی خدمت میں کھانا لے جاؤ۔

لونڈیا کو اس سے پہلے کبھی حضرت شیخ الاسلامؒ کی بارگاہ میں حاضری دینے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ وہ خوانچہ اُٹھائے بڑے ادب سے پاؤں پر پاؤں رکھتی، دولت خانے میں داخل ہُوئی۔ حضرت کی صاحبزادیاں اور پوتیاں پہلے سے حضور کے گرد جمع تھیں۔ حضرت ان سے دل لگی کر رہے تھے۔ لیکن جونہی خادمہ پر نظر پڑی، دفعتہً سنجیدہ ہو گئے۔ ایک،

بار پھر لونڈیا کو دیکھا۔ خوفِ الٰہی سے بدن مبارک پر پسینہ آگیا اور خدا ترس نگاہوں سے آنسوؤں کے قطرات ٹپک پڑے۔ صاحبزادیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو وہ گھبرا گئیں۔ بڑی بیگم کو اطلاع ہوئی وہ ہانپتی کانپتی تشریف لائیں۔

ابھی تک خادمہ کھانے کا خوان اُٹھائے کھڑی تھی اور اسی طرح حضرت شیخ الاسلامؒ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہہ رہی تھی اور بچیاں سہمی ہوئی ایک طرف دُبکی بیٹھی تھیں۔ بڑی بیگم نے قریب پہنچ کر ادب سے پوچھا:

"حضور! یہ کیا حالت ہے؟ لونڈیا کبھی کی کھانا لیئے کھڑی ہے۔ کھانا تناول فرمایئے۔"

حضور نے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا:

"بیگم کیا بتاؤں؟ زکریا کے گھر میں ایک لڑکی پلے پوسے، عمر گزارے اور پھر دوزخ کا ایندھن بنے۔ اس سے زیادہ میری بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔"

لونڈیا بڑے غور سے حضور کی تقریر سُن رہی تھی۔ جب اُسے اپنی بابت یہ انکشاف ہوا تو اُس کے ہاتھ سے کھانے کا طبق گر گیا اور وہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ خادمائیں دوڑ کر آگئیں۔ کسی نے جگہ صاف کی اور کئی اس لونڈیا کو اُٹھانے لگیں۔

بڑی بیگم نے پھر حضرت کی خدمت میں عرض کی:

"حضور والا! آپ زمانہ کے غوث ہیں۔ اس لونڈی کے لیے دعا فرمائیں۔ ممکن ہے اللہ میاں اس کی تقدیر بدل دیں۔"

حضرت نے فرمایا:

"اے نیک بخت! خدا کی مشیت میں دخل دینا فقراء کا کام نہیں۔ تجھے کچھ علم ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے اپنے پیارے بیٹے کی نجات کے لیے دعا مانگی تھی، تو انہیں کیا جواب ملا تھا؟"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک خادمہ نے آکر عرض کی:

"حضور! اجودھن سے حضرت فریدالدین تشریف لائے ہیں۔ فرماتے ہیں دوزخن

لونڈیا کو میرے پاس بھیج دو "

یہ سُنتے ہی آپ کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا فرمایا :

" میرا بھائی آگیا۔ لونڈیا کو جلدی بھیجو، وہ نجات کی کوئی راہ ضرور نکال لیں گے "

خادمائیں لونڈیا کو حضرت گنج شکرؒ کی خدمت میں لے گئیں۔ آپ نے فرمایا :

" اے لونڈیا ! پانی کا کُوزہ بھر لا "

خادمہ پانی کا آفتابہ بھر لائی۔ آپ نے اُسے ہاتھوں پر بہا دیا۔ فرمایا :

" اور بھر لا "

لونڈیا دوسری بار کُوزہ بھر لائی۔ آپ نے اُسے بھی اسی طرح ہاتھوں پر بہا دیا اور فرمایا !

" اور کُوزہ بھر لا "!

لونڈیا تیسری دفعہ کُوزہ بھر لائی۔ آپ نے اُس سے وضو کیا اور فرمایا :

" جا مبارک ہو ! خُدا نے تجھے دوزخ سے نجات دی "

لونڈیا دوڑتی ہوئی شیخ الاسلامؒ کی خدمت میں پہنچی۔ آپ اُسے دیکھتے ہی سجدے میں گر گئے اور خداوند کریم کا بڑا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد باہر تشریف لا کر حضرت گنج شکرؒ سے ملے اور فرمایا :

" بھائی ! تو نے کمال کیا، تین کُوزوں سے لونڈیا کی قسمت بدل ڈالی "

حضرت فریدالدینؒ نے مُسکرا کر عرض کی :

" ہاں بھائی ! آج طبیعت ذرا اُداس تھی۔ آپ کے گھر کا حال معلوم کرنا چاہا۔ مراقبہ میں سر جھکایا ہی تھا کہ حزن و ملال کا نقشہ نظروں میں پھر گیا۔ آپ کی محتاط طبع کا تو علم تھا، اس لیے افتاں و خیزاں اپنے آپ کو یہاں پہنچایا۔ الحمد للہ ! کہ محنت بر آئی اور پانی کے چند چھینٹوں نے ہی اس لونڈیا کی لوحِ تقدیر کو صاف کر دیا "

جہاز کو غرق ہونے سے بچا لیا

شیخ الاسلامؒ کے ایک مرید خواجہ کمال الدین مسعود شیروانی بہت مالدار سوداگر تھے اور اکثر

جواہرات کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ادرن سے بندرگاہ عدن کی طرف روانہ ہوئے ابھی آدھا سفر طے کیا تھا کہ سمندر میں ہولناک طوفان آگیا۔ جہاز کا مستول ٹوٹ گیا۔ پانی کی لہریں جہاز کے اُوپر سے گذرنے لگیں۔ قریب تھا کہ جہاز ڈوب جائے۔ اس وقت خواجہ کمال الدین انتہائی عاجزی سے شیخ الاسلامؒ کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کی:

"اسے پیر دستگیر المدد! المدد!"

خدا کے حکم سے اسی وقت شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ جہاز پر ظاہر ہوئے اور اہلِ جہاز کو نجات کی خوشخبری دے کر غائب ہو گئے۔ آناً فاناً ہوا بند ہو گئی۔ طوفان تھم گیا اور جہاز بندرگاہ عدن میں صحیح سلامت[1] آپہنچا۔ تمام اہلِ جہاز یہ کرامت دیکھ کر متحیّر ہوئے اور سوداگروں نے اپنا تہائی مال نہایت محبّت اور اخلاص سے خواجہ کمال الدین کے سپرد کیا کہ مُلتان میں شیخ الاسلام کی خدمت میں پہنچا دیں۔ خواجہ کمال الدین نے وہ مال لے کر اور نصف جواہر اپنے شامل کر کے خواجہ فخر الدین گیلانی کی معرفت ملتان بھجوائے۔

خواجہ فخر الدین، خواجہ کمال الدین کے بھانجے تھے اور نہایت متورّع اور دیانت دار شخص تھے۔ قطع مسافت کے بعد مُلتان پہنچے۔ انہوں نے شیخ الاسلام کو پہلی بار صرف تختۂ جہاز پر دیکھا تھا۔ اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو حضرت کو اُسی صورت اور لباس میں دیکھ کر زیادہ معتقد ہوئے اور تمام زر و جواہر جو کہ ستّر لاکھ روپے کی مالیت کے تھے بطور نذر کے پیش کئے۔ حضرت شیخ الاسلام نے وہ مال تین روز کے عرصہ میں مساکین اور فقراء میں تقسیم کر دیا۔ خواجہ فخر الدین حضرت کی فیاضی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا تمام مال و اسباب شیخ کی نذر کر کے حضرت کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور تھوڑے سے عرصے میں ہی واصلانِ حق سے ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ حضرت خواجہ کم و بیش پانچ سال تک حضرت کی صحبت میں رہے۔ اُنہیں شیخ الاسلامؒ کے فرزندِ اکبر سلطان العارفین شیخ صدر الدینؒ سے

---

[1] اب تک پاکستان کے ملاحوں میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ جب کشتی کہیں بھنور میں پھنس جاتی ہے تو وہ "مدد بہاء الحق!" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے وہ خطرہ ہٹ جاتا ہے۔

زیادہ محبت تھی۔ اکثر وقت ان کی خدمت میں گزرتا تھا۔ اس کے بعد اجازت لے کر زیارتِ بیت اللہ کے ارادے سے ارضِ پاک کو روانہ ہوئے اور جدہ پہنچ کر رحمتِ حق سے واصل ہوئے۔ مولانا جمالی لکھتے ہیں کہ اب تک ان کا مقبرہ سمندر کے کنارے موجود ہے اور مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ مولانا جمالی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"چوں بمقام جدہ رسید۔ برحمتِ حق پیوست۔ آلان مقبرہ متبرکہ او در کنار دریا هم در مقام فرخندہ جام جدہ است و اغلب وقت اکثر مردم بداں خطیرہ مکرمہ توجہ دارند۔ و نذر و شکرانہ مے آرند"[۱]

پیاسوں کو پانی پلایا

ایک دفعہ شیخ الاسلامؒ کے چند ارادت مند بغداد سے ملتان چلے آتے تھے۔ اتفاق سے وہ ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں آپھنسے، جہاں انہیں پانچ روز تک پانی نہ ملا۔ پیاس سے سخت بدحواس ہوئے اور قریب تھا کہ ہلاک ہو جائیں۔ موت و حیات کی اسی کش مکش کے اندر انھوں نے شیخ الاسلام کا نام لے کر پکارا۔ اسی اثناء میں ایک درویش نمودار ہوا اور انہیں کوزہ سے پانی پلا کر چلا گیا۔ انہیں حضرت شیخ الاسلام کی زیارت کا پہلے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جب ملتان پہنچے، تو دیکھا کہ جس درویش نے لق و دق صحرا میں پانی پلایا تھا۔ وہی شیخ الاسلامؒ کے نام سے مسندِ ارشاد پر بیٹھا خلقِ خدا کو صراطِ المستقیم پر گامزن کر رہا ہے۔ بے اختیار اپنی ٹوپیاں اُتار کر حضور کے قدموں میں ڈال دیں۔

درویش ہلاک ہو گیا

محبوب الٰہی دہلوی فرماتے ہیں۔[۲] ایک روز کوئی درویش حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کی خدمت میں حاضر ہو کر شرفِ بیعت سے مشرف ہوا۔ اس نے التماس کی کہ حضور! مجھے کوئی ایسی نعمت عطا فرمائیں کہ ملتان سے دہلی تک میری آنکھوں کے سامنے کوئی حجاب نہ رہے۔ حضور

۱۔ خلاصۃ العارفین، مطبوعہ قومی کتب خانہ۔ لاہور، ص ۳۷، ۳۸۔

۲۔ خلاصۃ العارفین اردو، ص ۲۹۔

نے فرمایا: جاؤ یہ چلّہ کرو۔ جب یہ چلّہ پُورا ہوگیا تو ملتان سے دہلی تک اس کی نظروں میں کوئی حجاب نہ رہا۔

اس نے پھر آکر التماس کی اب میں چاہتا ہوں کہ فرش سے عرش تک میری نظروں میں کوئی حجاب نہ رہے۔ حضرت نے فرمایا:

"ایک چلّہ اور پُورا کرو۔"

جب پُورا ہوگیا تو واقعی کوئی حجاب نہ رہا، تمام زمین اس کے سامنے تھی اور وہ ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ تحت الثریٰ سے عرشِ معلیٰ تک تمام اشیاء اور انوار و برکات بے حجاب نظر آرہی تھی۔ اس نے حاضر ہو کر یہ کیفیت عرض کی۔ فرمایا:

"بس کر! اتنا کافی ہے۔"

لیکن درویش نے اس پر قناعت نہ کی۔ عرض کی:

"حضور! اب میں چاہتا ہوں کہ حجابِ عظمت تک کا مکاشفہ حاصل ہو!"

درویش کے اس مطالبے سے جبینِ غوثیت پر شکن آگئی۔ ناراض ہو کر فرمایا:

"ایسا نہ کہو! ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔"

ابھی زبانِ مبارک سے یہ فقرہ ادا بھی نہ ہُوا تھا کہ درویش نعرہ مار کر گر پڑا اور وہ جاں بحق ہو گیا یعنی واقعی وہ درویش جمالِ حقیقی کے مشاہدہ کی تاب نہ لا سکا اور حسنِ ازل کی شمع پر پروانہ وار تصدق ہو گیا۔

قلندروں نے سر قدموں پر رکھ دیا

ایک مرتبہ چند دلق پوش قلندر شیخ الاسلام کے آستان قدس پر آئے۔ ایک ناشائستہ ہجوم ان کے ساتھ تھا۔ آپ اس وقت خلوت خانہ میں خواص کی تلقین و افاضہ میں مصروف تھے۔ انہوں نے بے ہنگم سا شور برپا کر دیا۔ خدام خانقاہ نے انہیں شور کرنے سے روکا۔ جب یہ باز نہ آئے تو حضرت کو اطلاع کی۔ آپ نے فرمایا:

"دروازہ بند کر دو۔"

خانقاہ کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ انہوں نے دروازے پر اینٹیں مارنی شروع کیں۔ آپ

کو علم ہُوا، تو خلوت خانہ سے باہر نکل آئے اور بڑے جوش میں فرمایا :

"میں یہاں خود تو نہیں بیٹھا، مجھے شیخ شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بٹھایا ہے، مجھے مردِ خدا نے یہاں بٹھایا ہے۔ دروازہ کھول دو۔"

جب کھولا گیا تو قلندروں نے سر قدموں پر رکھ دیا اور واپس[1] چلے گئے۔

ایک اور کرامت

ایک مرتبہ حضرت مجلس میں تورات کی ایک حکایت بیان فرما رہے تھے۔ اتفاق سے تورات کا کوئی عالم بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ اس نے اس واقعہ کی صحت سے انکار کیا۔ شیخ الاسلامؒ نے غیب سے تورات کا ایک صحیفہ برآمد کر کے اس کے حوالے کیا۔ اس نے کھول کر دیکھا تو یہ واقعہ اسی طرح درج تھا، جیسے حضور نے فرمایا[2] تھا۔

کرامت از درویشاں مطلب

لاہور کے قریب دریا کے کنارے حضرت شیخ الاسلامؒ کا ایک مُرید رہتا تھا۔ کچھ زمین اُسے معافی کے طور پر ملی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ حاکم پنجاب کا تحصیلدار ادھر سے گزرا اور اس درویش کی زمین پیمائش کرنے لگا۔ بولا :

"اتنے سالوں سے تو سرکار کا محصول غصب کئے بیٹھا ہے۔ اب کوئی کرامت دکھا ورنہ سب کھایا ہُوا مال اگلوایا جائے گا۔"

اس درویش نے بڑی منت سماجت کی کہ فقیروں سے نہ اُلجھ اور کرامات کا مطالبہ نہ کر[3] لیکن تحصیلدار اپنی ضد پر اڑا رہا۔ لوگوں نے بھی ہر چند سفارش کی، مگر کوئی کارگر نہ ہوئی۔ انجام کار درویش نے کہا :

"آپ مجھ سے کیسی کرامت چاہتے ہیں ؟"

---

[1] اردو ترجمہ، فوائد الفوائد، جلد اوّل صفحہ ۹۴۔ مرتبہ حضرت امیر حسن علی سجزی رحمۃ اللہ علیہ۔

[2] خلاصۃ العارفین، مطبوعہ قومی کتب خانہ، لاہور، ص ۴۶، ۴۷۔

[3] از فقراء بگذر و کرامات از درویشاں مطلب (اسرار الاولیاء، ص ۱۲)

تحصیلدار نے کہا، اگر تُو صاحب کرامت ہے تو پانی پر چل۔ درویش دریا کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ پڑھ کر اپنے پیرِ طریقت شیخ الاسلام کو یاد کیا اور دریا سے اس طرح گزر گیا جیسے کوئی خشک زمین پر چلتا ہے۔ تحصیلدار خدا کی قدرت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ جب درویش دُوسرے کنارے پر پہنچا تو آواز دی کہ "کشتی بھیجو تاکہ واپس آؤں"۔

کہا "جیسے گئے تھے، ویسے واپس کیوں نہیں چلے آتے"۔

فرمایا "اس نفسِ شوم سے ڈرتا ہوں کہ کہیں اس میں عجب اور نخوت پیدا نہ ہو جائے"۔

چنانچہ وہ درویش کشتی پر سوار ہو کر واپس آیا۔

دست بایں بے دست بدہ! ایک دفعہ حاکمِ وقت نے کسی قصور پر ایک شخص کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ وہ شخص عرصہ تک شیخ الاسلام کی خدمت میں حاضر رہا۔ ایک دن اس کی یہ حالت دیکھ کر حضور کو بڑی رقت ہُوئی۔ اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

"اگر کوئی آرزو ہو تو بیان کر"؟

اس نے دونوں کٹے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ نے آسمان کی طرف نظر کی اور عرض کی:

"دست بایں بے دست بدہ"

اسی وقت اس کے دونوں ہاتھ درست ہو گئے۔

کتابیں جل گئیں مولانا صدر الدین کوفیؒ[1] روایت کرتے ہیں کہ مَیں ایک مرتبہ مولانا نجم الدین سنامی کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ انہوں نے سوال کیا:

"آج کل کیا شغل ہے"؟

مَیں نے عرض کی "تفسیر کا مطالعہ کر رہا ہوں"۔

فرمایا "کون سی تفسیر؟"

عرض کی "کشاف۔ ایجاز اور عمدہ"۔

---

[1] منقول از محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء (فوائد الفواد) ص ۸۹، ۹۰۔ مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور۔

فرمایا "کشاف اور ایجاز کو آگ لگاؤ۔ عمدہ تیرے لیے کافی ہے۔"

مجھے یہ امر ناگوار گزرا۔ پوچھا "کیوں ؟"

فرمایا "شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ اسی طرح فرماتے ہیں۔"

مجھے یہ بات اور بھی ناگوار گزری۔ جب رات ہوئی۔ چراغ جلا کر تینوں کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔ ایجاز اور کشاف نیچے تھیں اور عمدہ اوپر۔ اسی اثنا میں نیند آگئی۔ اچانک شعلہ پیدا ہوا، آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ کشاف[1] اور ایجاز تو جل گئی ہیں۔ لیکن عمدہ سلامت ہے۔

زمخشری کا حشر

حضرت محبوب الٰہی دہلوی فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلامؒ کے بڑے صاحب زادے حضرت صدر الدین عارف نحو مفصل پڑھنے کے آرزومند تھے۔ قبلہ گاہ سے اجازت طلب کی۔ فرمایا: آج رات صبر کرو، صبح کو فیصلہ کریں گے۔

جب رات ہوئی شیخ صدر الدین نے خواب دیکھا کہ ایک شخص کو زنجیروں میں جکڑے لیے جارہے ہیں۔ پوچھا

"یہ کون ہے؟"

کہا۔ یہ مفصل کا مصنف زمخشری ہے، اسے دوزخ[2] میں لیے جارہے ہیں۔

عبد اللہ قوال کو ڈاکوؤں سے بچا لیا

مولانا جمالیؒ "سیر العارفین" میں لکھتے ہیں کہ ایک عبد اللہ نامی شیریں مقال اور خوش کلام قوال روم سے ملتان آیا۔ اور حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں قدم بوس ہو کر عرض کی کہ شیخ الشیوخ نے مجھ سے قوالی سنی ہے آپ بھی سنیں۔

حضرت نے فرمایا:

"اگر شیخ الشیوخ نے تجھ سے قوالی سنی ہے تو زکریاؒ بھی سنے گا۔"

عبد اللہ کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔ رات ہوئی تو ایک شخص سے فرمایا کہ عبد اللہ اور اس

---

[1] صاحب کشاف کا عقیدہ باطل تھا۔ [2] فوائد الفواد، ص ۸۹

کے ساتھی کو حُجرے میں لے چلو۔ تیسرا کوئی شخص نہ تھا۔ دو آدمی وہ اور ایک آپ۔

عبداللہ کا بیان ہے کہ مجھے اور میرے رفیق کو حُجرے میں پہنچا دیا گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد جب شیخ الاسلام اوراد سے فارغ ہوئے، تو تنہا حُجرے میں تشریف لائے اور بیٹھ کر تقریباً نصف پارہ قرآن کا تلاوت فرمایا۔ اس کے بعد اُٹھ کر حُجرے کے دروازے میں زنجیر لگادی اور مجھے فرمایا:

"ہاں شروع کرو"

میں نے یہ شعر پڑھا ؎

مستاں کہ شرابِ ناب خوردند
از پہلوئے خود کباب خوردند

جب اس بیت کی تکرار کی تو شیخ الاسلامؒ وجد میں کھڑے ہو گئے اور چراغ گُل کردیا۔ حُجرے میں اندھیرا ہو گیا۔ ہم اسی طرح گاتے رہے۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا تھا کہ شیخ الاسلام گھوم رہے ہیں۔ جب پاس آتے تھے تو دامن دکھائی دیتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام جنبش اور حرکت کر رہے ہیں لیکن تاریکی کی وجہ سے یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ ضرب پر حرکت کرتے ہیں یا بغیر ضرب۔ جب سماع ختم ہوا، تو حضرت نے دروازہ کھول دیا اور حُجرے سے باہر تشریف لے گئے۔ میں رات بھر مع اپنے رفیق کے اسی حُجرہ میں رہا۔ صبح ہوئی تو شیخ الاسلامؒ نے خادم کے ہاتھ خلعتِ فاخرہ اور بیس اشرفیاں بھجوا دیں۔[1]

محبوب الٰہیؒ دہلوی فرماتے ہیں کہ عبداللہ قوال ملتان سے رخصت ہو کر اجودھن آیا اور حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر قدس سرہٗ کی خدمت میں چند یوم بسر کئے۔ یہاں سے دہلی پہنچا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اس قوال کو دیکھا تھا۔ دہلی سے پھر واپس اجودھن آیا اور حضرت گنج شکرؒ سے بمنت عرض کی کہ میں ملتان جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ راستہ پُرخطر ہے۔ دُعا فرمائیے تاکہ میں صحیح سلامت ملتان پہنچ جاؤں۔ آپ نے فرمایا۔ یہاں سے فلاں حوض تک

---

[1] "بوستانِ غوثیہ" از شاہ عبداللطیف قادری، ص ۱۴

میرا علاقہ ہے۔ وہاں تک تو تم سلامت جا پہنچو گے۔ وہاں سے ملتان تک شیخ بہاء الدین کا علاقہ ہے۔

عبداللہ کا بیان ہے کہ میں حضرت گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات سن کر چل پڑا جب حوض کے نزدیک پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہاں ڈاکہ پڑتا ہے۔ مجھے شیخ کی بات یاد آگئی اور بلا دھڑک چلا گیا۔ اللہ نے ڈاکوؤں کو اس راہ سے دور پھینک دیا، وہ راستہ بھول گئے اور میں صحیح سلامت حوض پر جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر وضو کر کے دوگانہ ادا کیا۔ بعدازاں شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کو یاد کیا اور کہا یہاں تک تو فریدالدین گنج شکر کی حد تھی، صحیح سلامت پہنچ گیا ہوں۔ اب آگے آپ کی حد ہے۔ اب آپ ذمہ دار ہیں۔ جب میں حوض سے آگے بڑھا، تو راہزن ننگی تلواریں ہاتھ میں لئے للکارتے ہوئے آپہنچے۔ میں نے گھبرا کر شیخ الاسلام کو مدد کے لیے پکارا۔ راہزن اسی وقت ڈر کر بھاگ گئے اور میں صحیح سلامت ملتان پہنچ گیا۔[1] جب حاضر خدمت ہوا تو میں جامۂ سقرلاتی جو ناگور کے علاقہ میں بنا جاتا ہے پہنے ہوئے تھا۔ حضرت نے مجھے اس لباس میں دیکھ کر فرمایا "یہ شیطانی لباس ہے۔ اسے اتار دے۔"

حضرت محبوب الٰہی دہلوی فرماتے ہیں کہ عبداللہ قوال کو یہ بات شاق گزری اور حرص اس لباس کے اتارنے میں مانع ہوئی۔ بے ساختہ کہہ بیٹھا کہ لوگوں کے گھر سونے چاندی سے بھرے پڑے ہیں، اس پر نظر نہیں کرتے اور ایک گلیم کہنہ جو اٹھنی میں خریدی جا سکتی ہے، انہیں بری معلوم ہوتی ہے۔ حضرت نے دیکھا کہ قوال دائرۂ ادب سے نکلا جاتا ہے۔ فرمایا:

"عبداللہ ہوش میں آ! اور زبان سنبھال۔ حوض کے کنارے جب ڈاکوؤں نے تجھے سراسیمہ کر رکھا تھا۔ ذرا اس وقت کو یاد کر کہ آخر زکریا ہی تیری نجات کا موجب بنا۔"

عبداللہ یہ فرمان سن کر سخت نادم ہوا اور قدمبوس ہو کر اپنے قصور کی معافی چاہی۔ شیخ الاسلام کی تو شان ہی یہی تھی کہ معافی پر معافی دیتے تھے اور جبینِ ولایت پر شکن تک نہیں آنے دیتے تھے۔ عبداللہ کو نہ صرف معاف کیا، بلکہ اس کا دامن دینی اور دنیاوی سعادتوں سے بھر دیا۔[2]

---

[1] بوستانِ غوثیہ، از شاہ عبداللطیف قادری، ص ۱۲
[2] سیر العارفین از مولانا جمالی، ص ۲۳

حضرت شیخ الاسلامؒ اور موسیقی

حضرت شیخ الاسلام سہروردی سلسلہ کے شیخ الکل تھے۔ سماع نہ خود سُنتے تھے اور نہ اُن کی خانقاہ میں کسی دُوسرے کو سُننے کی اجازت تھی۔ حضرت مولانا فخرالدین عراقیؒ کو جو حضرت کے داماد اور خلیفہ تھے، محض اس بنا پر خانقاہ سے نکلنا پڑا تھا کہ جب ان پر جذب وسکر کی حالت طاری ہوتی تھی، تو وہ اپنے جذبات واحساسات کا اظہار اشعار کی صورت میں کرنے لگتے تھے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ موسیقی سے نہ تو شیخ الاسلام کو دلچسپی تھی اور نہ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی محفلِ سماع کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ حضرت شیخ الاسلام صحیح معنوں میں وارثِ نبوتؐ[1] تھے اور شریعت پر سختی سے پابند تھے۔ پروفیسر محمد شفیع مرحوم جب حضرت شیخ الاسلام کے احوال وآثار پر مقالہ مدون کرنے لگے تو انھیں عبداللہ قوال کے اس واقعہ سے سخت دھوکہ لگا اور اُنھوں نے محمد کرم امام خاں نائیک کی کتاب "معدن الموسیقی" کے حوالے سے لکھا ہے :۔

"امیر خسروؒ کی طرح آپ نے بھی اس علم کے بہت سے راگ بنائے۔ چنانچہ منجملہ ان کے دھناسری میں ملتانی ملا کے ملتانی دھناسری کیا اور پوربی و ولسکار ملا کے بہادرے نام رکھا[2]"

پروفیسر محمد شفیع مرحوم بڑے فاضل انسان تھے تحقیق وتجسس اُن کا خصوصی میدان تھا۔ اورنٹیل میگزین میں اُنھوں نے بڑے معلوماتی مضامین لکھے اور بہت سی غلط روایات کی تکذیب کی۔ حضرت شیخ الاسلام سے متعلق ان سے جو غلطی ہوئی، اس سے ان کی عالمانہ صلاحیتوں پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ سہو اور نسیان انسان کا خاصہ ہے۔ وہ بہت بڑے عالم اور محقق ہونے کے باوجود بھی ایک انسان تھے۔ اگر ان فقرات کا انتساب وہ کسی دانشور اور ادیب سے کرتے،

لہ (۱) علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل (الحدیث) (۲) الشیخ فی قومہ کالنبی فی امتہ

لہ۲ مقالہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا، از پروفیسر محمد شفیع پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور، ص ۲۱

توہم قطعی بحث میں نہ پڑتے۔ مگر یہاں تو معاملہ ایسی سرکار کا ہے جو لاکھوں اور کروڑوں کا مقتدا ہیں۔ اگر آج یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت شیخ الاسلام نے راگ اور سُر ایجاد کئے تھے تو مصر سے فلپائن اور جاوا سماٹرا تک کروڑوں گھروں میں طبلے کھڑکنے لگیں گے اور ہر وہ شخص جو سہروردی سلسلے میں داخل ہے، بجائے رکوع و سجود کے ٹھمریاں گانے لگے گا۔ اس لیے ہم مجبور ہو گئے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام کی پاک ذات کو اس آلائش سے ملوث نہ ہونے دیں۔

پروفیسر محمد شفیع نے عبداللہ قوال کے واقعہ میں ایک لفظ کا اضافہ کر کے صحیح صورت حال کو مسخ کر دیا ہے کہ جب عبداللہ قوال نے عرض کی کہ (آپ کے مرشد) شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے میری خوش الحانی سُنی، آپ بھی سُنیں۔ یہاں تک تو صحیح ہے لیکن آگے جو فقرہ آپ نے لکھا ہے، وہ غلط ہے۔ فرماتے ہیں: "چنانچہ ایک شب مجلس سماع منعقد کی گئی"۔ اس کا مطلب تو سوائے اس کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ خانقاہِ عالیہ کے اندر حضرت نے عبداللہ قوال سے سماع سُننے کا خصوصی انتظام کیا۔ شامیانہ نصب ہوا، دریاں اور غالیچے بچھائے گئے۔ چراغاں ہوا۔ مجلس میں حضرت اپنے صاحبزادوں، پوتوں، اکابر خلفاء، زکریا یونیورسٹی کے اساتذہ، سلطان ناصر الدین قباچہ فرمانروائے ملتان اور رؤسائے شہر کے ساتھ قرینے سے تشریف فرما ہوتے اور پھر عبداللہ نے اپنے کمالات کا مظاہرہ شروع کیا۔

آپ کسی بھی مبصر سے دریافت کرلیں، وہ "ایک شب مجلسِ سماع منعقد ہوئی" کا یہی مطلب لے گا۔ مگر حاشا و کلّا، صورتِ حال ایسی نہیں ہے۔ عبداللہ کا اپنا بیان ہے کہ "مجھے اور میرے رفیق کو حجرے میں پہنچا دیا گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد جب حضرت شیخ الاسلام اوراد سے فارغ ہوئے، تو تنہا حجرے میں تشریف لائے اور بیٹھ کر تقریباً نصف پارہ قرآن کا تلاوت فرمایا۔ اس کے بعد اُٹھ کر حجرے کے دروازے میں زنجیر لگا دی اور مجھے فرمایا "ہاں شروع کرو"۔" کیا اس واقعہ پر مجلسِ سماع کے "انعقاد" کی تطبیق

لہ مقالہ شیخ الاسلام، از پروفیسر محمد شفیع مرحوم، صد ۲۱ ٭

ہو سکتی ہے ؟

امر واقعہ یہی ہے کہ حضرت نے عبداللہ سے سماع سُننے پر آمادگی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ اس کے قول کے بموجب حضرت کے مُرشد کریم سُن چکے تھے۔ پھر عبداللہ اور اُس کے رفیق کو تنہا ایک حُجرے میں بیٹھنے کا حکم دیتے ہیں۔ خود عشاء کی نماز کے بعد کافی دیر تک اوراد میں مصروف رہتے ہیں۔

جب یہ یقین ہو جاتا ہے کہ خانقاہ اور مدرسہ کے لوگ سو گئے ہوں گے۔ تو حجرے کا رُخ کرتے ہیں۔ اندر داخل ہو کر خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں اور نصف پارہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی خادم یا درویش صحنِ خانقاہ میں چل پھر رہا ہو، تو آپ کے فوراً ادھر تشریف لانے کے سبب تجسّسِ حال کی کوشش نہ کرے۔

حضور اسی پر قناعت نہیں فرماتے اور پھر کھڑے ہو کر حجُرے کے دروازے پر زنجیر لگا دیتے ہیں تا کہ اگر کوئی آنا چاہے تو نہ آسکے۔

عبداللہ کو حکم ہوتا ہے، شروع کرو۔

بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی۔ حضور کھڑے ہو کر چراغ کو بُجھا دیتے ہیں۔ حجُرے میں گھُپ اندھیرا ہو جاتا ہے۔

عبداللہ کا اپنا بیان ہے کہ ہم لوگ تاریکی میں اسی طرح گاتے رہے۔ صرف اس قدر معلوم ہوتا تھا کہ شیخ الاسلام جنبش اور حرکت کر رہے ہیں۔ لیکن تاریکی کی وجہ سے یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ ضرب پر حرکت کرتے ہیں یا بغیر ضرب۔ جب سماع ختم ہوُا، تو حضرت نے دروازہ کھول دیا اور حجرہ سے باہر تشریف لے گئے۔

عبداللہ کہتا ہے :

صبح کو شیخ الاسلام نے خادم کے ہاتھ خلعتِ فاخرہ اور بیس اشرفیاں بھجوا دیں "۔

اور عبداللہ ملتان سے اجودھن کو رُخصت ہو گیا۔

عبداللہ جب اجودھن اور دہلی کے سفر سے واپس آیا، تو حضرت نے پھر اس سے کچھ سُنانے کی فرمائش نہیں کی اور نہ ہی خانقاہ کے کسی درویش، حتیٰ کہ عراقی نے اس سے سماع سُننے کی

جسارت کی اور نہ ہی آپ کے صاحبزادوں اور اکابر خلفاء نے اُسے مُنہ لگایا۔ کیا اس ماحول میں "دھنک دھیا" کو راہ مل سکتی ہے اور اس خانقاہ کا نگرانِ اعلےٰ راگ اور سُر ایجاد کر سکتا ہے۔

موسیقی کے ماہر مخدوم بہاءُ الدین برناوی تھے' نہ کہ حضرت مخدوم بہاءُ الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ

دراصل جنہوں نے راگ اور سُر ایجاد کئے تھے وہ مخدوم بہاء الدین برناوی تھے۔ فقیر اللہ نے راگ درپن میں اور محمد کرم امام خان نائیک نے انہی کا ذکر کیا ہے۔ خود مولوی محمد شفیع مرحوم نے بحیثیت مدیر رسالہ "اورنٹیل میگزین" کی اشاعت نومبر ۱۹۲۷ء میں مخدوم بہاء الدین برناوی پر ایک تفصیلی مضمون شروع کیا تھا۔ اس کی تیسری قسط میں آپ نے مخدوم صاحب اور اُن کے منظورِ نظر قوال "محبت" کے بارے میں یہ عبارت درج کی تھی۔

(مخدوم بہاء الدین برناوی) کے ہاں ایک قوال محبت نامی سرانہ کا متوطن تھا، وہ نسبتاً اور قوالوں کے زیادہ مستعد اور ذکی تھا۔ شعر دانی اور کبیری میں اپنے اقران پر ممتاز تھا۔ اس کی آواز بڑی رسیلی تھی۔ حتیٰ کہ امراء و سلاطین میں بھی مشہور ہو گیا تھا۔ ایک دن بیداری کے پردے میں ایک خیال آپ (مخدوم صاحب) نے موزوں کیا اور قوالوں کو سکھانے لگے۔ ان میں محبت قوال بھی موجود تھا۔ وہ ہندوستانی قیدی تھے، جس میں ایک ایسا مشکل نکتہ آگیا تھا کہ قوال اس کو ادا نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے محبت کو ملامت کی کہ میاں تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ راگ اور تان کے ادراک میں تمہارے متعلق لوگوں کا اس قدر اعلےٰ خیال ہے اور یہ ذرا سی پیچیدہ چیز نہیں سمجھ سکتے۔ آخر محبت نے محنت کر کے اس راگ کو ادا کر دیا اور برابر ایک ماہ تک اس کی مشق کرتا رہا۔

جب مولوی محمد شفیع مرحوم کا مقالہ[1] میری نظر سے گزرا۔ میں نے مرحوم کے صاحبزادے مولوی احمد ربانی صاحب کو لکھا کہ موسیقی کا انتساب حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانی سے قطعاً غلط

؎۱ اورنٹیل میگزین، لاہور۔ بابت نومبر ۱۹۲۷ء

ہے۔ یہ چیز حضرت کے مسلک کے خلاف ہے۔ اگر آپ یہ مقالہ دوبارہ شائع کرائیں تو اس روایت کی تردید کر دیں۔ جس سے اُنھوں نے اتفاق نہیں کیا اور لکھا:

جناب احمد ربانی صاحب اپنے والد کے نہایت سعادت مند فرزند ہیں۔ خدا تعالےٰ ایسی اولاد ہر شخص کو نصیب کرے۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے والد ماجد سہو اور نسیان سے پاک تھے۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ پتھر کی لکیر ہے اور عین صواب ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے مجھے تحریر فرمایا:

"شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بڑی تحقیق کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر یہ معلوم ہو کہ اُنھیں راگ سے دل چسپی تھی، تو یہ اُن کی بڑائی ہے۔ ورنہ آپ حضرت داؤد علیہ السلام، خسروؒ، حضرت شیخ الکبیر فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کو کیا کہیں گے؟"

ہمیں بھی اس سے اتفاق ہے کہ شیخ الاسلام کا مقالہ مدوّن کرنے میں اُن کے والد مرحوم نے خاصی محنت کی ہے، لیکن اس امر کے اعلان میں ہمیں قطعیً باک نہیں کہ موسیقی کے معاملے میں ان کے والد ماجد کو سخت دھوکہ ہُوا ہے۔ اگر اُن کے نزدیک راگ میں دل چسپی عظمت کی نشانی ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت شیخ الاسلام کی ذاتِ گرامی اس عظمت و شوکت سے پاک تھی۔

بے چارے فقیر اللہ اور محمد کرم امام خان نائیک کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ہم بھارت کے جس مخدوم بہاء الدین کا ذکر کر رہے ہیں۔ آنے والے دَور کے محققین اسے حضرت مخدوم بہاء الدین زکریا سمجھ لیں گے۔

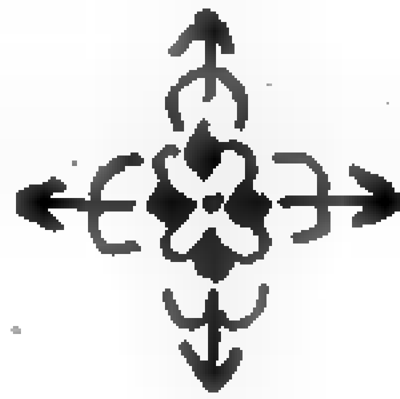
مَیں نے جناب احمد ربانی صاحب کو لکھا کہ آپ نے راگ کے سلسلے میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ ہم لوگ داؤدی شریعت کے پیرو نہیں۔ حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتِ مطہرہ کے متبع ہیں۔ نیز حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ کا معاملہ جُدا ہے۔ آپ چشتیہ سلسلہ کے بزرگ تھے۔ ان کے مسلک میں سماع مباح تھا۔ وہ سُنتے تھے۔ اس سے اُن کی روح کو وجد آتا تھا اور سکر کا عالم طاری ہو جاتا تھا، مگر نہ تو

انہوں نے کوئی راگنی ایجاد کی (معاذاللہ) اور نہ ہی خود کسی مجلس میں سُر اور تان سے غزل گا کر سُنائی۔

باقی رہا حضرت امیر خسرو کا معاملہ، تو وہ متعدد سلاطین کے مصاحب اور منصب دار رہے ہیں اور اپنے دَور کے امیر کبیر تھے۔ ساتھ ہی فقراء اور درویشی سے بھی بہرہ وافر رکھتے تھے۔ لیکن امیر خسروؒ سب کچھ ہونے کے باوجود شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ جیسے اکابر اولیاء اللہ کی صف میں کھڑے ہونے کی جسارت نہیں کر سکتے۔

ہر درویش کا اپنا مقام ہے۔ جو مرتبہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل تھا وہ قطب الاقطاب شاہ رکن عالم علیہ الرحمۃ کو حاصل نہیں اور جس مقام پر حضرت شاہ رکن عالمؒ فائز تھے، وہ بعد میں آنے والوں کو نصیب نہیں ہوا۔ اولیاء اللہ کے معاملے میں ہمیں اتنی جسارت سے کام نہیں لینا چاہیئے۔

؎ بکارے چرا دست باید کشید
کہ از دین و دُنیا تواند بُرید




تعلیمات
و
تصنیفات

حضرت شیخ الاسلامؒ کی تصانیف کے سلسلے میں اتنا پتہ چلا ہے کہ آپ نے ایک کتاب "اوراد" سے متعلق لکھی تھی۔ جو صدیوں تک متداول بین الناس رہی۔ حضرت قطب الاقطاب کے زمانے میں ان کے ایک فاضل مُرید مولانا علی بن احمد غوریؒ نے اس کی ایک مبسوط شرح "کنز العباد" کے نام سے مدون کی تھی۔ جس کا ایک ضعیف قلمی نُسخہ بڑی کوششوں کے بعد نواب مخدوم مرید حسین قریشی سجادہ نشین بارگاہ غوثیہؒ نے چکوال کے ضلع سے برآمد کیا ہے۔ فاضل شارح اس کتاب کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں :

" اعظم المحامد للہ العظیم واکرم الصّلوات علیٰ رسولہ الکریم ۔ امّا بعد فانّ ھذا شرح اورادِ الشیخ الاجل الکبیر محی السّنۃ ماحی البدعۃ کاشف الحقائق مظھر الدقائق حجّۃ الحق والدّین علی الحق بہاءُ الحق والشرع والدین اسکنہ فی اعلیٰ علیین القہ العبد الضعیف اصغر خدّام الشیخ الاعظم المعظّم المکرّم الاکرم قدوۃ الثقلین سلطان المشائخ الخافقین رکن الحقّ والشرع والدین رضی اللہ عنہ وارضاہ عنّا وجعل الفردوس مثواہ وھو علیّ بن احمد الغوری السّاکن بخطۃ کرۃ ۔

وسمیتہ بکنز العباد فی شرح الاوراد فالمامول من اللہ القوی القدیر ان یکون مقبولاً لدی الصغیر والکبیر[1] ۔

اور آخر میں اس کتاب کا خاتمہ ان الفاظ میں ہوتا ہے :۔

واللہ الموفق وقع الفراغ من تسوید ھذہ النسخۃ الشریفۃ المیمونۃ المسمّاۃ بشرح الاورادِ واللہ اعلم بالصّواب والیہ المرجع والمآب[2] ۔

[1] کنز العباد قلمی صفحہ اوّل ۔ [2] کنز العباد، قلمی صفحہ آخر

شرح کی زبان اگرچہ عمومی طور پر عربی ہے۔ مگر شیخ الاسلامؒ کی اصل کتاب فارسی زبان میں ہے اور گو اس کا نام "اوراد" ہے۔ حقیقتاً وہ "اوراد و وظائف" کی کتاب نہیں، بلکہ وہ صوفیانہ رنگ کی فقہی تصنیف ہے۔ جس میں نماز، روزہ، طہارت، توبہ اور اخلاص وغیرہ کے مسائل درج ہیں۔ انہی مسائل کی تشریح شرح میں فقہی ابواب کی تقسیم کے ساتھ کی گئی ہے۔ چونکہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا مسلک تصوف شریعت سے ایک انچ بھر بھی اِدھر اُدھر نہیں تھا۔ اس لیے ان کے "اوراد" بھی گویا مسائل شریعت میں انہماک کا دُوسرا نام ہے۔ اور "اتباع شریعت" سے علیحدہ ہو کر کوئی چیز بھی اُن کے ہاں ورد نہیں کہلا سکتی۔ ہم حضرت شیخ الاسلامؒ کے "اوراد" کی ایک عبارت یہاں نقل کرتے ہیں جو شرح میں بطور متن آگئی ہے۔ اس سے کتاب کی زبان، حضرت کے اندازِ بیان اور ان کے "اوراد" کی حقیقی آن بان پُوری شان کے ساتھ منظرِ عام پر آجاتی ہے۔

قوله

"وآنچہ بر کاغذ بسیار ہا نویسند کہ "اِفْعَلْ وَلَا تَفْعَلْ" آں نباید کرد کہ بدعت است واستخراج رافضیانست وتوکل را زیاں دارد۔ براں نباید رفت متابعت سنت باید بود و برکت در آنست۔" (ص ۱۶۵)

"یعنی جو لوگ احکام شرعیہ میں "افعل ولا تفعل" بہت لکھتے ہیں "ایسا کرنا چاہیئے اور ایسا نہ کرنا چاہیئے" یہ بدعت ہے۔ شیعوں کی مجوزہ ہے۔ اور توکل کو نقصان دیتی ہے۔ اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ سُنتِ نبویہ پر عمل کرنا لازمی ہے کیونکہ برکت اسی میں ہے۔"

شرح میں صرف فقہی تشریحات ہی نہیں، بلکہ ادعیہ و آیاتِ قرآنیہ کی لغوی توضیحات، تفسیری نکات، متصوفانہ تنسیقات اور تعریفات بھی درج ہیں اور ہدایہ و محیط کے حوالوں کے ساتھ ساتھ بستان ابولیث، عوارف اور شرعہ ایسی کتابوں کے حوالے بھی منتشر جا موجود ہیں۔ غرض حضرت شیخ الاسلامؒ کا متن اگر کوزے میں دریا کی مثال ہے، تو مولانا غوریؒ کی شرح ایک بحرِ محیط ہے۔ جس کا ایک کنارہ اگر فقہ و تصوف سے شروع ہو رہا ہے تو دُوسرے

کنارے کا پتہ ملنا دشوار ہے۔

پس علوم کا ایک بحرِ بیکراں ہے، جس میں طالب علم اور طالب مولیٰ دونوں کے لیے اپنے اپنے رنگ کی چیزیں موجود ہیں۔ متن اور شرح کی غالبؔ کے اس شعر کے سوا اور کوئی تعریف نہیں ہو سکتی ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لیے

کنز العباد کے ایک حسین و جمیل پارے کا اردو ترجمہ

سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں؛

قولہٗ تعالےٰ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ الحمد کے معنی ثنا ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی شکر ہیں۔ اللہ پاک نے اپنی تعریف آپ کی ہے تاکہ اپنے بندوں کو سکھائیں کہ خدا کی تعریف کس طرح کی جاتی ہے۔ اس جگہ قولوا مقدر ہے۔ یعنی تم کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی مخلوق کے تمام انواع و اقسام کو پالنے والا ہے۔ مخلوق کی ہر قسم ایک علیحدہ عالم ہے۔ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا فرمائے ہیں۔ ان میں سے دُنیا ایک عالم ہے۔ مقاتل بن حیان کے نزدیک کل اسّی ہزار عالم ہیں۔ چالیس ہزار خشکی میں ہیں اور چالیس ہزار پانی میں۔ کعبؔ فرماتے ہیں کہ علمین کی تعداد بے شمار ہے گنتی میں نہیں آسکتے۔ وَمَا یَعْلَمُ اِلَّا ھُوَ عَالِمٌ ایسا جمع ہے جس کا واحد نہیں ہے جیسے انام اور رہط عالم علامت سے مشتق ہے۔ جس کے معانی دلیل کے ہیں۔ گویا تمام مخلوق اللہ پاک (صانع حقیقی) کی دلیل ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ "رحمٰن" لفظ خاص ہے۔ مگر "عام" کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ اس حیثیت سے کہ ہر نیک و بد کو رزق دیتا ہے اور ان سے مصائب و آلام کو دفع کرتا ہے۔ اللہ پاک کے بغیر اس لفظ کے ساتھ کسی کا نام رکھنا جائز نہیں ہے۔ "رحیم" لفظ "عام" ہے۔ مگر اس کے معنی "خاص" ہیں۔ اس حیثیت سے کہ غیر کا نام بھی اس لفظ کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ جیسے قرآن پاک میں آیا ہے۔ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ

الغرض "الرحیم" کے معنی ہیں، وہی اللہ پاک خاص مومنین پر معرفت کے ساتھ مہربانی کرنے والا ہے۔ انہیں بخشے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔ ابن مبارک کہتے ہیں کہ "رحمٰن" اس ذات کا نام ہے کہ اگر اس سے سوال کیا جائے تو خالی واپس نہ کرے اور "رحیم" وہ ہے کہ اگر سوال نہ کیا جائے، تو ناراض ہو جائے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ یعنی قیامت کے دن کا قاضی اور حاکم ہے۔ قیامت کے دن کو محض اس لیے خاص کیا ہے کہ اس دن تمام املاک ختم ہو جائیں گے۔ دعاوی باطل اور مالک سرنگوں ہوں گے۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ ہم تیری توحید کے معتقد ہیں جس طرح کہ مطیع ہیں۔

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ یعنی تیری عبادت کرنے کے لیے تجھ ہی سے توفیق طلب کرتے ہیں اور تیرے احکام کی بجاآوری پر تجھ سے مدد چاہتے ہیں۔ لفظ "اِيَّاكَ" مکرر اس لیے لایا گیا ہے کہ اخلاص پر زیادہ دلالت کرے۔

اِهْدِنَا یعنی ہم کو ثابت قدم رکھ۔ امر کا صیغہ ہے۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر قاری ہدایت یافتہ ہو تو پھر اِهْدِنَا کیوں کہے۔ اس لیے کہ انجام کا پتہ نہیں کہ کیسے ہو گا۔ اسی لیے دعا مانگی کہ ہمارا خاتمہ بھی ہدایت پر ہو۔ عقلمند کو ظاہری حال پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے گزرے ہیں کہ مرتے وقت انہیں ایمان تک نصیب نہیں ہوا۔ جیسا کہ ابلیس، برصیصا[۱]، بلعم[۲] اور ثعلبہ[۳] کے حالات سے پتہ چلتا ہے۔ بقول کسے ؎

"اے رات کے پہلے حصے میں خوشی سے سونے والے! ہو سکتا ہے کہ رات کے آخری حصے میں تو حوادث اور مصائب کا شکار ہو جائے"

رات کا پہلا حصہ اگر آرام سے گزر رہا ہے تو غرور نہ کر۔ کیونکہ رات بسا اوقات آخری حصہ میں آگ بھڑکا دیتی ہے۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ یعنی واضح اور سیدھا راستہ اور وہ اسلام ہے۔

---

[۱]، [۲]، [۳]۔ امم سابقہ کے عابدوں کے نام ہیں جو آخر کو ابلیس کی طرح گمراہ ہو گئے۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ۔ یعنی جن پر تُو نے اپنا انعام کیا ہے اور احسان فرمایا ہے، یہ انبیاء علیہم السّلام ہیں۔ جیسا کہ اللہ پاک نے انبیاء کے ذکر کے بعد فرمایا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ الخ۔ صراط کا دُوسرا لفظ پہلے سے بدل الکل من الکل ہے[۱]۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ حضرت سرورِ عالم صلّے اللہ علیہ وسلم سے اَلْمَغْضُوْب کی بابت سوال کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا۔ وہ یہود ہیں اور ضالین کے بارے میں ارشاد ہُوا کہ وہ نصاریٰ ہیں۔

آمِیْن۔ یہ لفظ قرآن پاک میں سے نہیں ہے، بلکہ دُعائیہ ہے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ جب مَیں فاتحہ پڑھنے سے فارغ ہُوا۔ تو جبرائیل علیہ السّلام نے مجھے "آمین" پڑھنے کی تلقین کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے خدا! ہم نے جو سوال کیا ہے اُسے قبول فرما۔

کبیری میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب نمازی فاتحہ پڑھنے سے فارغ ہو اور "آمین" مد کی شد (ّ) سے پڑھے، تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ لفظ اس جگہ کوئی ربط نہیں رکھتا اور کہا گیا ہے کہ حضرت ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز فاسد نہ ہو گی۔ اس لیے کہ قرآن پاک میں اس جیسا لفظ پایا جاتا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اور مناسب ہے "آمین" الف کی مد سے کہے نہ کہ میم کی تشدید کے ساتھ۔

وضو کے احکام

وضو کی تیاری عوارف میں لکھا ہے کہ متوضی کو نماز کے وقت سے پہلے وضو کی تیاری کرنی چاہیئے۔ جامع الخانی کے نزدیک وضو کے آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ وضو نماز کے وقت سے پہلے کیا جائے۔

وضو کا برتن تانبے اور پیتل کے برتنوں سے وضو نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ خدا کے فرشتے اُن کی بُو سے نفرت کرتے ہیں[۲]۔ مستحب یہ ہے کہ مٹی کے برتنوں سے وضو کیا

---

[۱] یہ تقویٰ ہے، فتویٰ نہیں۔ کنز العباد بحوالہ شرح [۲] کنز العباد قلمی بحوالہ شرح السُنّۃ۔

جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تانبے کے برتن میں وضو کرنا مکروہ سمجھتے تھے[1] سراجیہ نے اس امر کو مکروہ گردانا ہے کہ کوئی شخص وضو کے برتن کو اپنے لیے خاص کرلے (اس صورت میں کہ اُس سے دوسرے شخص کو وضو کرنے کی اجازت نہ دے) استنجا کے وقت برتن کو دائیں ہاتھ میں اور وضو کے وقت بائیں ہاتھ میں پکڑنا چاہیئے۔

وضو کا پانی جو پانی سورج کی حرارت سے گرم ہوا ہو، اس سے وضو نہیں کرنا چاہیئے۔ اگرچہ بعد میں اُسے سرد کیوں نہ کر لیا جائے[2]۔ مگر وہ پانی جو سمندروں، دریاؤں اور حوضوں میں سورج کی حرارت سے گرم ہوا ہو، بالاتفاق جائز ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک آبِ زمزم سے وضو کرنا مکروہ نہیں۔ مگر امام احمدؒ نے اس مسئلہ میں اتفاق نہیں فرمایا۔ پانی میں اسراف نہ کرنا بھی وضو کی سنتوں میں داخل ہے اور نہ ہی بخل کرے کہ جس سے وضو کا استحباب بھی جاتا رہے۔ بلکہ پانی کا استعمال دونوں حالتوں کے درمیان میں ہو اس لیے کہ ایک موقعہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کو فرمایا کہ پانی میں اسراف نہ کر، خواہ تو بہتی نہر کے کنارے کیوں نہ بیٹھا ہو۔ فتاوی الحجۃ میں لکھا ہے کہ اعضائے وضو پر مسنون تعداد سے زیادہ پانی ڈالنا مکروہ ہے۔ ایک خبر میں آیا ہے کہ جو شخص وضو میں اسراف کرے، وہ میری اُمت کے شریروں میں سے ہے۔

استعانت غیر مناسب یہ ہے کہ وضو میں غیر سے مدد نہ لی جائے۔ اس لیے کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم اپنی طہارت میں غیر سے استعانت طلب نہیں کرتے[3]۔ ہاں اگر متوضی اعضائے وضو خود دھوئے تو پھر جائز ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے وضو کرنے میں مدد لی تھی۔ اس صورت میں کہ وہ اعضائے شریفہ پر پانی ڈالتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اپنے اعضاء کو دھوتے تھے۔

---

[1] کنز العباد قلمی بحوالہ شرح السنۃ
[2] کنز العباد بحوالہ شرعہ
[3] کنز العباد قلمی بحوالہ سراجیہ، فتاوی الحجۃ، شرح السنۃ۔

وضو کرنے کی جگہ ناپاک جگہ پر وضو نہیں کرنا چاہیئے [1]۔ کیونکہ ایک تو چھینٹوں کے پڑنے کا اندیشہ ہے اور دوسرے وضو کا پانی بھی حرمت اور تعظیم کا مستحق ہے۔ اسے نجس جگہ پر گرانا مناسب نہیں۔ نیز بیت الخلاء اور استنجا کی جگہ پر بھی وضو نہیں کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ بعض جہلاء کرتے ہیں۔ شرح السنۃ کے نزدیک متوضی اُونچی جگہ قبلہ رُخ بیٹھ کر وضو کرے تاکہ چھینٹیں اُس پر نہ پڑیں۔

وضو سے پہلے کی دُعا وضو کرنے سے پہلے متوضی یہ دُعا پڑھے:
رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ۔ یعنی "اے اللہ! ہم شیطان کے وساوس سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔"

اعضائے وضو دھوتے وقت دل کا اللہ کی طرف متوجہ ہونا صوفیائے کرام کا طریقہ ہے۔
مَیں نے بعض صالحین سے سُنا ہے کہ اگر وضو کے وقت دل "حاضر" ہو تو نماز میں بھی حاضر ہوتا ہے اور اگر وضو میں سہو ہو جائے تو نماز میں بھی شیطانی وساوس داخل ہو جاتے ہیں۔

صلوٰۃ النخشبی میں لکھا ہے کہ وضو میں تسمیہ سُنت ہے۔ پس مناسب ہے کہ وضو کی ابتداء میں تسمیہ پڑھے تاکہ یہ برکت تمام اعضاء کو حاصل رہے۔ ورنہ کسی ایک عضو کے دھونے پر پڑھی گئی، تو یہ برکت کسی کے لیے ہو گی اور کسی کے لیے نہیں۔ الجامع الصغیر الخانی میں درج ہے کہ جو شخص وضو کی حالت میں "بسم اللہ" شریف پڑھتا ہے۔ گویا وہ اپنا تمام بدن پاک کر لیتا ہے اور نہ پڑھنے کی صُورت میں طہارت صرف مغسولہ اعضاء کو حاصل ہو گی نہ کہ سارے بدن کو۔

ہاتھوں کا دھونا ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا فرض [2] ہے۔ لیکن ان کا پہلے موہچوں تک دھونا سُنّت ہے۔ مگر یہ بھی فرض کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ جب نمازی وضو کا ارادہ کرے تو پہلے ہاتھوں کو تین دفعہ دھو لے [3]۔

---

[1] کنز العباد قلمی بحوالہ سراجیہ، فتاویٰ الحجۃ، شرح السُّنۃ

[2]، [3] کنز العباد قلمی بحوالہ منافع، ذخیرہ و جامع الصغیر الخانی۔

مُنہ دھونا پہلے تین مرتبہ دائیں ہاتھ سے مُنہ میں پانی ڈال کر کُلّی کرے اور ہر دفعہ نیا پانی استعمال کرے۔ کلّی کرنے کی حد تمام مُنہ کو پانی سے بھر لینا ہے اور مبالغہ یہ ہے کہ حلق کے بالائی حصّے تک پانی پہنچ جائے۔ ناک میں پانی ڈالنے کی حد ناک کی ہڈی تک پانی کا پہنچانا ہے۔ اور مبالغہ اس سے اُوپر تک ہے۔ اس وقت یہ دُعا پڑھنی چاہیئے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ رَوَائِحِ النَّارِ[1] ۔ مُنہ کی حد ماتھے کے بال کٹنے کی جگہ سے ٹھوڑی کے نیچے تک ہے اور عرضاً ایک کان کی لَو سے دوسرے کان کی لَو تک۔ پانی کو پیشانی پر اس طرح سے ڈالے کہ وہ ٹھوڑی سے نیچے تک بہہ جائے اور پہلے رخساروں اور ناک پر نہ بہائے۔ پیشانی پر زور سے نہ مارے۔ اپنی مونچھوں اور ڈاڑھی کے بالوں کو دھوئے اور ان بالوں کو بھی جو ٹھوڑی کے ہیں۔ ڈاڑھی کے اندر پانی پہنچانا واجب نہیں۔ ہاں اگر بال تھوڑے ہوں اور اُن کی جڑیں دکھائی دیتی ہوں، تو پھر اِن تک پانی کا پہنچانا ضروری ہے۔ منہ پر پانی ڈالتے وقت یہ دُعا پڑھے:

"اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجْھِیْ بِنُوْرِکَ" الخ[2] "اے اللہ! میرے منہ کو اپنے نور سے روشن کر۔"

چہرے کی سفیدی اور سیاہی کے بارے میں علمائے اُمت نے اختلاف کیا ہے۔ بعض علماء نے حقیقی سفیدی اور سیاہی مراد لی ہے۔ اس حدیث شریف کی رُو سے کہ جناب رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مومن کا اس حال میں حشر ہو گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند سے بھی زیادہ روشن ہو گا اور کافر اس حال میں اُٹھے گا کہ اس کا چہرہ حد درجہ سیاہ ہو گا۔ بعض علماء نے سفیدی اور سیاہی سے فرحت اور بشاشت اور اُداسی و غمگینی مجازاً مراد لی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے: اِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ[3]۔ جب انہیں لڑکی پیدا ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے، تو ان کا چہرہ غمی کی وجہ سے سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہاں سیاہی سے مُراد حقیقی سیاہی نہیں، بلکہ غمی ہے (یعنی اُن کے چہروں پر افسردگی چھا جاتی ہے)۔

---

[1] روائح جمع ہے رائحہ کی۔ روائح النار، دوزخ کی بھاپ۔ [2] کنز العباد قلمی بحوالہ منافع ذخیرہ وجامع الصغیر الخانی

[3] النحل: ۵۸

سر کا مسح سر کے چوتھائی حصے کا مسح فرض ہے۔ کانوں کا مسح اندرونی اور بیرونی حصے پر اسی پانی سے کرے جس سے سر کا مسح کیا ہے۔ یہ سنت ہے۔

پاؤں کا دھونا اس کے بعد پاؤں کو ٹخنوں تک اس طرح دھوئے کہ برتن کو دائیں[۲] ہاتھ سے پکڑے اور پاؤں کے اگلے حصے پر پانی ڈالے اور بائیں ہاتھ سے اس کو ملے۔ اس کو تین دفعہ دھوئے۔ ازاں بعد اپنے بائیں پاؤں کے اگلے حصے پر پانی ڈالے اور اس کو بائیں ہاتھ سے ملے۔ صلوٰۃ مسعودی میں لکھا ہے کہ پاؤں کا ٹخنوں تک دھونا فرض ہے۔ لیکن لفظ کعب کی مراد میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق کعب سے وہ ہڈی مراد ہے جو باہر نکلی ہوئی ہے۔ جس کا ترجمہ ٹخنے سے کیا جاتا ہے۔ امام زفر نے بھی اسی سے اتفاق کیا ہے۔

خلال ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کا خلال صلوٰۃ مسعودی کے نزدیک تین طرح سے ہے۔ جو انگلیاں آپس میں چمٹی ہوئی ہوں، ان کا خلال فرض ہے۔ اگر ایک دوسری کے اوپر تلے ہیں۔ مگر آپس میں چسپاں نہیں ہوتیں، تو ان کا خلال واجب ہے اور اگر ایک دوسری سے جدا ہیں تو ان کا خلال سنت ہے۔

"ذخیرہ" میں درج ہے کہ اگر انگلیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہوں اور متوضی برتن سے وضو کر رہا ہو تو ان کا خلال فرض ہے۔ لیکن حوض یا جاری پانی سے وضو کر رہا ہے اور اس نے اپنا پاؤں حوض یا نہر میں ڈال کر دھویا ہے تو خلال نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، خواہ انگلیاں ملی ہوئی ہی کیوں نہ ہوں۔ زندویتی نے بھی اپنی نظم میں اسی طرح سے بیان کیا ہے۔

خلاصۃ الصلوٰۃ کے مؤلف نے خلال کرنے کا طریقہ اس طرح لکھا ہے کہ اپنے دائیں پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھوئے اور اپنے بائیں ہاتھ کی چھنگلی سے اس کا خلال کرے۔ پاؤں کی چھنگلی سے شروع کرے اور انگوٹھے پر ختم کرے۔ اس وقت متوضی کو یہ دعا پڑھنی چاہیئے:

---

[۱]، [۲] کنز العباد، بحوالہ مفتاح المسائل و خلاصہ۔

اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ[1] قَدَمَيَّ الصِّرَاطِ مَعَ اَقْدَامِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ اس کے بعد اپنے بائیں پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھوئے اور خلال انگوٹھے سے شروع کر کے چھنگلی پر ختم کرے اور یہ دُعا پڑھے :

اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ تَزِلَّ[2] قَدَمِيْ عَنِ الصِّرَاطِ يَوْمًا تَزِلُّ فِيْهِ اَقْدَامُ الْمُنَافِقِيْنَ ۔

" اے پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میرے قدم اس دن پھسل جائیں ۔ جبکہ منافقین کے قدم پھسل رہے ہوں گے "

اگر کسی نے پاؤں کی تیل سے مالش کر رکھی ہو اور دھوتے وقت چکناہٹ[3] کے سبب اس پر پانی نہ ٹھہرے تو وضو ہو جائے گا۔[4] کیونکہ متوضی پر دھونا فرض ہے ۔ پانی کا ٹھہرانا فرض نہیں ۔ اگر متوضی کے پاؤں میں دراڑیں ہیں ، تو ان کے اندرونی حصّے میں پانی پہنچانا واجب ہے ۔ (عوارف)
اگر متوضی نے پاؤں کی کسی دراڑ میں چربی ڈال رکھی ہو اور وضو کے وقت پانی سے پاؤں دھوئے ، مگر چربی کے سبب اس دراڑ تک پانی نہ پہنچ سکے ، تو وضو جائز ہے ۔ بشرطیکہ پانی سے نقصان کا احتمال ہو ۔ اگر پانی نقصان نہ دیتا ہو ، تو پانی پہنچانا ضروری ہے ۔ مسح کافی نہیں کیونکہ یہ شخص دوا کے نیچے پانی پہنچانے پر قادر ہے اور اگر دوا گر جائے ، تو اس پر چپٹریوں[5] کا حکم لگے گا ۔ یعنی زخم کے اچھے ہونے پر چپٹری گر جائے ، تو ذیلی حصّے کا دھونا واجب ہو جاتا ہے اور اسی طرح اگر دراڑوں کو سی دیا جائے ، تو اس کے ماحول کا دھونا واجب ہے ۔

---

[1] التثبیت مصدر ہے ، ثبت کا ، یعنی ثابت قدم رکھ ۔
[2] " من ان تزل " ازلال میں سے ہے پھسلانا ۔
[3] ، [4] ۔ کنز العباد ، قلمی بحوالہ السابب ونسخہ ۔
[5] بازو کی ہڈی ٹوٹ جانے پر لکڑی کی تختیاں رکھ کر اُوپر سے باندھ دی جاتی ہیں ، ان پر مسح کرنے کی اجازت ہے ۔ اگر زخم کے اچھے ہو جانے پر وہ تختیاں گر جائیں ، تو مسح ٹوٹ جاتا ہے ۔ یہی حکم اس دوا کا ہے جو دراڑوں میں ڈالا جائے ۔ اس وقت اگر پانی سے زخم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو مسح کی اجازت ہے ۔ لیکن شگاف یا زخم کے اچھے ہو جانے سے دوا گر جائے ، تو مسح ٹوٹ جائے گا ۔ اور پاؤں کو دھونا پڑے گا ۔

شروط اربعین

حضرت شیخ الاسلامؒ نے ایک رسالہ "شروط اربعین" کے نام سے بھی تحریر فرمایا تھا جس میں اعتکاف کے آداب و شرائط درج ہیں۔

دُنیا سے مُنہ موڑ کر اور محبوبِ ازل کو معبودِ ذہنی بنا کر گوشہ نشین ہو بیٹھنا درویشی کی پہلی منزل ہے اور یہ وادی اس قدر ناگزیر ہے کہ کوئی سالک اسے طے کئے بغیر فقر و تصوف کی ولایت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ شریعت و طریقت کی اصطلاح میں اس صورتِ حال کا نام "اعتکاف" ہے۔ یہ ذہنی انتشار کا علاج اور قلب کی یکسوئی کا بہترین ذریعہ ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص صدقِ دل سے چالیس یوم ذکرِ الٰہی میں مصروف رہے۔ اس کے قلب سے زبان کی طرف حکمت و دانائی کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص خلوصِ دل اور خالی پیٹ سے چالیس دن عبادتِ الٰہی میں گزارے۔ ہم اس پر علومِ دینیہ کے دروازے کھول دیتے ہیں[1]۔ قرآن شریف میں آتا ہے:

"وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً"۔

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تیس شب کا وعدہ کیا۔ پھر دس روز میں پورا کیا۔ اسی طرح تیرے رب کا وعدہ پورے چالیس یوم میں تکمیل کو پہنچا"۔ چالیس یوم کی تجدید اور قید میں یہ حکمت ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر چالیس دن رکھا تھا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: خَمَّرَ اللّٰهُ طِيْنَةَ اٰدَمَ بِيَدِهٖ اَرْبَعِيْنَ صَبَاحًا[3]۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ قلبِ انسانی میں چالیس پردے ہیں جو اربعینہ سے چالیس کے چالیس کھل جاتے ہیں۔ عوارف شریف کی اصل عبارت یہ ہے:

---

[1] من انقطع الی اللہ اربعین یومًا مخلصًا متعابدًا لنفسہ تخفت المعدۃ یفتح علیہ علوم الدینیہ۔ (کنز العباد قلمی) [2] الاعراف: ۱۴۲

[3] اللہ تبارک و تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی مٹی کو چالیس دن خمیر میں رکھا۔ (الحدیث بحوالہ کنز العباد قلمی)

اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا بِهٖ اَرْبَعِیْنَ حِجَابًا لَنْ یُحْضَرَتِ الْاِلٰھِیَّۃُ فَاِذَا تَمَّتِ الْاَرْبَعُوْنَ زَالَتِ الْحُجُبُ وَصُبَّتْ عَلَیْهِ الْعُلُوْمُ وَالْمَعَارِفُ بِاِتِّصَالِ نُوْرِ الْعَظَمَۃِ الْاِلٰھِیَّۃِ -

یعنی چالیس یوم سے چالیس پردے اور حجاب دور ہو جاتے ہیں۔ جب چالیس یوم ختم ہوتے ہیں تو حجاب رفع ہو کر قلب میں علوم و معارف کے خزانے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ عظمتِ الٰہی کا نور وابستہ ہوتا ہے۔ الغرض "اعتکاف" بڑے فضل و برکت کی چیز ہے۔ مگر اس کے لیے چند شرائط کی بجاآوری نہایت ضروری ہے۔ ان کے بغیر خاطر خواہ فائدہ مترتب نہیں ہوتا۔ اسی خیال کے پیشِ نظر حضرت شیخ الاسلامؒ نے اپنے مریدوں کے لیے "اوراد" کے نام سے ایک مبسوط دستور العمل مرتب فرمایا تھا جس کا دھندلا سا عکس ہم گزشتہ اوراق میں پیش کر چکے ہیں۔ اب وہ چالیس شرائط قارئین کرام کے سامنے رکھتے ہیں۔ جن میں حضرت نے معتکفین کے لیے ایک روشن اور واضح راہ متعین کر دی ہے۔ اگر سالک ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے تو "جمالِ یار" کا نصیب ہونا کوئی مشکل نہیں رہتا۔ افسوس ہے کہ حضرت کی اصل عبارت جو فارسی میں تھی، میسّر نہیں آسکی۔ مرورِ زمانہ سے وہ "گنجِ شائگان" رائیگان ہو گیا۔ اس لیے اس کے ترجمہ پر قناعت کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

(۱) سالک کو چاہیئے کہ ایسی نیّت سے غسل کرے گویا یہ اُس کا آخری غسل ہے اور وہ مُردہ ہے۔ کَمَا قَالَ الْمَشَائِخُ اِنَّ مِنْ لَوَازِمِ حَالِ الْمُرِیْدِ الْجُلُوْسُ فِی الْخَلْوَۃِ وَاَنْ یَغْتَسِلَ وَیَنْوِیْ فِیْ غُسْلِهٖ اَنَّ غُسْلَ الْمَیِّتِ لِیَکُوْنَ بَیْنَ یَدَیِ الْغَسَّالِ فِیْ عَدَمِ حُظُوْظِ النَّفْسِ وَھَوَاھَا - جیسا کہ مشائخ کا قول ہے کہ "مرید کے واسطے خلوت نشینی لازم ہے اور وہ لذاتِ دنیوی کو ترک کر کے اپنے آپ کو مُردہ تصوّر کرتے ہوئے غسل کرے اور یہ خیال کرے کہ میں خداوند کریم کے دستِ رحمت سے غسل کرتا ہوں۔ جیسا کہ غسال مُردہ کو غسل دیتا ہے۔ وَاَمَّا النِّیَّتُ فَلِقَوْلِهٖ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا - موت کی نیت حدیثِ مذکور سے ظاہر ہے یعنی ع

خاک شو پیش از انکہ خاک شوی

وَلَا یَخْفٰی اَنَّ الْمُرَادَ بِالْمَوْتِ قَبْلَ اَنْ یَّرٰی نَفْسَهٗ مَیِّتًا فِیْ عَدَمِ حُظُوْظِ النَّفْسِ

وَهَوَاهَا وَهٰذَا هُوَ نِيَّتُ الْمَوْتِ اور اس موت کا مطلب حقیقی یہ ہے کہ طالب اپنے آپ کو عدم حظوظ نفس اور ترک خواہش میں مُردہ تصوّر کرے اور یہی موت کی نیّت ہے۔ بقول کسے ؎

نمیری گر بمردن خوب گیری
بمیر از خویش تا ہر گز نمیری

(۲) سالک کو چاہیئے کہ اپنے دل میں نیّت کرے کہ مَیں نے خلقِ خدا کو بہت تکلیف دی ہے اور اب اس حالتِ اعتکاف میں خلق میرے شر سے امن میں رہے۔ دل میں یہ نیّت نہ ہو کہ اس اعتکاف سے مَیں اپنے آپ کو خلقِ خدا سے بچا کر رکھوں اور اُن کے شر سے محفوظ رہوں۔

(۳) اعتکاف حجرہ یا مسجد میں کرے۔ قرآن شریف میں آیا ہے :

"وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِى الْمَسَاجِدِ" (وہ تم مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو۔) (البقرۃ : ۱۸۷)

(۴) سالک کو چاہیئے کہ اعتکاف کی حالت میں اہل و عیال سے دُور رہے کہ یہ موجبِ فتنہ ہیں۔

"اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ"۔ (التغابن : ۱۵)

(۵) سالک کو مناسب ہے کہ ماسویٰ اللہ ہر قسم کے تفکّرات اور وساوس کو دُور کر دے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :

"وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ" (الکھف ۲۴) (ای نسیت الغیر) یعنی جب تو ماسویٰ اللہ کو ترک کر دے تو اپنے اللہ کا ذکر کر ؎

آنانکہ بجز رُوئے تو جائے نگرانند
کوتاہ نظر انند چہ کوتاہ نظر انند

(۶) سالک کے لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ کلمہ طیبہ (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه) کا ذکر جاری رکھے۔ اللہ تبارک و تعالےٰ فرماتے ہیں ؎

(الاحزاب : ۷۰)

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا "یعنی اے ایمان والو! خدا سے

ڈرو اور کلمہ شریف لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ورد کرو ؎

رفتم بطبیبے کہ زحق آگاہ است ۔ بر تختِ ولایتِ حقیقت شاہ است

گفتم کہ دوائے دلِ بیمارم چیست ۔ خوش گفت کہ لا الٰہ الا اللّٰہ است

(۷) سالک کو چاہیئے کہ قدرتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے اور اس میں غور و خوض کرے ۔ جیسا کہ کلامِ ربانی میں ہے :

" اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ " ۔

یعنی جو لوگ کہ حالتِ قیام و قعود اور لیٹے ہوئے اپنے مولا کا ذکر کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی پیدائش اور ان کی نیرنگیوں میں سوچتے ہیں اور غور کرتے ہیں ۔ (آل عمران : ۱۹۱)

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

" تَفَکُّرُ سَاعَۃٍ خَیْرٌ مِّنْ عِبَادَۃِ سِتِّیْنَ سَنَۃً " کہ ایک گھڑی کا سوچنا اور غور کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے ۔ (احیاء علوم الدین، ج ۴، ص ۴۰۹)

؎ با ہر کہ ذکر و فکر نمودند ز ابتداء
ذکرش چو شہد آمد و فکرش چو انگبین

(۸) کھانے میں احتیاط اور اعتدال ہونا چاہیئے ۔ یعنی نہ بہت زیادہ کھائے اور نہ بہت کم ۔ کیونکہ اگر بہت کم کھائے گا تو ضعف کے سبب عبادت نہیں کر سکے گا ۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :

" کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا وَ لَا تُسۡرِفُوۡا " یعنی کھاؤ اور پیؤ اور اسراف نہ کرو ۔ (الاعراف : ۳۱)

؎ معتدل گشت ہر کہ اہل دل است
در جمیع امور معتدل است
ہر کہ بیروں ز اعتدال اُفتد !
زود در عرصۂ زوال اُفتد
چوں خوری بیش پیل باشی تو !
کم خوری جبرئیل باشی تو

(۹) ہمیشہ حلال کھائے اور حلال پہنے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (البقرۃ: ۱۶۸) "یعنی اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ کھاؤ" حدیث میں ارشادِ گرامی ہے کہ جو شخص چالیس یوم کسبِ حلال سے لقمہ کھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے دل کو منوّر فرماتے ہیں۔ اور اس کے قلب سے زبان کی طرف حکمت کے چشمے جاری ہو جاتے ہیں"۔
اور لباس! بہترین لباس جو تمہارا ہونا چاہیئے، وہ پرہیزگاری ہے۔
وَلِبَاسُ التَّقْوٰى خَيْرٌ۔

(۱۰) اعتکاف میں بیٹھنے سے پہلے اپنے شیخ طریقت سے اجازت ضروری ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں:
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ۔ "یعنی اے مسلمانو! خدا سے ڈرو اور ہمیشہ صادقین (اولیائے کرام) کی رفاقت اختیار کرو"۔
سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
اَلشَّيْخُ فِي قَوْمِهٖ كَالنَّبِيِّ فِي أُمَّتِهٖ وَمَنْ لَا شَيْخَ لَهٗ فَشَيْخُهُ الشَّيْطَانُ (التوبہ: ۱۱۹) "شیخ طریقت اپنی قوم میں ایسا ہے، جیسا نبی اپنی اُمت میں ہوتا ہے اور جس کا مرشد نہیں ہوتا وہ گمراہ ہو جاتا ہے"۔ ؎

شیطان ہر آنکس کہ بعالمش نباشد پیرے — از قول نبی مرید شیطان باشد

یعنی فرمانِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ جس شخص کا شیخ نہیں ہے، وہ شیطان کا مُرید ہوتا ہے ؎

تا تو نرسی بشیخ با حق نرسی — زیرا کہ میانِ شیخ و حق نیست دوئی

یعنی اے درویش! جب تک تو شیخ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو گا۔ خدا تک نہیں پہنچ سکے گا۔ کیونکہ شیخ اور حق کے درمیان دوئی نہیں ہے۔

(۱۱) ہمیشہ وضو سے رہنا چاہیئے۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ" ؎

باوضو باشش در ہمہ اوقات   تا ترا نورِ دل قرین باشد
بر وضو کس مواظبت نکند   غیر مومن کہ پاک دیں باشد

"قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَلْوُضُوْءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ" وضو مومن کا ہتھیار ہے اور وہ اس کے طفیل جن اور شیاطین کے شر سے محفوظ رہتا ہے۔

(۱۲) نیند نہ کر اور اپنا پہلو زمین پر نہ لگا۔ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (السجدہ : ۱۶)

؎ در خواب مشو کہ خواب با مرگ است جفت   از خواب کسے را گل شادی نشگفت
برخیز و نیاز کن بدرگاہِ خدا   کاندر لحدِ تنگ بسے خواہی خفت

؎ گر تو ہستی مرد عاشق شرم دار
خواب را با دیدۂ عاشق چہ کار

؎ چشمے کہ در دغار بود چوں خسپد   آنرا کہ غم یار بود چوں خسپد
اے آنکہ گنہ مے کنی و مے خسپی   آنکس کہ گناہگار بود چوں خسپد

(۱۳) معتکف کو چاہیئے کہ ہمیشہ روزہ دار رہے۔ جیسا کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے ؎

وَلَا اِعْتِکَافَ اِلَّا بِصَوْمٍ   وَلَا اِعْتِکَافَ اِلَّا فِیْ مَسْجِدٍ جَامِعٍ

یعنی "روزہ کے سوا اعتکاف درست نہیں اور اعتکاف ہمیشہ جامع مسجد میں ہونا چاہیئے"۔

(نوٹ) جامع مسجد کا ارشاد ثواب کی زیادتی کے لیے ہے۔ ورنہ محلے کی مسجد میں بھی اعتکاف جائز ہے۔

(۱۴) پانچوں وقت نماز کا باجماعت ادا کرنا اعتکاف کی نہایت ضروری شرط ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ"۔ "یعنی نماز باجماعت ادا کرو" (البقرہ : ۴۳)
ایک صاحبِ دل نے کیا خوب کہا ہے ؎

چوں نماز است احسن الاعمال　　　باجماعت نماز بگذارید

یعنی جب نماز احسن الاعمال ہے تو ضروری ہے کہ اسے جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے۔

(۱۵) معتکف کو چاہیئے کہ وہ دانائی حاصل کرے، تاکہ اُس کے ذریعے حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"فَقِیْہٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ"۔ "ایک فقیہ (عالم) شیطان کے مقابلے میں ہزار عابد کی طاقت سے زیادہ قوت رکھتا ہے"۔

یعنی اگر ہزار عابد مل کر شیطان کو بھگانا چاہیں تو شاید وہ نہیں بھگا سکیں گے۔ لیکن ایک باعمل عالم اُسے فوراً چاروں شانے چت گرا دے گا۔

(۱۶) معتکف کو لازم ہے کہ دُنیا کی فضول باتوں سے ہمیشہ اجتناب کرے اور خاموشی کو اپنا وطیرہ بنائے۔ کیونکہ خداوند کریم فرماتے ہیں:

"مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ"۔ "انسان جو کام کرتا ہے اور جو کچھ بولتا ہے۔ اُسے اُس کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ اس کی زبان پر پہرہ دار مقرر ہیں"۔ (ق: ۱۸)

لیکن مطلق خاموشی بھی دُرست نہیں۔ معتکف کو چاہیئے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے زبان بند نہ کرے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں آیا ہے:

"وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ"۔ (لقمان: ۱۷)

سخن بسیار دانی اندکے گو　　　یکے را صد مگو صد را یکے گو

(۱۷) معتکف کو چاہیئے کہ جائے اعتکاف سے سوائے حاجتِ انسانی (بول و براز) کے باہر نہ آئے اور اگر بلا عذرِ شرعی باہر چلا آئے گا، تو اس کا اعتکاف نہ رہے گا۔

(۱۸) ہمیشہ اپنی نظر اور معبود ذہنی عقبیٰ ہی کی طرف رکھے اور دُنیائے دوں کی طرف رغبت نہ کرے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں:

"وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْہَا وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ"۔ "یعنی جو شخص کہ آخرت کی کھیتی

چاہتا ہے، ہم اُس کی کھیتی میں برکت اور زیادتی عطا کریں گے اور جو شخص اس دُنیا کی کھیتی اور خیر و برکت چاہتا ہے، تو اُسے یہ عنایت کریں گے، مگر آخرت میں اسے کچھ نہیں ملے گا۔" (الشوریٰ : ۲۰)

نزدِ مرداں حُبِّ دُنیا زہرِ قاتل آمدہ است
زہر خوردن اے جواں جز کارِ حمقی کے بود

خُدا پرستوں کے نزدیک حُبِّ دُنیا زہرِ قاتل ہے اور زہر کا کھانا احمق ہی کا کام ہے۔

(۱۹) معتکف کو چاہئیے کہ دنیا کے عیش و آرام اور فانی نعمتوں سے مجتنب رہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

" وَمَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔ " یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے، وہ تو فنا ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے، وہ باقی رہنے والا ہے

سُرُوْرُكَ فِی الدُّنْيَا غُرُوْرٌ وَّ غَفْلَةٌ
وَعَيْشُكَ فِی الدُّنْيَا مَحَالٌ وَّ بَاطِلٌ

(۲۰) اپنے دل کو فضولیات سے پاک کرلے۔ جیسا کہ اللہ کریم فرماتے ہیں :

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؟ "کیا اللہ اپنے بندوں کے لیے کافی نہیں ہے ؟" (العنکبوت)

(۲۱) معتکف کو لازم ہے کہ دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کرے جیسا کہ اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں :

" وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا " یعنی جو لوگ ہماری طرف سعی اور جدّوجہد کریں گے۔ ہم انہیں اپنا راستہ دکھائیں گے۔"

وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الزَّاهِدُوْنَ فِی الدُّنْيَا الرَّاغِبُوْنَ فِی الْاٰخِرَةِ وَهُمُ الْاٰمِنُوْنَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ " حضرت سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو لوگ دُنیا سے کنارہ کش اور آخرت کے شائق ہیں، وہ قیامت کے دن امن میں ہوں گے۔"

(۲۲) معتکف کو ہمیشہ یادِ حق میں معروف رہنا چاہیئے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں :

"يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران: ۱۹۱) "میرے بندوں کا خاصا ہے کہ وہ ہر وقت مجھے یاد کرتے ہیں، خواہ قیام اور قعود میں ہوں، خواہ لیٹے ہوں۔"

ہر آں کہ غافل از حق یک زمان است
دراں دم کافر است امّا نہان است

۲) طالبِ مولیٰ کو چاہیئے کہ تلاوتِ قرآن پر مداومت کرے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ" (بنی اسرائیل: ۹) "یہ قرآن مجید ایسا راستہ دکھاتا ہے جو نہایت سیدھا اور مستقیم ہے۔"

وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

"آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ قرآن مجید اور روزے قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔"

۲۴) طالبِ مولیٰ کے لیے ضروری ہے کہ نفع ونقصان اور خیر وشر میں خداوند کریم کی تقدیر پر شاکر رہے اور رضائے الٰہی کو پیشِ نظر رکھے۔ اللہ جل جلالہٗ فرماتے ہیں:

"لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: ۷)

اے بندو! اگر تم شکر کرو، تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔"

حدیثِ قدسی میں آیا ہے کہ "نعمت کا عطا کرنا ہمارا کام ہے اور شکر کرنا تمہارا اور بلاء یعنی آزمائش ہماری جناب سے ہے اور اس پر صبر کرنا تمہارا فرض ہے۔ قضاء ہماری طرف سے ہے اور اس پر راضی ہونا تمہارا کام ہے۔"

ایک بزرگ کا قول ہے:

ہر کہ دریں بزم مقرب تر است
جامِ بلا بیشترش مے دہند

یعنی جو آدمی اس بارگاہ سے زیادہ مقرب اور پیارا ہے۔ اُسی کو آزمائش اور ابتلاء کا پیالہ زیادہ ملتا ہے۔

۲۵) طالبِ مولیٰ کو چاہیئے کہ اپنا سر ننگا نہ رکھے، بلکہ اُسے ڈھانپ کر رکھے۔

۲۶) معتکف کے لیے ضروری ہے کہ سر منڈائے اور موئے لب سُنّت کے مطابق رکھے۔

(۲۷) پاؤں ننگا رکھنا مناسب نہیں۔ جُوتے کا استعمال ضروری ہے۔

(۲۸) طالبِ مولیٰ کو مناسب ہے کہ آسمان کی طرف نگاہ نہ کرے اور اُوپر کو نہ دیکھے۔ ایک صاحبِ دل کا مقولہ ہے ع

سالکان از بارِ اندوہ بر نمی دارند سر

یعنی "سالک بارِ اندوہ سے سر نہیں اُٹھاتے"۔

(۲۹) معتکف کو چاہیئے کہ ایسے مشاغل اور تعلقات ترک کر دے جو اُس کے اور محبوبِ حقیقی کے درمیان حجاب کا باعث بنتے ہوں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

تعلق حجاب است و بے حاصلی　　　چو پیوند ہا بگسلی واصلی

"اُے انسان! یہ تعلقات اور دُنیاوی مشاغل حجاب ہیں اور جب تو یہ پردے اور مخمصے چھوڑ دے گا۔ واصل بحق ہو جائے گا"۔

(۳۰) ضروری ہے کہ معتکف اپنے آپ کو عجب اور تکبر سے بچائے رکھے۔ جیسا کہ حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں:

اَلْعُیُوْبُ کَثِیْرَۃٌ اَعْظَمُھَا اِعْجَابُ الْمَرْءِ بِمَا فَعَلَ مِنَ الطَّاعَاتِ۔ "کہ انسان میں یوں تو عیب بہت ہیں۔ مگر سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اپنی اطاعت پر گھمنڈ اور غرور کرے"۔

(۳۱) طالبُ المولیٰ کو چاہیئے کہ خلوت دین کی سلامتی کے واسطے اختیار کرے نہ کہ شہرت اور ناموری کے واسطے۔ کیونکہ اس شہرت میں آفت ہے ؎

گر شہرہ شوی بہ شہر شر الناسی　　　در گوشہ نشینی تو ہم از وسواسی

آں بہ کہ اگر خضرؑ اگر الیاسیؑ　　　کس نشناسد ترا کس را نشناسی

یعنی اگر تو جہاں میں شُہرت پیدا کرنا چاہتا ہے، تو شر الناس ہے اور اگر گوشہ نشین ہے تو بھی شہرت تجھے تباہ کر دے گی۔ بہتر یہ ہے کہ خواہ تو خضر اور الیاس کیوں نہ ہو۔ ایسی حالت اختیار کر کہ نہ تُو کسی کو جانے اور نہ کوئی تجھے پہچانے۔

(۳۲) تقدیرِ الٰہی پر کوئی اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کرنا چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ لَّمْ یَرْضَ بِقَضَائِیْ وَلَمْ یَصْبِرْ عَلٰی بَلَائِیْ وَلَمْ یَشْکُرْ عَلٰی نَعْمَائِیْ وَلَمْ یَقْنَعْ بِعَطَائِیْ فَلْیَطْلُبْ

سَیِّئَاسِوَائِیْ ۔ ” جو شخص میری تقدیر پر راضی نہیں ہوتا اور میری بلا پر صبر نہیں کرتا اور میری نعمتوں پر شاکر اور میرے عطیات پر قانع نہیں ہوتا۔ اس آدمی کو چاہیئے کہ کوئی اور خدا تلاش کرے ۔“

(۳۳) ایسے وساوس اور خطرات کو جو آفت میں ڈالنے والے ہیں، دل سے نکال دے ۔
اَلْخَوَاطِرُ هُوَ دَیْنٌ عَظِیْمٌ لِاَنَّ الْقَلْبَ مَالَمْ یَخْلُ مِنْ ذِکْرِ الْغَیْرِ لَایُؤَثِّرُ ذِکْرُ اللّٰهِ فِیْهِ اَصْلًا ۔
یہ شرط بے حد اہم ہے۔ کیونکہ جب تک انسان کا دل غیر سے خالی نہ ہو گا۔ خدا کا ذکر اس میں ہرگز اثر پیدا نہ کرے گا ۔

(۳۴) جمعہ بالالتزام ادا کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں ؛
لَااِعْتِکَافَ اِلَّا فِیْ مَسْجِدِ الْجَامِعِ ۔ یعنی اعتکاف ہمیشہ جامع مسجد میں ہونا چاہیئے ۔“

(۳۵) معتکف کو لازم ہے کہ کلمہ استغفار بلا ناغہ پڑھا کرے ۔ اللہ کریم فرماتے ہیں :
وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔
وَفِی الْخَبَرِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی یَا ابْنَ آدَمَ مِنْکَ الْاِسْتِغْفَارُ وَمِنِّی الْمَغْفِرَةُ ۔ یعنی ” اے اولادِ آدم ! استغفار تمہارا کام ہے اور مغفرت ہمارا کام ہے ۔“

(۳۶) موت ہمیشہ پیشِ نظر رہے ۔ حدیث میں آیا ہے :
لِکُلِّ شَیْءٍ اَصْلٌ وَفَرْعٌ فَاِنَّ اَصْلَ الطَّاعَاتِ ذِکْرُ الْمَوْتِ وَالطَّاعَةُ فَرْعُهٗ وَاِنَّ اَصْلَ الْمَعَاصِیْ نِسْیَانُ الْمَوْتِ وَالْمَعَاصِیْ فَرْعُهٗ ۔ یعنی ہر چیز کی اصل اور فرع ہوتی ہے ۔ عبادات کی اصل اور جڑ موت کا یاد رکھنا ہے اور اس کی فرع طاعت ہے ۔ اسی طرح سے گناہوں کی جڑ موت کا بھلا دینا ہے اور اس کی شاخ گناہ اور عصیان ہے ۔

بقول شاعر ؎

بامید وصالت می دہم جاں وگرنہ طاقتِ ہجراں کہ دارد !

یعنی اے اللہ ! تیرے وصال کی اُمید پر جان دیتا ہوں ۔ ورنہ کسے توفیق ہے کہ وہ ہجر برداشت کر سکے ۔

(۳۷) سالک کو چاہیئے کہ ہمیشہ عذاب الٰہی سے خائف رہے اور گریہ سے محبت رکھے

ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

گریہ گر کس کند برائے خدا عفو سازد خدا گنہ او را

گرچہ باشد گناہ آنکس را بیشتر از ستارگان سما ع

یعنی کسی شخص کے گناہ خواہ آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ اگر وہ بارگاہِ الٰہی میں روئے اور زاری کرے تو اللہ کریم اُس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔

حضورؐ فرماتے ہیں:

مَنْ بَکیٰ نَفْسَہٗ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ ضَاحِکًا۔ "جو شخص خوفِ خدا سے روتا ہے۔ خداوند کریم اُسے اس حال میں بہشت میں داخل کریگا کہ وہ ہنس رہا ہوگا"۔

(۳۸) معتکف کو لازم ہے کہ محبوبِ حقیقی کے دیدار کا آرزومند اور اُس کی رحمت کا طلبگار رہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ "اے میرے بندو! میری رحمت سے نا اُمید نہ ہونا۔ جس پر اپنا فضل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے سارے گناہ بخش دیتا ہوں۔ ایک صاحبِ حال کا ارشاد ہے ؎

بخشش و فضلِ حق نہ عدیاں ہست ایں قول در جہاں شائع

آنکہ بر کافراں بنجشاید مُسلماں را کجے کند ضائع

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالےٰ کی بخشش وفضل کا شمار نہیں ہو سکتا، تو پھر وہ رحیم و کریم خدا جو کافروں پر بھی عنایت کرتا ہے مُسلمان کو کیسے محروم رکھ سکتا ہے؟

(۳۹) بول و براز کے متعلق جو آداب مقرر ہیں، ان کا بھی خیال رکھے۔

(۴۰) ضروری ہے کہ خلوت میں بھی ادب پیشِ نظر رہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: جو شخص بے ادب ہے، اُسے شرف حاصل نہیں ہوگا۔ یعنی ادب میں عزت ہے ؎

بے ادب مرد کے شود مہتر گرچہ او را جلالتِ نسب است

؎

ادب تاجیست از لطفِ الٰہی بنہ بر سر برو ہر جا کہ خواہی

؎ با ادب باش تا بزرگ شوی — کہ نتیجۂ بزرگی ادب است

رسالہ کے آخر میں اعتکاف میں بیٹھنے کی ترغیب دی گئی ہے جو چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کلام کس بزرگ کے فکر رسا کا نتیجہ ہے۔ ہم ان اشعار کو علی حالہ یہاں درج کر رہے ہیں ؎

اے دل بیا بکوئے وفا خلوت گزیں — در سلک سالکاں برہ بے نشاں نشیں
از ہر چہ غیر دوست نباید اے دل — وانگہ بحق نمائی تو لی چو اہلِ دیں
تجرید شو ز ہر چہ دریں رہ نہ در خواست — بر آستانِ دوست برآور یک اربعیں
تا ہر کدور تیکہ بود با صفا شود — از دستِ دیو نفس ز ہر جانِ نازنیں
پس نورِ حق مشاہدہ افتد ترا بسر — مرآت روئے دوست شوی از سر یقیں
سلطانِ تختِ مملکت سرمدی بعشق — شاہے بود کہ کسب کند دولتِ چنیں

قلمی نسخے

حضرت مخدوم لال عیسن رحمۃ اللہ علیہ (کروڑ لال عیسنؒ) کے مزارِ مبارک کے سرہانے ایک قلمی قرآن شریف رکھا ہے۔ اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ پہلے یہ حضرت کے مقبرہ شریف میں رکھا ہوا تھا۔ جب شیخ لال عیسنؒ ملتان سے کروڑ تشریف لائے تو اس بے بہا تبرک کو بھی ہمراہ لیتے آئے۔ نیاز مند نے کروڑ پہنچ کر اس تحفہ کی زیارت کی ہے۔ رسم الخط تو چھٹی صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں حضرت کے دستخط یا کوئی ایسی تحریر نہیں مل سکی جس سے اس دعوے کی توثیق ہو سکتی۔

کشف المحجوب کا قلمی نسخہ

اسی طرح "العزیز" بہاول پور کے شمارہ فروری ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلامؒ نے سید علی ہجویریؒ کی مشہورِ عالم تصنیف "کشف المحجوب" کو بھی اپنے ہاتھ سے سپردِ قلم فرمایا تھا۔ یہ قیمتی نسخہ پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب ایم اے مترجم عجائب الاسفار کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد جب ان کے خاندان کی حفاظت نہیں ہو سکی۔ ان کا علمی خزانہ کہاں محفوظ رہا ہو گا۔ خاکسار نے ان کے قریبی رشتہ داروں

سے ہر چند دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس گنجِ شاہیگاں کا پتہ نہیں چل سکا۔

چند سال گزرے اورنٹیل کالج لاہور کے ریٹائرڈ پرنسپل پروفیسر محمد شفیع ایم اے نے یہ انکشاف کیا کہ کشف المحجوب کا وہ نسخہ جس کی ڈھونڈیا پڑ رہی تھی، میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ اُن کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند جناب احمد ربانی صاحب نے محکمہ اوقاف پنجاب سے رابطہ پیدا کیا اور اس سے اس نسخہ کی طباعت کے لیے گراں قدر رقم حاصل کی۔ جب یہ نسخہ چھپ کر منظرِ عام پر آیا، تو اربابِ فہم و ادراک یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس پر تکمیلی دستخط ۶۶۲ھ کے ہیں۔ حالانکہ حضرت شیخ الاسلامؒ کا موثق شہادتوں سے ۶۶۱ھ میں فوت ہونا ثابت ہے۔

محدّث دہلویؒ کی شہادت

محدّث دہلویؒ حضرت مخدوم سید جمال الدین موسیٰ پاک شہید علیہ الرحمۃ کے مرید تھے اور کافی عرصہ ملتان میں اپنے مُرشد کے قدموں میں رہ کر انہوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اخبار الاخیار" لکھی۔ آپ اکثر حضرت شیخ الاسلامؒ کے آستانِ پاک پر حاضر ہُوا کرتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے شیخ الاسلامؒ کی جو تاریخِ وفات لکھی ہے، وہ اپنے اندر خاصا وزن رکھتی ہے۔ آپ شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ کی وفات کا ذکر اس طرح سے کرتے ہیں:

"متوفی رحمۃ اللہ سابع صفر ۶۶۱ھ (ص ۲۸۴)

حضرتِ مخدوم سیّد جلال بُخاریؒ کا بیان

حضرت مخدوم سید جلال بخاریؒ حضرت شیخ الاسلامؒ کے مرید صادق، مصاحب، یارِ غار اور خلیفۂ اعظم تھے۔ اپنے مُرشد کے انتقال کے وقت مُلتان میں موجود تھے اور شیخ کے غسل اور تکفین و تدوین میں شریک رہے۔ اُنھوں نے اپنے مُرشد کے حالات بڑی احتیاط سے قلمبند فرمائے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے حالات پر مخدوم سید جلال بخاریؒ کا یہ تذکرہ ہر زمانے میں سند مانا گیا ہے۔ دُوسری تمام روایات اس کے مقابل ہیچ ہیں۔ آپ کا اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش ملاحظہ ہو:

"(شیخ الاسلام) رحلت فرمود من دار الفناء الی دار البقاء یوم الثلثاء بعد اداء الظہر

قرب دخول وقت العصر فی السابع من شہر الصفر سنۃ احد وستون وست مائۃ و
کان عمرہٗ ستۃ وتسعون ۔"
(یعنی ، ۷ صفر ۶۶۱ھ)

حضرت محدث دہلویؒ اور سید السادات جلال بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی موثق شہادتوں
کے بعد یہ امر طے شدہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت کا سنہ وفات ۶۶۱ھ ہے ۔ اس لیے
کشف المجوب کا یہ نسخہ جو جناب احمد ربانی صاحب نے طبع کرایا ہے ، اس کا انتساب
حضرت شیخ الاسلام زکریا ملتانیؒ سے صحیح نہیں ۔

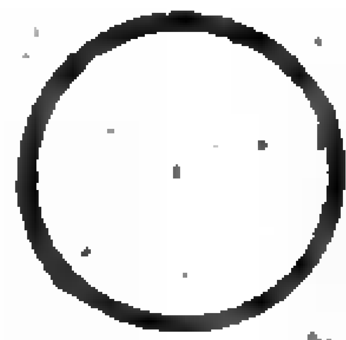
اگر بفرض محال جناب احمد ربانی صاحب کے دعویٰ کو صحیح مان لیا جائے کہ حضرت
شیخ الاسلامؒ کا انتقال ۶۶۵ھ میں بعمر سو برس ہوا تھا ۔ تو کیا کوئی صاحب فہم و ادراک
یہ تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گا کہ ۹۶ برس کی عمر میں بھی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں ۔ کیا وہ دُنیا
میں کوئی فرد واحد ایسا دکھا سکتے ہیں ، جس نے ۹۶ برس کی عمر میں اتنی ضخیم کتاب قلمبرداشتہ
لکھی ہو اور پھر ایسے حالات میں جبکہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں میر حسینیؒ ،
سید جلال بخاریؒ ، سلطان التارکین حمید الدین حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الاسلامؒ کے
صاحبزادوں کے علاوہ بے شمار عربی اور فارسی کے اساتذہ اور خطاط موجود تھے ۔

انہیں کیا پڑی تھی کہ خود ضعیفی کے اس عالم میں ، جبکہ مشہور یہ ہے کہ آخیر میں حضرت
نے دُنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا اور ہر وقت عبادتِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے ، کشف المجوب
لکھنے کی زحمت گوارا کرتے ۔ لہٰذا ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ نسخہ جسے احمد ربانی صاحب
نے اتنے اہتمام سے محکمہ اوقاف کی مدد سے طبع کرایا ہے ، حضرت شیخ الاسلامؒ کا
لکھا ہوا نہیں ہے ۔

نیز جہاں تک "دستخط" کا تعلق ہے ، یہ اس لیے بھی حضرت کے نہیں کہ "بہاء الدین"
حضرت کا نام نہیں ، لقب ہے اور نام آپ کا "زکریا" ہے اور ابو محمد کنیّت ہے ۔
اسی طرح آپ کے صاحبزادے کا نام "محمد" اور لقب "صدر الدین عارف" ہے ۔ کوئی شخص
دستخط کرتے وقت اپنے نام کے ساتھ لقب درج نہیں کرتا ۔ یعنی کوئی عالم اس طرح سے

دستخط نہیں کرے گا۔ "شمس العلماء محمد شفیع بقلم خود" بہاء الدین صرف حضرت شیخ الاسلامؒ کا ہی نام نہیں۔ خواجہ بہاء الدین نقشبند، مولانا بہاء الدین مفتی آگرہ۔ سید بہاء الدین بخاری ایسے ہزاروں افراد گزر چکے ہیں۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ کسی نے حضرت کے نام پر اپنے بیٹے کا نام بہاء الدین زکریا رکھ دیا ہو۔ اور اس نے ۶۶۴ھ میں کشف المحجوب کا زیر بحث نسخہ کتابت کیا ہو۔ آج کل ایسے نام عام ملتے ہیں، جن میں نام کے ساتھ تخلص کو بھی اپنا لیا گیا ہے۔ جیسے گوجرانوالہ کے مرحوم مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ، مرحوم کمشنر ملتان سید محمد قاسم رضوی، عثمان غنی اور علی المرتضےٰ وغیرہ۔

سب سے بڑا ثبوت اس مخطوطہ کے جعلی ہونے کا یہ ہے کہ حضرت شیخ الاسلامؒ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا قرآن مجید جو کروڑ ضلع مظفر گڑھ میں حضرت مخدوم لال عیسن قدس سرہٗ کی اولاد کے پاس محفوظ ہے، اس نسخہ کا خط اس مصحف مقدس کے خط سے نہیں ملتا۔ اس لیے جناب احمد ربانی صاحب کے دعوے میں کوئی وزن نہیں ہے۔




دوست
بدوست رسید

حضرت شیخ الاسلامؒ نے کافی عُمر پائی تھی۔ اس لیے آپ کو کئی بادشاہوں کا دور دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ سلطان شمس الدین التمش جو علماء اور مشائخ کے بڑے قدر دان تھے۔ ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ کو فوت ہو گئے۔ ان کے بعد شہزادہ رکن الدین مسند نشین ہوئے، مگر چند ماہ بعد معزول کر دیئے گئے۔ ان کی جگہ سلطان التمش کی جواں ہمت شہزادی رضیہ تخت پر بیٹھی لیکن ۳½ برس کے بعد وہ بھی شہید کر دی گئی۔ اسے حضرت شیخ الاسلامؒ سے گہری عقیدت تھی۔ اپنی عملداری کے زمانہ میں جب وہ ایک بغاوت فرو کرنے کی غرض سے پنجاب آئی، تو اُس نے ملتان پہنچ کر حضرت کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا اور ایک آباد موضع لنگر کے لیے نذر گزارا۔

۲۸ رمضان ۶۳۷ھ کو معزالدین بہرام شاہ نے آبائی تخت سنبھالا۔ لیکن ابھی اُسے دو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ مخالف امراء نے تخت سے اُتار کر قتل کر دیا۔ اب بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکومت التمش کے خاندان سے رخصت ہو چکی ہے۔ امرائے سلطنت نے ملک اعزالدین بلبن کو تخت پر لا بٹھایا۔ لیکن ابھی اُس کا پہلو بھی گرم نہ ہُوا تھا کہ یاروں نے بازو سے پکڑ کر نیچے اُتار دیا۔ بقول ذوق ؎

بیٹھنے پائے بھی نہ تھے کہ نکالے بھی گئے

امراء پھر دوڑے اور سلطان رکن الدین کے بیٹے علاءالدین مسعود کو قصرِ سفید سے نکال لائے۔ یہ شہزادہ اپنے چچاؤں ناصر الدین اور جلال الدین کے ہمراہ اس محل میں قید و بند کی سختیاں جھیل رہا تھا۔ تخت پر بیٹھا تو چچوں کی مصیبت کا احساس ہُوا۔ چنانچہ ملک جلال الدین کو تو قنوج مرحمت کیا اور ناصر الدین کو بہرائچ۔ لیکن تخت و تاج اُسے بھی راس نہ آیا۔ چار سال بعد امراء اس سے بھی تنگ آ گئے۔ اُنھوں نے شہزادہ ناصر الدین کو خفیہ عرضداشت بھیجی کہ دہلی کا تخت خالی

میں ہے۔ آپ فوراً تشریف لے آئیں۔

ناصر الدین نے دہلی کا رُخ کیا۔ اس سفر میں اس کی والدہ ملکہ جہاں ہمراہ تھی۔ اس نے مشہور کیا کہ سلطان بیمار ہے اور علاج کی غرض سے دہلی جارہا ہے۔ اسے ایسا وہم تھا کہ جب رات ہوتی تو ناصر الدین کے منہ پر نقاب ڈال دیتی تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ اس رازداری سے بیٹے کو دِلی لے آئی کہ کسی کو علم تک نہ ہو سکا۔ الغرض ۲۳ محرم ۶۴۴ھ کو قصر سبز میں سلطان ناصر الدین نے اپنے باپ کے تخت پر قدم رکھا۔ غیاث الدین بلبن کو وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان عنایت کیا اور سلطنت کے تمام کاروبار اس کے اعتماد پر چھوڑ دیئے اور اُسے تمام اعیانِ سلطنت کی موجودگی میں کہہ دیا کہ ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ خدا کے رُوبرو اس کے جواب سے تجھے شرمندہ ہونا پڑے۔

سچ یہ ہے کہ اس وزیر نے نمک کا حق ادا کیا اور سلطنتِ ہند کو جو چند سالوں سے بازیچۂ اطفال بنی آرہی تھی، ہر لحاظ سے مضبوط بنا دیا۔ کسی امیر کو یہ جرأت نہ تھی کہ اُس کے آگے دم مار سکے۔ اس نے اپنے عم زاد بھائی شیر خان کو سرحدی صوبوں کا حاکم مقرر کیا جس میں غزنی۔ کابل۔ قندھار۔ بلخ۔ ہرات۔ لاہور۔ اُچ اور ملتان سب شامل تھے۔ یہ بڑا منتظم اور بہادر سپہ سالار تھا۔ اُس نے اچھا انتظام کیا۔ صاحبِ تذکرہ ملتان کا بیان ہے کہ سلطان ناصر الدین ۶۴۹ھ میں براستہ لاہور ملتان تشریف لائے ہیں۔ اس نے شیخ الاسلامؒ کی خدمت میں حاضری دی اور خدامِ بارگاہ کو خلاعِ فاخرہ اور انعام و اکرام سے مالامال کیا۔

سلطان ناصر الدین باپ کی طرح ایک متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ اگرچہ اس کا دربار نہایت مکلف ہوتا۔ مگر گھر کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ ملکہ سلیمہ بیگم اپنا کھانا خود پکاتی تھی۔ ایک دن اس نیک بخت نے عرض کی کہ روٹی پکانے میں ہاتھ جلتے ہیں، کوئی لونڈی خرید لو۔ فرمایا۔ بیت المال رعایا کا حق ہے۔ میرا اس میں کچھ حصّہ نہیں ہے کہ روپیہ لے کر لونڈی خرید لوں۔ صبر کر۔ خدا اس کا اجر دے گا۔ غرض ساری عمر درویشی میں بسر کر دی اور ایک کوڑی تک شاہی خزانے سے قبول نہ کی۔ ہمیشہ قرآن شریف کی کتابت سے گزر اوقات کرتا رہا۔

اتفاقاً ایک امیر اس کے ہاتھ کا لکھا ہُوا قرآن مجید زیادہ قیمت میں لے گیا۔ اسے علم ہوا تو بڑا فکر مند ہُوا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن شریف مخفیہ طور پر بیچنے لگا۔

سلطان کا ایک مصاحب "محمد" نامی تھا۔ یہ ہمیشہ اُسے نام سے پکارا تا تھا۔ ایک دفعہ اُسے نام سے نہ پُکارا بلکہ فرمایا۔ تاج الدین ادھر آ اور یہ کام کر۔ محمد کام کر کے گھر جو گیا۔ پھر تین دن تک بادشاہ کی خدمت میں حاضر نہ ہُوا۔ سلطان نے آدمی بھیج کر اُسے طلب کیا اور غیر حاضری کا سبب دریافت فرمایا۔

مصاحب نے دست بستہ عرض کی کہ حضور نے مجھے خلافِ عادت تاج الدین کہہ کر پکارا تھا۔ اس لیے مَیں نے محسوس کیا کہ حضور غلام پر ناراض ہیں۔ اسی رنج میں تین دن گھر سے نہیں نکلا۔

سلطان نے فرمایا۔ اے عزیز! مجھے تم پر کوئی رنج نہیں ہے۔ اُس دن میں وضو سے نہیں تھا۔ بغیر وضو "محمد" کا نام لیتے ہوئے مجھے شرم آئی۔ اس لیے تاج الدین کہہ کر پکارا۔

مُغلوں کا دُوسرا حملہ

سلطان ناصر الدین نے اگرچہ شیخ الاسلامی کا منصب بدستور سابق حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ العزیز سے منسوب کر رکھا تھا۔ لیکن اس بارے میں تاریخیں یکسر خاموش ہیں کہ حضور ناصر الدین کے زمانے میں کبھی دہلی تشریف بھی لے گئے یا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام ان دنوں گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ دہلی میں انہوں نے یا تو اپنا کوئی نائب مقرر کر رکھا ہو گا یا کاغذات بغرض فیصلہ یہاں آتے ہوں گے۔

ملتان کی صوبیداری پر جب تک شیر خان ممتاز رہا۔ اس شہر پر کسی بیرونی حملہ آور نے حملہ نہیں کیا۔ لیکن اعز الدین بلبن کے زمانے میں مغلوں نے پھر ایک خوفناک حملہ کیا۔ اعز الدین بلبن شمس الدین التمش کا ایک مقتدر امیر تھا۔ معز الدین بہرام شاہ کے بعد لوگوں نے اسے بھی تخت پر لا بٹھایا تھا۔ اگر کوئی اور بادشاہ دلی کے تخت پر بیٹھتا تو اُسے زندہ نہ چھوڑتا لیکن ناصر الدین کے رحم و کرم نے اُس کی جان لینا گوارا نہ کی۔ نہ صرف خطا معاف ہوئی بلکہ بدستور

سابق اُسے نظامت کا عہدہ بھی مرحمت ہوا۔ لیکن بیوقوفوں کے بہکانے سے رہ رہ کر اُس کے دماغ میں بادشاہی کا مروڑ اُٹھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ناگور اور اُچ میں متواتر بغاوتیں کیں۔ سلطان نے اسے شکستِ فاش دی۔ لیکن جب وہ تلواروں کی چھاؤں میں ننگے سر پیش ہُوا تو رحمدل شہنشاہ نے نہ صرف اُسے معاف کر دیا۔ بلکہ اُسے اپنی جاگیر بھی واپس دے دی۔ مگر اس کا باطن صاف نہیں تھا۔ چنانچہ ۶۵۲ھ میں اس نے مغلوں کو ملتان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ وہ تو موقع کی تاک میں تھے۔ شہ پاکر بگولے کی طرح اُٹھے اور گھٹا کی طرح چھا گئے۔ بُرج اور مورچے گرا کر قلعہ اور شہر کو غیر محفوظ کر دیا۔ شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہونے کو تھا کہ حضرت شیخ الاسلامؒ اپنے محل سے ایک لاکھ درہم نقد لے کر پہنچے اور مغل سرداروں کو دے کر شہر کو تباہی سے بچا لیا۔ مغل یہاں سے ہی واپس لوٹ گئے۔ سلطان کو اطلاع ہُوئی تو اعزالدین کو معزول کر کے شیر خاں کو اسکی جگہ اُچ اور ملتان کا ناظم مقرر کر دیا۔

آخری منزلیں

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اب اپنی زندگی کی آخری منزلوں سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ حضور ۹۶ سال کی لیل و نہار کے سمّے ادلتے بدلتے دیکھ چکے تھے۔ لیکن آپ کی جسمانی صحت آخرین لمحات تک قابلِ رشک رہی۔ حضرت زندگی بھر بیمار نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ سر میں بھی درد تک نہیں پڑا۔

حضرت جب اس سرزمین میں تشریف لائے تھے، یہ علاقہ کفر و الحاد کا گھوارہ بن رہا تھا۔ لیکن اب کایا پلٹ چکی تھی۔ ملک کے طول و عرض میں ہزاروں مبلغین حضرت کے اشارہ پر مئے توحید کے خم لنڈھاتے پھرتے تھے اور چپہ چپہ پر قرآن و حدیث کے درس جاری تھے۔ عروس البلاد ملتان کو حضرت کے یارانِ بے ریا اور اکابر خلفاء نے بقعۃ الاسلام بنا رکھا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت جس مقصد کے لیے اس مینو سواد خطہ میں تشریف لائے تھے، وہ کافی حد تک پُورا ہو چکا ہے۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ ملکِ عدم کا مسافر نئے سفر کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ حضرت تمام دن حُجرہ شریف میں معتکف رہنے لگے تھے۔ صرف نماز باجماعت ادا کرنے کے لیئے مسجد میں تشریف لے آتے تھے اور پھر حُجرہ میں چلے جاتے۔

کسی کو حُجرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ خدامِ بارگاہ بھی حاضر ہوتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ ایک شام کو جب خادم چراغ لے کر اندر جانے لگا تو حضرت قطب الاقطاب رکن الدین نے اُسے روک دیا اور فرمایا:

"حجرہ انوارِ الٰہی سے جگمگا رہا ہے، چراغ لے جانے کی ضرورت نہیں۔"

خادم نے ٹھٹک کر حضرت کے سراپا پر نظر کی، گویا وہ زبانِ حال سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ حضور! ایسے عالم میں آپ اندر جانے سے کیوں روکتے ہیں۔ یہی وقت تو اندر جانے کا ہے۔

قطب الاقطاب نے مکرر فرمایا:

"بھلے میاں! اندر مت جاؤ۔ ورنہ بے ہوش ہو جاؤ گے۔ اس نور کی تاب تم کہاں لا سکتے ہو۔"

آخری وصیتیں اسی لیل و نہار میں ایک روز اپنے بڑے صاحبزادے شیخ صدر الدین عارف کو طلب فرمایا اور ارشاد کیا:

"برخوردار! اُچ میں ایک درویش رہتا ہے جو جوہرِ لطیف رکھتا ہے اور صاحبِ استعداد ہے۔ اس نے اب تک کسی درویش کا دامن نہیں پکڑا۔ اُس نے ہمارے خانوادہ سے پورا نصیبہ حاصل کرنا ہے۔ اگرچہ وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکا لیکن میرے انتقال کے بعد وہ تمہاری طرف متوجہ ہوگا اور خرقہ کی درخواست کرے گا۔ اس وقت "جذبۂ حق" نے اُس پر مجذوبانہ کیفیت طاری کر رکھی ہے۔ جب وہ تیری خدمت میں حاضر ہو پہلے دن اُسے ملاقات کا موقع نہ دینا، بلکہ تین دن تک تخلیہ میں بٹھا کر قرآن مجید کی تلاوت کرانا تاکہ وہ جذب و مستی کے غلبہ سے باہر نکل آئے اور شعور کے ساتھ آدابِ صحبت بجالانے کے قابل ہو سکے۔ اس کے بعد طلب کر کے اُسے اپنی

لہ ملفوظ المخدوم از حضرت مخدوم جہانیاں، جہاں گشت بخاریؒ، ص۱۳۵

ارادت میں داخل کہ تا شیخ الشیوخ شہاب الملتہ والدین کے خرقہ مبارک کے سوا باقی تمام تبرکات جو لباس پر مشتمل ہیں، بحصہ برابر اُسے بانٹ دینا اور کہنا "نصف لی و نصف[1] لک"

پُراسرار قاصد

۷ رصفر ۶۶۱ھ بروز منگل حسبِ معمول ظہر کی نماز پڑھ کر حضرت شیخ الاسلامؒ حجرہ میں تشریف لے گئے۔ حضرت صدر الدین عارفؒ کچھ دیر خانقاہ اور حجروں کا جائزہ لیتے رہے۔ تمام درویشوں کو مصروفِ عبادت پاکر قبلہ گاہ کے حُجرہ کی طرف لوٹ آئے۔

حضرت شیخ الاسلامؒ، عارف باللہ کے نہ صرف والد ماجد تھے بلکہ مُرشد بھی تھے یہ دونوں رشتے محبوبیت کے درجہ تک پہنچ چُکے تھے۔ ان دنوں چُونکہ حضرت کے طرزِ عمل سے فراق کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس لیے یہ سعادت مند فرزند اور مرید صادق کی مانند سایہ کی طرح حضرتؒ کے ساتھ چمٹے رہتے تھے اور جب وہ حُجرہ میں تشریف لے جاتے تو یہ پروانہ وار حجرہ پر تصدق ہوتے رہتے۔ اس دن دروازے کے پاس کسی نامعلوم فکر میں کھوئے سے کھڑے تھے کہ دفعتہً ایک نُورانی چہرہ کے مقدس بزرگ نمودار ہُوئے۔ سبز رنگ کا ایک سربمہر خط پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ملفوف کو اسی وقت شیخ الاسلامؒ کی خدمت میں پہنچا دیجئے۔

اس خط کا عنوان عجیب قسم کا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس پر یہ کلمات درج تھے: "اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً"[2] آپ سہم گئے۔ خط والد بزرگوار کی خدمت

[1] مے گویند کہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الملتہ والدین بشیخ صدر الدین چنیں نصیحت کرد کہ اور ادر کنار نگیری مبادا تمام نعمت ازتو اخذ نماید۔ پس نعمت دہی و بگوئی "نصف لی و نصف لک" ایں امر غیر واقعہ معلوم مے شود ازانکہ ایں سخن در میزان درویشی وزنے ندارد کہ مرید از پیر خود نعمت کشد و اورا خالی کند۔ بلکہ پیر بہر کرا نعمت ایثار مے نماید۔ از خزانہ جاودانہ حضرت عزت مے رساند کہ در انجا ہیچ تنقیصے نیست۔ (سیر العارفین از مولانا جمالیؒ، قلمی صہ ۲۸) [2] الفجر: ۲۸۔

میں پیش کر کے باہر آئے، تو قاصد کو نہ پایا۔ اسی اثناء میں حُجرے کے چاروں گوشوں سے آواز بلند ہوئی :

" دوست بدوست رسید "

عارف باللہ گھبرا کر واپس لوٹے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت کا سرِ نیاز سجدے میں ہے اور روح اعلی علیین کو پرواز کر چکی ہے۔

سچ ہے ؎

در کوئے تو عاشقاں چناں جاں بدھند
کانجا ملک الموت نگنجد ہرگز !

شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ ہر طرف بجلی کی سی سرعت کے ساتھ یہ اندوہناک خبر پھیل گئی۔ چھوٹے بڑے، ہندو، مسلمان سب کے سب آستانہ عالیہ پر جمع ہو گئے۔ حجرہ شریف ایک بے مثال خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اور

- وہ ذاتِ گرامی جو آفتاب عالمتاب کی طرح بلا امتیاز رنگ و ملت ہر مسلم غیر مسلم پر برابر مہربان تھی۔
- جس کی جنبشِ لب مسیحائی کا کام کرتی تھی۔ جس کی مسکراہٹ پر دل قربان ہوتے تھے۔
- جس کے کلماتِ طیبات دلوں کی کائنات میں ہلچل ڈال دیتے تھے۔ جس کے چہرے کا دیدار ایمان کو تازہ کرتا تھا۔ جس کے قدموں میں ارادت مندوں کو دین و دنیا کی تمام نعمتیں اور سعادتیں نظر آتی تھیں۔
- جس نے اپنی زندگی میں ملتان پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔
- جس نے مکران سے کشمیر اور قندھار سے دہلی تک کی سرزمین کو کفر و ظلمت سے نجات دلا کر اسلام کے حسین و جمیل سراپا سے متعارف کرایا تھا۔
- وہ شیرِ حق! جس سے التمش، ناصر الدین قباچہ اور دیگر عمائدینِ سلطنت لرزہ براندام رہتے تھے، آج اس کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے اعلیٰ علیین کے فرحت بخش مقام پر پہنچ چکا تھا۔ طریقت و معرفت کا نیرِ اعظم غروب ہو گیا، شریعتِ محمدیہ کا

ماہِ کامل چھپ گیا۔ دنیا تاریک ہوگئی۔ جہان غوث الاغواث اور قطب الاقطاب کے بابرکت وجود سے خالی ہوگیا۔ عرب و عجم، مصر و شام اور ہند و سندھ کے لاکھوں وابستگانِ درگاہ یتیم ہوگئے۔ کروڑوں آدمیوں کے سروں سے روحانی باپ کا سایہ اٹھ گیا۔

آہ! وہ مردِ کامل رخصت ہوگیا، مرید زندہ ہیں، مگر مراد نہیں۔

اور وہ جسدِ اطہر!

- جس کی آنکھیں زندگی بھر خوفِ الٰہی سے وقف اشکباری رہیں۔
- جس کی زبان لمحہ بھر ذکرِ الٰہی سے غافل نہ ہوئی۔
- جس کے نورانی ہاتھ ہمیشہ محتاجوں کو درہم و دینار دینے اور بارگاہِ الٰہی میں التجاو استغاثہ کے لیے اُٹھتے رہے۔
- جس کے پاؤں رات بھر قیام میں رہنے کے سبب متورم ہوجایا کرتے تھے۔
- جس کا وجود دوست دشمن سب کے لیے یکساں مفید اور مسعود تھا۔
- جس نے عراقیؒ، میر حسینیؒ اور سید جلالؒ جیسے ہزاروں خاصانِ خدا کو قطبیت کے درجے پر پہنچا دیا تھا۔

آج!

ایک تختہ پر حیاتِ سرمدی کی چادر تانے استراحت فرما تھا اور شیخ عمر عمودیؒ اسے آخری غسل دینے میں مصروف تھے۔

جب تجہیز و تکفین سے فارغ ہوگئے تو لاکھوں آدمیوں نے حضرت شیخ الاسلام صدرالدین محمد رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی امامت میں نمازِ جنازہ ادا کی اور اس خانقاہ شریف میں جہاں حضرت سالہاسال تک مصروفِ عبادت رہے تھے، سپردِ خاک کر دیئے گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

کئی ماہ تک اطرافِ عالم سے گروہ در گروہ لوگ روتے، پیٹتے، چیختے، چلاتے تعزیت کو آتے رہے۔ رات کو سرائے میں ٹھہرنے والے حجرہ نشینوں درویشوں اور مستقل خدام کے علاوہ مہمانوں کی تعداد پانچ سو، سات سو اور کبھی ایک ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ ان سب کو

ان کے مرتبہ کے لحاظ سے کھانا اور بستر وغیرہ ملتا تھا۔ خلاصۃ العارفین کا مؤلف حضرت کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :

"شیخ الکبیر المنیر، قطب العٰلمین، غوث الثقلین، مخدوم العالم شیخ بہاؤ الدین، بہاء الحق والشرع والحقیقت والطریقت والدین ابو محمد ذکریا رحلت فرمودمن دار الفناء الی دار البقاء یوم الثلثاء بعد اداء الظہر حین قرب دخول وقت العصر فی السابع من شہر الصفر سن احدٌ و ستون و ست مائۃ و کان عمرہ ستۃ و تسعون غسلہ شیخ عمر عمودیؒ وصلی علیہ شیخ الاسلام ابو المغانم صدر الدین محمد رحمۃ اللہ علیہ والمدفون فیہا دخل الحصن القدیم فی حجرتہٖ وجاء الناس من بلادٍ شتی افواجا وافزاعا کلّھم اضیاء فھم و بلغ جماعۃ الاضیاف فی بعض الاوقات من خمس مائۃ الی سبع مائۃ و الی الف سوی سکنۃ الرباط والحجرات والعملہ"

(دستخط مولانا ضیاء الدین ملتانی ۱۳۰۳ھ)

پاک پٹن میں غائبانہ جنازہ جس دن حضرت شیخ الاسلامؒ نے دارِ فانی سے عالمِ بقاء کو انتقال فرمایا، حضرت فرید الدین مسعود گنج شکرؒ پاک پٹن میں تھے اور ذکر اور مراقبہ میں مصروف تھے۔ دفعتہً آپ پر غشی کا عالم طاری ہوگیا۔ جب اس حالت کو کافی دیر گزر گئی، تو خدام کو سخت فکر ہوئی۔ ایک صاحب حجرہ شریف سے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا خرقہ اٹھا لائے اور اسے حضرت کے اوپر ڈال دیا۔ اس سے آپ ہوش میں آگئے اور آبدیدہ ہو کر شیخ عبد اللہ بلخی کی طرف دیکھا۔ فرمایا :

"آج برادرم بہاء الدین کا وصال ہوگیا۔ میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے کہ ایک ہزار فرشتے ان کے آگے اور شیخ شہاب الدین سہروردی ان کے پیچھے ہیں اور شیخ بہاء الدین کو آسمان کی طرف لیے جاتے ہیں۔"

پھر فرمایا :

"آیئے! تاکہ اپنے بھائی کا جنازہ پڑھیں"[1]

چنانچہ خانقاہ کے تمام افراد وضو کر کے جمع ہو گئے اور حضرت کی امامت میں غائبانہ جنازہ ادا کیا۔

الغرض ہدایت اور ولایت کے آسمان کا یہ نیرِ اعظم جو تقریباً ایک صدی سے ہندوستان کے کفرستان پر ضیاء پاشی کر رہا تھا۔ اپنا نور زمانہ بھر میں پھیلا کر ملتان کے فلک بوس قلعہ میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ لیکن اس کا غروب ہونا سورج کا غروب ہونا نہیں ہے۔ وہ صرف نگاہوں سے اوجھل ہوا ہے۔ مگر اس کے نور سے دلوں کی کائنات اب بھی روشن ہے اور جب تک یہ ناظورۂ عالم آباد ہے۔ درویشی کی دنیا میں چاند تارے بنکر چمکنے والی ہستیاں اس سے برابر اکتسابِ نور کرتی رہیں گی ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اولاد و احفاد

شیخ الاسلامؒ کے دو حرم تھے۔ رشیدہ بانو اور بی بی شہر بانو۔

رشیدہ بانو کے بطنِ عفت سے شیخ صدر الدین عارف، شیخ علاء الدین محمد، شیخ شہاب الدین انوری اور شیخ برہان الدین صاحب تولد ہوئے۔

بی بی شہر بانو سے شیخ قدوۃ الدین محمد، شیخ شمس الدین محمد محبوبِ خدا اور شیخ ضیاء الدین پیدا ہوئے۔

---

[1] امروز برادرم شیخ بہاء الدین بخدا پیوست، ہمیں زماں دیدم کہ ہزار فرشتہ پیش و شیخ شہاب الدین سہروردی در پس شیخ بہاء الدین را درمیان گرفتہ بسوئے آسمان بردند"
(خزینۃ الاصفیاء، جلد اول۔ مطبوعہ نولکشور پریس لاہور، ص ۲۹۹، ۳۰۰ -)

شیخ ضیاء الدین اور شیخ برہان الدین کی اولاد نہیں ہوئی۔ باقی سارے صاحبِ اولاد تھے۔ ان کے علاوہ رشیدہ بانو سے ایک صاحبزادی بھی تولد ہوئی تھی۔ اس معصومہ کا میر حسینیؒ سے نکاح ہوا تھا۔ آپ کے خاندان میں جو شجرہ متوارثاً چلا آتا ہے اس میں حسین کاشفی "دادا دہ بودند" درج ہے۔ مگر حسین کاشفی اور بزرگ تھے۔ کاتب سے سہو ہوا ہے۔

بی بی شہر بانو سے نور بی بی اور سلطان بی بی تولد ہوئیں۔ نور بانو فخرالدین عراقی کے حبالۂ نکاح میں آئی۔ اس سے سید کبیر الدین عراقی تولد ہوئے تھے جنھوں نے حضرتؒ کی آغوشِ شفقت میں ہی پرورش پائی اور آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر بڑے مرتبہ کو پہنچے۔ اس معصومہ کا حضرت کی زندگی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔

دوسری صاحبزادی سلطان بی بی المعروف بی بی فاطمہ تھی۔ اس کی شادی سلطان التارکین حمید الدین حاکمؒ سے ہوئی تھی جس سے خاندانِ جلیلہ کے مورثِ اعلیٰ شیخ نور الدینؒ پیدا ہوئے۔

سیرت کی کتابوں میں حضرت شیخ الاسلامؒ کی اولاد کی تاریخہائے ولادت درج نہیں ہے۔ شجرے جو سجادہ نشین صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں، ان سے صرف ترتیبِ ولادت کا پتہ چلتا ہے، جو حسبِ ذیل ہے۔ اس سے اُن کی عمروں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

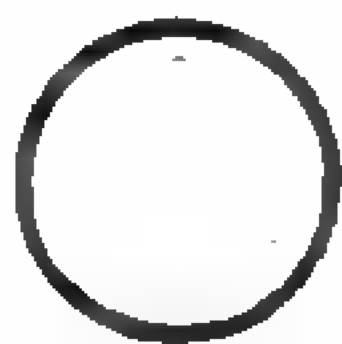
نمبر شمار	نام فرزندانِ ارجمند	نام والدہ ماجدہ
۱	شیخ صدر الدین عارفؒ	بی بی رشیدہ بانوؒ
۲	شیخ علاء الدین محمدؒ	"
۳	شیخ قدوۃ الدین محمد	بی بی شہر بانوؒ
۴	شیخ شمس الدین محمد محبوبِ خداؒ	"
۵	شیخ شہاب الدین محمدؒ	بی بی رشیدہ بانوؒ
۶	شیخ ضیاء الدین محمد	بی بی شہر بانوؒ
۷	شیخ برہان الدین محمد	بی بی رشیدہ بانوؒ

صاحبزادیوں میں عائشہ بی بی بڑی تھیں ۔

مولانا جمالی لکھتے ہیں :

"حضرت شیخ الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے صاحب زادوں کی تعلیم کے لیے بڑے نامور اساتذہ مقرر کر رکھے تھے اور انہیں انعام و اکرام سے نوازا کرتے تھے اور جب حضرت شیخ الاسلام گھر میں ہوتے، تو ان بچوں کو خود بھی تعلیم دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرتؒ کے فرزند اور پوتے علم و فضل میں یدِطولیٰ رکھتے تھے"

حضرت قطب الاقطابؒ کے زمانے میں درس و تدریس کا کام آپ کے پوتوں نے سنبھال رکھا تھا۔ جن میں سے مولانا نورالدینؒ، علاءالدینؒ، مولانا عبدالقادرؒ، مولانا موسیٰ رحمتہ اللہ علیہ، مولانا ادریسؒ، مولانا محمد حسینؒ اور مولانا امام بخش خاص شہرت رکھتے تھے ۔اس درس کی اتنی دھوم تھی کہ مخدوم جہانیاں محض تحصیلِ علم کے لیے اُچ سے ملتان تشریف لائے تھے ۔





طالَ شوقی اِلیٰ منازِلکُم　　اَیُّھَا الغائِبُونَ عن نَظَرِی

روز و شب مونسم خیالِ شماست　　فاسئلُوا عن خیالِکُم خَبَرِی

(جامیؒ)

اکابر خلفا اور وابستگانِ درگاہ

حضرت شیخ الاسلامؒ دُنیا کے بہت بڑے مبلّغ اور غوث الاغواث تھے۔ آپ کی پاکیزہ زندگی کا بیشتر حصّہ سفر میں گزرا تھا اور جنوبی ایشیا کا کوئی حصّہ ایسا نہ رہا تھا، جہاں اُن کے فیض کی مہک نہ پہنچی ہو۔ سفر حضر میں روزانہ ہزاروں آدمی آپ کے دستِ حق پرست پر مسلمان ہوتے اور سینکڑوں خرقہ خلافت حاصل کرتے تھے۔ ان قدسی نفوس نے حضرت کے مبارک مسلک کو دُنیا بھر میں پھیلا دیا اور پھر یہ سلسلہ اولاد در اولاد اور خلفاء بخلفاء جاری رہا۔ یہاں تک کہ مراکش سے جاوا اور سماٹرا تک زمین کا گوشہ گوشہ فیضانِ سرمدی سے سرشار اور نورِ محمدی کی روشنی سے مالا مال ہو گیا۔ حضور کی جاری کردہ نہروں سے فیض اور نور کے بے شمار چشمے آج تک جاری ہیں۔ افسوس اس امر کا ہے کہ لوگوں میں سچی طلب نہ رہی اور پہچاننے والی نگاہیں رخصت ہو چکی ہیں ؎

یوسفے ہمراہ خود دارند واپس مے بُرند
یک زلیخا ہمتے گویا دریں بازار نیست

شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی ایک روایت کے بموجب جسے خلاصۃ العارفین کے مؤلف نے بڑے وثوق سے صفحہ ۷۹ پر درج کیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کو ان کے تمام وابستگان اور متوسلین کی تعداد بتائی گئی تھی جو کروڑوں تک پہنچتی ہے۔ فرماتے ہیں :

"المریدین الذین دخلوا فی سلکی فھم فی ضماتنی وھب اللہ تعالیٰ لھم الی یوم القیمۃ" خدائے تعالےٰ ایشان را در حمایت من و زیر ذیلِ من رسانیدہ تا یوم ینفخ فی الصّور۔ و مراد از مسلک فرمودہ اللہ تعالےٰ ▪ حکم قرآن مجید است اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ جَزَآؤُهُمْ

عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ، رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ - یعنی آنانکہ ایمان آوردہ اند و کردہ اند عملہائے صالح ایشاں بہترین ہمہ آفریدگان اند - پاداش ایشاں را نزد پروردگار ایشاں بوستانہائے اقامت است مے رود زیر آں جوہیائے آب رواں - پائندگان اند - ایشاں درآں بہشت ہا ہمیشہ خوشنود باشند - خدائے تعالیٰ از ایشاں و طاعتہا در پذیرد و خوشنود باشند ایشاں از خدائے تعالیٰ بداں ثواب بے حساب - وآنچہ مذکور شد از جنت و رضوان برائے آنکس است کہ بترسد از عقوبت پروردگارِ خود، بموجبات و مثوبات اشتغال نماید و پیروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و قول مجتہدین، اجماع صحابہ و اہل سنت والجماعت است "۔

(متن خلاصۃ العارفین قلمی بخط مولانا ضیاء الدین ملتانی ،
بتاریخ ۹ ذی الحج ۱۳۰۲ھ)

مختصر یہ کہ جو میرا مُرید خدا و رسول، اجماعِ صحابہ مجتہدین اور ائمہ فقہ کا پورا متبع رہا ہو گا اللہ کریم اپنے فضلِ عمیم سے اُسے یقیناً بخش دیں گے - حضرت کے خلفاء اور مریدوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ آج سے پانچ سو سال بیشتر مولانا جمالیؒ حیطۂ تحریر میں نہیں لا سکتے تھے - چنانچہ فرماتے ہیں :

" اگر اسامی خلفاء و مریدانِ ایشاں کما ینبغی ثبت نمایم، دفترے علیحدہ باید "[1]۔

آج کوئی کس طرح معرضِ تحریر میں لا سکتا ہے - اس لیے اس محترم خانوادہ کے اکابر خلفاء اور ممتاز آستانوں کی مختصر سی فہرست دی جاتی ہے جس سے حضرت شیخ الاسلامؒ کی تبلیغی سرگرمیوں کا کسی حد تک اندازہ ہو سکے گا -

٭

---

[1] سیر العارفین ، قلمی ص ۲۹ ٭

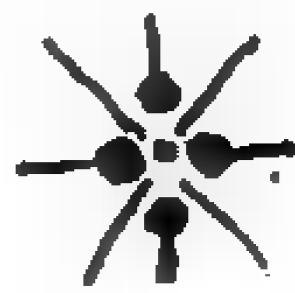
اکابر خُلفاء

حضرتؒ کے فرزندان عالی مقام کے علاوہ مفصلہ ذیل خلفاء قابلِ ذکر ہیں :۔
حضرت مخدوم سید جلال بخاریؒ (سادات بخاری کے مورث اعلیٰ) میر حسینیؒ، مولانا عراقی شیخ کبیر الدین عراقی، لال شہباز قلندر، نواب موسیٰ، حسن افغانؒ، خواجہ کمال الدین مسعود شیروانی، خواجہ فخر الدین گیلانی، شیخ بدر سجستانی، شیخ عبدالستار وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

بارگاہِ غوثیہ سُہروردیہ مُلتان کے سجادہ نشین

نمبر شمار	اسمائے گرامی		مقام مزار
۱	شیخ الاسلام صدر الدین محمد عارف باللہ رحمۃ اللہ علیہ		ملتان
۲	حضرت قطب الاقطاب ابوالفتح رکن الدین ملتانی رحمۃ اللہ علیہ		〃
۳	حضرت شیخ عماد الدین اسمٰعیل شہید	〃	〃
۴	حضرت شیخ صدر الدین محمد حاجی	〃	دہلی
۵	حضرت شیخ رکن الدین اسمٰعیل سمرقندی	〃	سمرقند
۶	حضرت شیخ عماد الدین محمد	〃	ملتان
۷	حضرت شیخ صدر الدین محمد ثانی ثالث	〃	〃
۸	حضرت شیخ محمد یوسف قریشی	〃	دہلی
۹	حضرت شیخ بہاء الدین ثانی	〃	ملتان
۱۰	حضرت شیخ الکبیر المنیر قدس سرہٗ العزیز		〃
۱۱	حضرت شیخ محمد قائم قریشی	〃	〃
۱۲	حضرت شیخ شہر اللہ صاحب قریشی	〃	〃

مقام مزار	اسمائے گرامی	نمبر شمار
ملتان	حضرت شیخ کبیر ثانی قدس سرہٗ العزیز	۱۳
〃	حضرت شیخ بہاء الدین قریشی 〃	۱۴
〃	حضرت شیخ کبیر قریشی 〃	۱۵
〃	حضرت بہاء الدین قریشی 〃	۱۶
〃	حضرت شیخ محمد قائم ثانی قریشی 〃	۱۷
〃	حضرت شیخ وجیہہ الدین قریشی 〃	۱۸
〃	حضرت شیخ محمد زکریا قریشی 〃	۱۹
〃	حضرت شیخ محمد زمان قریشی 〃	۲۰
〃	حضرت شیخ محمد غوث قریشی 〃	۲۱
〃	حضرت شیخ بہاء الدین ثانی الملقب بہ بہاون شاہ رحمۃ اللہ علیہ	۲۲
〃	حضرت شیخ محمد غوث قریشی 〃	۲۳
〃	حضرت مخدوم ولایت شاہ قریشی 〃	۲۴
〃	مخدومہ بی بی راجی رحمۃ اللہ علیہا	۲۵
〃	حضرت مخدوم شاہ محمود رحمۃ اللہ علیہ	۲۶
〃	حضرت مخدوم شیخ بہاول بخش 〃	۲۷
〃	حضرت مخدوم شیخ حسن بخش 〃	۲۸
〃	نواب مخدوم شیخ مرید حسین قریشی 〃	۲۹
〃	مخدوم محمد سجاد حسین صاحب قریشی	۳۰



دیگر افراد خاندانِ غوثیہ

حضرت شیخ الاسلام کی اولاد اس وقت پاک و ہند کے اکثر مقامات میں پھیل چکی ہے۔ لیکن جو بزرگ ملتان میں محوِ خواب ہیں۔ ان میں سے چند خاص طور پر ممتاز ہیں۔ جن کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

شیخ علاؤ الدین محمد، شیخ قدوۃ الدین محمد، شیخ شمس الدین محمد، محبوب خدا، شیخ شہاب الدین محمد، شیخ ضیاء الدین محمد، شیخ برہان الدین محمد، شیخ علاؤ الدین علامہ، مولانا نور الدین، مولانا عبد الغفار، شیخ موسیٰ، شیخ یحییٰ، شیخ برہان الدین اسمٰعیل، مخدوم معین الدین، مخدوم محمد قطب الدین، شیخ محبوب حقانی، شہیدِ قوم میجر عاشق حسین قریشی (وزیر دفاع صوبہ پنجاب) رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

غوث پور قریشی

زبدۃ المشائخ شیخ صدر الدین قریشی، شیخ مراد شاہ قریشی، شیخ محمد حیات قریشی، شیخ غلام رکن الدین رحمہم اللہ علیہم۔

مدینۃ الاولیا اُچ مبارک

حضرت مخدوم سید جلال بخاریؒ، سید احمد کبیرؒ، مخدوم جہانیاںؒ، صدر الدین راجن قتالؒ، سید ناصر الدینؒ، حامد کبیرؒ، سید علاؤ الدینؒ، رکن الدین ابو الفتحؒ، شیخ محمد کیمیا نظرؒ، شیخ زین العابدینؒ، شیخ محمد راجنؒ، شیخ حسنؒ، شیخ راجن کلاں، شیخ محمدؒ، شیخ محمودؒ، سید بہاء الدینؒ، سید کبیر الدین اسمٰعیلؒ، شیخ ابو حنیفہؒ، فقیر جہانگیر سرمستؒ، شیخ جمال خندان روؒ، شیخ رضی الدینؒ، مولانا غوریؒ۔

میانوالی قریشیان :۔ مخدوم غلام شاہ قریشیؒ۔

کوٹ مخدوم :۔ مخدوم صدر الدینؒ، حدامجد قریشی کبیرانی رحمہم اللہ اجمعین

ٹبہ سرواہی :۔ (ریاست بہاولپور) حضرت نواب موسیٰؒ، خلیفہ شیخ الاسلام قدس سرہ۔

گڑھی اختیار خاں :۔ (ریاست بہاولپور) حضرت شیخ عبدالستارؒ، خلیفہ حضرت شیخ الاسلامؒ۔
احمد پور شرقیہ :۔ حضرت پیر بہاءالدین اخر قریشی سہروردی رحمۃ اللہ علیہ۔

مؤ مبارک (ریاست بہاولپور)

سلطان حمیدالدین حاکمؒ، شیخ حامد سرمست، شیخ یوسف گدا، شیخ نورالدین، شیخ رکن الدین، شیخ علی، سید ابوالفتح، شیخ شہاب الدین، شیخ عبدالعزیز، شیخ ابوالفتح، شیخ عمادالدین حماد (غوث زمان) شیخ روح اللہ، شیخ جلال، شیخ کبیرالدین، شیخ ابوحنیفہ، شیخ مغل شیخ واہن (ریاست بہاولپور) شیخ عبداللہ جہانیاں قدس سرہ العزیز۔

تاج البلاد لاہور

شیخ عبدالجلیل قریشی ہاشمی چوہڑ بندگی، قطب العالم (میکلوڈ روڈ) ابوالفتح اول، ابوالفتح ثانی، خواجہ خلیل، شیخ عبدالجلیل ثانی، شیخ ابوالبقا، شیخ فخراللہ، شیخ ابوالحسن ثانی، پیر غلام رکن الدین مراد شاہ، سکندر شاہ امداد، خواجہ حسن گنجد گر المعروف حتو تیلی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ موسیٰ آہنگر، شیخ مولا بخاری۔ شیخ محمد اسماعیل المشہور میاں وڈہ رحمۃ اللہ علیہ، مولوی محمد تیمور، شیخ حامد، شیخ جان محمد ثانی، مولانا کمال الدین، شیخ عنایت اللہ، مفتی عبدالسلام، مفتی محمد محمود، مولانا برہان الدین، مولانا عتیق اللہ، مفتی عبدالسمیع، مولانا کمال الدین، حافظ محمد تقی، حافظ رحمت اللہ، مفتی رحیم اللہ، مفتی غلام محمد، مفتی غلام سرور۔

شاہ جمال رحمۃ اللہ علیہ (نزد اچھرہ) سید عثمان بخاری (قلعہ لاہور) سید شاہ محمد بخاری، سید عماد الملک بخاری، شاہ عالم، شاہ بہاءالدین، سید بھولن شاہ، سید بھاون شاہ، شاہ نورنگ، میراں محمد شاہ المشہور بموج دریا بخاری، سید صفی الدین، سید بہاءالدین، سید شہاب الدین، سید عبدالرحیم، زندہ علی المعروف زندہ امام (نزد پرانی انارکلی) سید عبدالرزاق المشہور سید مکی، نیلا گنبد، سلطان جلال الدین، شیخ شمس الدین قریشی رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔

رتہ پیراں :۔ (ضلع شیخوپورہ) پیر قلندر شاہؒ، پیر فرح بخش قریشی سہروردیؒ۔
کوٹلہ باقر شاہ :۔ 〃 شیخ ابوبکر قریشی سہروردیؒ۔
پہاڑکھوکھر :۔ 〃 شیخ محمد کاظم قریشی سہروردیؒ۔
گھلن :۔ (لاہور) شیخ محمد بولاقی، شیخ محمد باقرؒ۔
کوٹلی پیراں :۔ شیخوپور شیخ غلام علی قریشی ہاشمیؒ۔
گڑھی :۔ یوپی شیخ محمد ابوبکر قریشی سہروردیؒ۔
چونیاں :۔ لاہور شیخ فریدالدین قریشی، شیخ فیض اللہ، شیخ میراںؒ۔
منڈیاں والہ :۔ شیخوپورہ پیر اعتبار شاہ قریشیؒ
شرق پور :۔ 〃 پیر محبوب شاہؒ (موضع قریشیانوالہ)
پنڈی شہداد :۔ لاہور حضرت شیخ خیرالدینؒ۔
مردانہ :۔ شیخوپورہ حضرت غلام رکن الدینؒ مراد شاہ سہروردی۔
شاہ کوٹ :۔ 〃 حضرت شاہ ابوالخیر سہروردیؒ
ننکانہ :۔ 〃 شیخ بہاءالدین بن عبدالجلیلؒ، شیخ محمد، شیخ محمود، پیر عبدالسلام، پیر فتح اللہ۔
شیخ سید علی، شیخ سیف اللہ، شیخ صدرالدین۔ شیخ بہاء الدین ثانیؒ۔

قصور :۔ (موضع شیخ حماد) شیخ حماد قریشی سہروردی۔
سیالکوٹ :۔ شاہ بہلولؒ، سید سرمست سیالکوٹیؒ۔
گجرات :۔ حضرت شاہ دولہ قدس سرہ العزیز۔
دیپالپور :۔ حضرت مولانا رکن الدین سہروردیؒ۔
پنڈی موسیٰ :۔ (ضلع فیصل آباد) حضرت شیخ موسیٰؒ، شیخ بدرالدین، شیخ مونگر، شیخ نظام الدین، شیخ حمادالدین۔
کاہنوواں :۔ (ضلع گورداسپور) شیخ برہان شاہ سہروردیؒ۔
موضع تلواڑہ :۔ (ضلع جھنگ) حضرت شاہ جمال سہروردیؒ شیخ حبیب اللہؒ، شیخ بہلول قریشیؒ۔
کوٹ سدہانہ :۔ 〃 شیخ آدمؒ۔

بوہڑی غلام جہانیاں :۔ (ضلع جھنگ) شیخ طلحہ ، شیخ حبیب اللہ ، شیخ ابوالحسن ، شیخ قطب الدین ۔

حویلی شیخ راجو :۔ " شیخ راجو ۔

جھنگ شہر :۔ شیخ گل محمد صاحب قریشی ۔

کروڑ لعل عیسن (ضلع مظفرگڑھ)

شیخ محمد یوسف المعروف لعل عیسن ، شیخ محمود شاہ قریشی ، شیخ علی اکبر قریشی ، شاہ عبداللہ قریشی ، شیخ یوسف قریشی ۔

نواب غازی خان اوّل (بانی ڈیرہ غازی خان) نواب اسمٰعیل خان (بانی ڈیرہ اسمٰعیل خان) نواب فتح خان (بانی کوٹ فتح خان) ۔

چنیوٹ :۔ (ضلع جھنگ) شیخ برہان الدین قریشی ، شیخ جمال قریشی ۔

پیل پیراں :۔ (ضلع سرگودھا) حضرت مخدوم الملک پیر علی قتال قریشی ۔ مخدوم الملک پیر خواجہ نوری شاہ ۔

پنڈدادنخان :۔ " حضرت پیر مصطفےٰ شاہ قریشی ، شیخ طیّب قریشی ۔

وٹلی پیراں :۔ " پیر شاہ جمال ۔

کھارو پیراں :۔ " پیر کرم شاہ قریشی ۔

بھیرہ :۔ " پیر اعظم شاہ ، پیر امیر شاہ ، پیر فتح شاہ ، پیر عیسن شاہ ۔

کرولی :۔ " پیر محمد حسین شاہ قریشی ، شاہ کرم اللہ صاحب قریشی ۔

کھیوہ مٹھی :۔ " حضرت پیر محمد شریف صاحب قریشی ۔

سرودیہ :۔ " حضرت پیر نور شاہ صاحب قریشی ، پیر حسین شاہ صاحب قریشی ۔

شمس آباد :۔ پیر شیخ طیب صاحب قریشی ۔

دھنگوال :۔ پیر فتح شاہ صاحب قریشی ۔

دھروگی :۔ پیر شریف شاہ صاحب قریشی ۔

دعولہ (کاہو کارت) حضرت پیر رنگا شاہ صاحب قریشی سہروردیؒ۔

سندھ

سہوان :۔ حضرت مخدوم سید عثمان المرندی المعروف بہ لال شہباز قلندرؒ۔

شکارپور :۔ حضرت شاہ محمود سہروردیؒ۔

بکھر :۔ مولانا تاج الدین بکھریؒ۔ مولانا حسام الدین بکھریؒ۔

بدین :۔ حضرت شیخ اسمٰعیل قریشی بن شہر اللہ بن شیخ یوسف بن عماد الدین کہی مپھوڑ اولاد حضرت شیخ الاسلامؒ۔

ماتھیلو :۔ شیخ پیر محمد صاحب قریشی سہروردیؒ۔

کوٹ گوہر :۔ شاہ عبدالرحمانؒ، سلیمان شاہؒ، شاہ جلالؒ۔

کوٹ بگیرا شریف :۔ حضرت پیر فاضل قریشیؒ، حضرت قائم دین قلندرؒ۔

ٹنڈوالہ یار :۔ شاہ اللہ یار (شیخ اجاریؒ) شیخ موسوؒ، شیخ داملوؒ۔

ہنگورجہ :۔ (ریاست خیرپور) مزار نوربار سخی پیر سید ناصر علی شاہؒ لکیاری کاظمیؒ۔

نگرٹھٹھہ :۔ شیخ جیو مکی جوڑیوؒ۔

اگھاماٹی :۔ حضرت محمد شریف عرف شاہ غازیؒ، شاہ یوسفؒ، شاہ ابراہیمؒ۔

پیرپٹھو :۔ حضرت پیر پٹھو شہید خلیفہ شیخ الاسلامؒ۔

ٹنڈو باغو :۔ حضرت خان شاہؒ، نہال شاہؒ۔

ٹنڈو غلام علی :۔ حضرت شفیع عثمانؒ۔

ونجری :۔ حضرت عبدالغنی نوحؒ، حضرت بلادی بادشاہؒ۔

پٹھورو :۔ شیخ پٹھوروؒ۔

ضلع میرپور :۔ حضرت جرکس ڈنڈانیؒ، حضرت ابراہیم نانگورانیؒ، حضرت گاٹھو صدر خلفاء حضرت شیخ الاسلامؒ۔

ماتلی :۔ شیخ بھرکیوؒ۔

مشائخ کشمیر

شیخ حمزہ کشمیری، بابا داؤد خاکی، شیخ نوروز، علامہ فیروز الدین مفتی کشمیر، بابا روبی ریشی، بابا نصیب الدین کشمیری، ملا عبدالوہاب، خواجہ مسعود پان پتی (پان پور) شیخ عبدالرحیم، شیخ یعقوب کشمیری (اسلام آباد) شیخ بہرام کشمیری، مولانا حیدر کاشمیری، شیخ حسن لالو، حضرت بابا جاجہ، حضرت شاہ محمد قادری سہروردی، بابا عبداللہ سہروردی، بابا محمد مہدی، بابا عثمان، میر محمد علی، شیخ محمد ہاشم، مولانا عنایت اللہ کشمیری، میر ابوالفتح قادری سہروردی، میر شرف دین کشمیری، خواجہ حبیب اللہ، شیخ اسماعیل کشمیری، شیخ عبداللطیف قادری سہروردیؒ۔

مشائخ ہند

(فخر البلاد دہلی)

شیخ صلاح الدین درویش، شیخ محمد یوسف قریشی، شیخ عبداللہ قریشی، شیخ نصر اللہ، شیخ رکن الدین، شیخ محمود شاہ، شیخ احمد شاہ، شیخ بہاء الدین، سید عبدالوہاب بخاری، سید جمال الدین بخاری، شیخ زین العابدین ادھن، حضرت سماء الدین، مولانا جمالی، شیخ عثمان سیاح، شیخ رحمت اللہ (کوٹلہ پٹھان دہلی)۔

سلطان پور لودیاں :۔ حضرت شیخ ابوبکر قریشی سہروردیؒ۔

حصار :۔ شیخ عبدالرحیم قریشی سہروردیؒ۔

مالیر کوٹلہ :۔ شیخ صدر الدین سہروردیؒ۔

قنوج :۔ سید جلال سہروردیؒ۔

ظفر آباد :۔ حاجی چراغ ہندیؒ۔

شاہجہانپور :۔ شیخ کرم شاہ قریشیؒ۔

پٹنہ :۔ شاہ ارزانی شہیدؒ۔

کندوال :۔ حضرت خواجہ بہاء الدین قریشیؒ۔

آگرہ :- شیخ بہاء الدین قریشی دانشمند مفتی آگرہ، اولاد حضرت شیخ الاسلامؒ، شیخ جنید قریشیؒ، شیخ ابوبکر قریشیؒ (محلہ جوگی پورہ)

مانک پور :- مولانا تاج الدین مانک پوریؒ، مولانا علاءُ الدینؒ۔

مھون :- مولانا مسعود مھونیؒ، مولانا محمد مھونیؒ۔

الہ آباد :- شیخ اسماعیل صاحب قریشی سہروردیؒ۔

کٹرہ :- حضرت علی بن احمد غوریؒ، مصنف کنزالعباد، شرح کتاب اوراد، خواجہ کرک سہروردی۔

بدایوں :- حضرت شیخ حسام الدین سہروردیؒ۔

بھڑائچ :- حضرت سید میر ماہؒ، سید تاج ماہ سہروردیؒ۔

مندور :- حضرت شیخ عبداللہ بیابانی سہروردیؒ۔

چتور گڑھ :- حضرت شیخ یوسف بن عماد الدین اسماعیلؒ۔

احمد آباد :- (گجرات) مخدوم سید برہان الدین قطب العالمؒ۔ مخدوم سید شاہ عالمؒ، قاضی محمود۔

گجراتی :- قاضی نجم الدین گجراتیؒ۔

جُوتا گڑھ :- شیخ عبداللطیف سہروردیؒ۔

ایرج :- شیخ یوسف بدھؒ۔

جون پور :- حضرت سید علم الدین ترمذیؒ۔

لکھنؤ :- شیخ قوام الدین سہروردیؒ، شیخ مینا لکھنویؒ، شیخ قطب الدین سہروردیؒ، شیخ سعد الدینؒ۔

ٹونکرا شریف :- (ریاست کشن گڑھ) مخدوم غلام بہاء الدین قریشیؒ۔

سارنگ پور :- شیخ سارنگؒ۔

سلہٹ :- (گنج شہیداں) شاہ جلال مجردؒ، خلیفہ سید احمد کبیر سہروردیؒ مع سات سَو سہروردی مجاہدین (SOLDIER SAINTS) کے محوِ خواب ہیں۔

لراج گڈھ :- اخی مخدوم جمشید رضی قدس سرہٗ۔

کالپی :- مولانا حافظ سراج الدینؒ، امام مخدوم جہانیاںؒ۔

اشاریہ

(الف) اعلام

(ب) کتابیات

(ج) اماکن

اعلام

کتابیات

اماکن

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

تذکرہ

حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ

○

از

نور احمد خان فریدی

علماء اکیڈمی شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف پنجاب بادشاہی مسجد
لاہور